JOIN FOR MORE!!!

اردو (لازمی)

برائے جماعت گیارھویں

اعداد و ترتیب:

حافظ محمد حارث باسم

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
00	انتساب	02
01	کثیر الانتخابی سوالات	03
02	اشعار کی تشریحات	23
03	اقتباس کی تشریحات	86
04	بند کی تشریحات	121
05	نظموں کے مرکزی خیال	151
06	اسباق کے خلاصے	155
07	سوالات و جوابات	164
08	گرامر کی اصطلاحات	180
09	محاورات	188
10	اصناف سخن	190
11	نثر نگاروں کی نثر نگاری پر تبصرے	195
12	شعراء کی شاعری پر تبصرے	220
13	شخصیات اور ان کے القابات و خطابات	246
14	مراجع و مصادر	247

اعداد و ترتیب: **حافظ محمد حارث باسم** (haisbasim@gmail.com)

انتساب

عزیزم والدین محترمین کے نام

جنھوں نے ہر اس پل جب میں لڑکھڑایا، مجھے سہارا دیا

اور جن کے حسن تربیت اور کمال نظر نے مجھے کسی قابل کیا

JOIN FOR MORE!!!

...**اور**...

انتہائی محترم وموقر

جملہ اساتذہ کرام کے نام

جن کی بے پناہ شفقت، بے بہا محنت اور جا بجا حوصلہ افزائی ہی

نے مجھ ایسے نالائق طفل مکتب کو کسی قابل بنایا

محمد حارث باسم

کثیر الانتخابی سوالات

حصہ نثر

رسم ورواج کی پابندی کے نقصانات

1. سبق "رسم ورواج کی پابندی کے نقصانات" ان کی تحریر ہے:

☆ڈپٹی نذیر احمد ☆محمد حسین آزاد ☆ **سر سید احمد خان**

2. شامل نصاب مضمون "رسم ورواج کی پابندی کے نقصانات" کہاں سے ماخوذ ہے؟

☆ **مقالات سرسید** ☆قصص الہند ☆مقدمہ شعر و شاعری

3. سرسید نے یہ رسالہ جاری کیا:

☆تہذیب الجہاد ☆ **تہذیب الاخلاق** ☆ تعلیم و تربیت

4. مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کی غلط فہمی دور کرنے کیلئے سرسید نے یہ کتاب تحریر کی:

☆تہذیب الاخلاق ☆ **اسباب بغاوت ہند** ☆آثار الصنادید

5. انھیں "اردو کا ایڈیسن" کہا جاتا ہے:

☆ڈپٹی نذیر احمد ☆محمد حسین آزاد ☆ **سر سید احمد خان**

6. آثار الصنادید کے مصنف کا نام ہے:

☆ڈپٹی نذیر احمد ☆ **سر سید احمد خان** ☆علامہ شبلی نعمانی

7. انھیں جدید اردو ادب کا بانی کہا جاتا ہے:

☆ڈپٹی نذیر احمد ☆محمد حسین آزاد ☆ **سر سید احمد خان**

8. دہلی کی عمارات اور علماء و شعراء کے بارے میں سرسید نے یہ کتاب تحریر کی:

☆اسباب بغاوت ہند ☆ **آثار الصنادید** ☆تاریخ بجنور

9. ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد ﷺ" کے جواب میں سرسید نے یہ کتاب لکھی:

☆اسباب بغاوت ہند ☆ **خطبات احمدیہ** ☆آثار الصنادید

10. ایم،اے،او کالج کی بنیاد انھوں نے رکھی:

☆ڈپٹی نذیر احمد ☆محمد حسین آزاد ☆ **سر سید احمد خان**

11. اردو کے اس ادیب کو مصلح قوم کہا جاتا ہے:

☆ **سر سید احمد خان** ☆محمد حسین آزاد ☆خواجہ میر درد

12. سرسید احمد خان کا سن پیدائش ہے:

☆ **1817** ☆ 1818 ☆ 1898

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS
www.histudy.xyz

13. سر سید احمد خان کہاں پیدا ہوئے؟

☆ لکھنؤ ☆ آگرہ ☆ **دہلی**

14. سر سید احمد کی وفات ہوئی:

☆ **1898** ☆ 1888 ☆ 1900

15. اردو کا مورث اعلیٰ انھیں کہا جاتا ہے:

☆ ڈپٹی نذیر احمد ☆ محمد حسین آزاد ☆ **سر سید احمد خان**

16. تہذیب الاخلاق کیا ہے؟

☆ **رسالہ** ☆ ناول ☆ سفر نامہ

17. علیگڑھ اسکول کو کالج کا درجہ اس سن عیسوی میں دیا گیا:

☆ 1857 ☆ 1875 ☆ **1878**

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS BASIM

مسلمانوں کا قدیم طرز تعلیم

1. سبق "مسلمانوں کا قدیم طرز تعلیم" ان کی تحریر ہے:

☆ ڈپٹی نذیر احمد ☆ محمد حسین آزاد ☆ **علامہ شبلی نعمانی**

2. سبق "مسلمانوں کا قدیم طرز تعلیم" کہاں سے ماخوذ ہے؟

☆ مقالات سر سید ☆ **مقالات شبلی** ☆ بیگمات کے آنسو

3. یہ اردو کے پہلے فلسفی مؤرخ ہیں:

☆ **علامہ شبلی نعمانی** ☆ محمد حسین آزاد ☆ سر سید احمد خان

4. علامہ شبلی کی سب سے مشہور کتاب کا نام ہے:

☆ آنگن ☆ مرأۃ العروس ☆ **سیرت النبی ﷺ**

5. علامہ شبلی نعمانی نے یہ ادارہ قائم کیا:

☆ علی گڑھ ☆ **ندوۃ العلماء** ☆ دار العلوم دیوبند

6. المامون، الفاروق اور سیرۃ النعمان اس عظیم مؤرخ کی کتابیں ہیں:

☆ ڈپٹی نذیر احمد ☆ محمد حسین آزاد ☆ **علامہ شبلی نعمانی**

7. انھیں تاریخ کا معلم اول کہا جاتا ہے:

☆ ڈپٹی نذیر احمد ☆ **علامہ شبلی نعمانی** ☆ سر سید احمد خان

8. انھوں نے تاریخ کو فلسفہ سے روشناس کرایا:

☆ **علامہ شبلی نعمانی** ☆ محمد حسین آزاد ☆ سر سید احمد خان

9. برطانوی حکومت نے شبلی نعمانی کو اس خطاب سے نوازا:

☆ دبیر الملک ☆ **شمس العلماء** ☆ سر

10. ڈاکٹر اسپرنگر کے مطابق مسلمانوں کے اسماء الرجال میں کتنے عالموں کا حال ملتا ہے؟

☆ **5 لاکھ** ☆ 10 لاکھ ☆ 15 لاکھ

اعداد و ترتیب: **حافظ محمد حارث باسم** (haisbasim@gmail.com)

11. شبلی نعمانی کے انتقال کے بعد سیرۃ النبی ﷺ کی بقیہ جلدیں انھوں نے مکمل کی:

☆ الطاف حسین حالی ☆ **علامہ سید سلیمان ندوی** ☆ علامہ ذہبی

12. سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبی ﷺ کی کتنی جلدیں لکھیں؟

☆ دو ☆ تین ☆ **چار**

13. شبلی نعمانی نے سیرۃ النبی ﷺ کی کتنی جلدیں لکھیں؟

☆ **دو** ☆ تین ☆ چار

14. علامہ شبلی نعمانی اس سن عیسوی میں پیدا ہوئے:

☆ **1857** ☆ 1875 ☆ 1898

15. شبلی کے مشہور شاگرد کا نام ہے:

☆ حالی ☆ پطرس ☆ **سلیمان ندوی**

16. قدیم دور میں تعلیم کا مستند طریقہ تھا:

☆ یاد کرنا ☆ حفظ کرنا ☆ **املاء**

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS BASIM
www.studypak.xyz

روزمرہ اور محاورہ

1. سبق "روزمرہ اور محاورہ" ان کی تحریر ہے:

☆ ڈپٹی نذیر احمد ☆ **الطاف حسین حالی** ☆ سر سید احمد خان

2. مضمون "روزمرہ اور محاورہ" اس کتاب سے ماخوذ ہے:

☆ مقالات سر سید ☆ مقالات شبلی ☆ **مقدمہ شعروشاعری**

3. اردو میں قومی شاعری کی ابتداء انھوں نے کی:

☆ **الطاف حسین حالی** ☆ علامہ اقبال ☆ نظیر اکبر آبادی

4. یادگار غالب، حیات سعدی اور حیات جاوید ان کی تصانیف ہیں:

☆ غالب ☆ اقبال ☆ **حالی**

5. انھیں اردو کا پہلا سوانح نگار کہا جاتا ہے:

☆ حسین آزاد ☆ شبلی نعمانی ☆ **حالی**

6. "ہند کا سعدی" کس سوانح نگار کو کہا جاتا ہے؟

☆ **حالی** ☆ نذیر احمد ☆ شبلی

7. انھیں اردو کا پہلا تنقید نگار (نقاد) کہا جاتا ہے:

☆ حسین آزاد ☆ مولوی عبد الحق ☆ **حالی**

8. اردو کی پہلی سوانح عمری ہے:

☆ یادگار غالب ☆ **حیات سعدی** ☆ حیات جاوید

9. مقدمہ شعروشاعری ان کی تصنیف ہے:

☆ مولوی عبد الحق ☆ ڈپٹی نذیر احمد ☆ **الطاف حسین حالی**

10. "یادگارِغالب" کیا ہے؟

☆افسانہ ☆ **سوانح** ☆ڈرامہ

11. تنقید کے موضوع پر اردو کی پہلی کتاب ہے:

☆یادگارغالب ☆حیات جاوید ☆ **مقدمہ شعروشاعری**

سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ

1. سبق "سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ" ان کی تحریر ہے:

☆ڈپٹی نذیر احمد ☆ **محمد حسین آزاد** ☆سرسید احمد خان

2. سبق "سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ" ماخوذ ہے:

☆آب حیات ☆قصص الہند ☆ **نیرنگ خیال**

3. انھیں "آقائے اردو" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے:

☆ **محمد حسین آزاد** ☆مولوی عبد الحق ☆سرسید احمد خان

4. انھیں اردو کا بے مثال تمثیل نگار کہا جاتا ہے:

☆ڈپٹی نذیر احمد ☆ **محمد حسین آزاد** ☆سرسید احمد خان

5. نیرنگِ خیال کس طرز کی تصنیف ہے؟

☆تنقید نگاری ☆افسانہ نگاری ☆ **تمثیل نگاری**

6. ملکہ صداقت زمانی کس کی بیٹی تھی؟

☆ **سلطان آسمانی** ☆بی بی حوا ☆کلثوم زمانی بیگم

7. دروغ دیوزاد کے باپ کا نام تھا:

☆سفلہ نابکار ☆ **حمق تیرہ دماغ** ☆سلطان آسمانی

8. انھیں آذرِ سخن بھی کہا جاتا ہے:

☆ڈپٹی نذیر احمد ☆ **محمد حسین آزاد** ☆سرسید احمد خان

9. وہ کون سے انشاء پرداز ہیں جن کی نثر میں نظم کی چاشنی پائی جاتی ہے؟

☆ڈپٹی نذیر احمد ☆ **محمد حسین آزاد** ☆سرسید احمد خان

10. محمد حسین آزاد ان کے شاگرد تھے:

☆سودا ☆ **ذوق** ☆سرسید احمد خان

11. محمد حسین آزاد اس سن عیسوی میں پیدا ہوئے:

☆1800 ☆1820 ☆**1830**

12. محمد حسین آزاد کا انتقال اس سال ہوا:

☆**1910** ☆1905 ☆1900

13. دل میں سلطان آسمانی سے سخت عداوت رکھتا تھا:

☆بادشاہ ☆وزیر ☆ **دروغ دیوزاد**

14. بہروپ بدلنے میں طاق تھا:

☆ **درو غ دیوزاد** ☆ ملکہ صداقت ☆ وزیر

15. ہوا وہوس اس کے یار وفادار تھے:

☆ سلطان آسمانی ☆ **درو غ دیوزاد** ☆ ملکہ صداقت

تشکیلِ پاکستان

1. سبق "تشکیل پاکستان" ان کی تحریر ہے:

☆ **میاں بشیر احمد** ☆ محمد حسین آزاد ☆ حسن نظامی

2. انجمن اردو پنجاب کی بنیاد انھوں نے رکھی:

☆ ابن انشاء ☆ محمد حسین آزاد ☆ **میاں بشیر احمد**

3. میاں بشیر احمد اس تعلیمی ادارے میں تاریخ اسلام کے استاد رہے:

☆ پنجاب یونیورسٹی ☆ **اسلامیہ کالج لاہور** ☆ اورینٹل کالج لاہور

4. طلسم زندگی، مسلمانوں کا ماضی حال اور مستقبل، اور کارنامہ اسلام ان کی تصانیف ہیں:

☆ **میاں بشیر احمد** ☆ محمد حسین آزاد ☆ حسن نظامی

5. برصغیر کے مسلمانوں کو ہندو بنانے کیلئے اس مہم کا آغاز ہوا:

☆ مہا سبھا ☆ سول نافرمانی ☆ **شدھی**

6. میاں بشیر احمد اس سن عیسوی میں پیدا ہوئے:

☆ 1890 ☆ **1893** ☆ 1900

7. میاں بشیر کے والد تھے:

☆ ڈاکٹر ☆ وکیل ☆ **جسٹس**

8. میاں بشیر احمد نے تاریخ میں ڈگری یہاں سے حاصل کی:

☆ پنجاب یونیورسٹی ☆ **آکسفورڈ یونیورسٹی** ☆ کراچی یونیورسٹی

9. میاں بشیر احمد کا انتقال اس سال ہوا:

☆ **1971** ☆ 1965 ☆ 1960

جدید سائنس اور عصری تقاضے

1. سبق "جدید سائنس اور عصری تقاضے" ان کی تحریر ہے:

☆ ڈپٹی نذیر احمد ☆ محمد حسین آزاد ☆ **حفیظ الرحمن**

2. مسلمانوں نے کتنے سال تک سائنس کی خدمت کی؟

☆ چار ☆ **چھ** ☆ دس

3. یورپ نے سائنس کا ترکہ کس سے حاصل کیا؟

☆ **مسلمان** ☆ ہندو ☆ یہودی

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS
www.studyrank.xyz

4. واسکوڈی گاما کا تعلق اس ملک سے تھا:

☆چین ☆نیپال ☆ **پرتگال**

5. ڈاکٹر حفیظ الرحمن اس تعلیمی ادارے سے وابستہ رہے:

☆پنجاب یونیورسٹی ☆ **اردو یونیورسٹی کراچی** ☆اسلامیہ کالج

6. ڈاکٹر حفیظ الرحمن نے اہلِ یونان کے اس استاد کا ذکر کیا ہے:

☆سقراط ☆افلاطون ☆ **ارسطو**

7. سائنس اور قرآن کی زبردست مطابقت دیکھ کر مسلمان ہونے والے سائنس دان کا نام ہے:

☆ **ڈاکٹر مورس بوکائے** ☆ ڈاکٹر لوئس بیچلر ☆ ڈاکٹر جین بوسلر

8. سائنس دان مورس بوکائے کا تعلق یہاں سے تھا:

☆ امریکا ☆ **فرانس** ☆ اٹلی

ماما عظمت

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS BASIM
www.studyaly.xyz

1. سبق "ماما عظمت" ان کی تحریر ہے:

☆ **ڈپٹی نذیر احمد** ☆محمد حسین آزاد ☆سر سید احمد خان

2. سبق "ماما عظمت" ماخوذ ہے:

☆نیرنگ خیال ☆آنگن ☆ **مراۃ العروس**

3. انھیں اردو کا پہلا ناول نگار کہا جاتا ہے:

☆میاں بشیر احمد ☆ **ڈپٹی نذیر احمد** ☆حسن نظامی

4. اردو کا پہلا ناول ہے:

☆ **مراۃ العروس** ☆آنگن ☆توبۃ النصوح

5. مولوی صاحب کی بہو کا نام تھا:

☆ **اصغری** ☆اکبری ☆صغریٰ

6. اصغری اور اکبری کا آپس میں رشتہ تھا:

☆ساس، بہو ☆ماں، بیٹی ☆ **بہن**

7. اصغری کے سسر کا نام تھا:

☆محمد کامل ☆ **محمد فاضل** ☆ محمد عاقل

8. کامل، اصغری کا تھا:

☆ **شوہر** ☆بھائی ☆ بیٹا

9. ناول "ابن الوقت" ان کا شاہکار ہے:

☆میاں بشیر احمد ☆ **ڈپٹی نذیر احمد** ☆حسن نظامی

10. ماما عظمت اس گھر میں کتنے سالوں سے ملازمہ تھی؟

☆ **۲۵سال** ☆ ۲۰سال ☆ ۱۰سال

11. ناول مراۃ العروس کتابی شکل میں پہلی دفعہ شائع ہوا:

☆ 1860 ☆ 1898 ☆ **1869**

نوجوان سپہ سالار کا عزم و حوصلہ

1. سبق "نوجوان سپہ سالار کا عزم و حوصلہ" ان کی تحریر ہے:

☆ڈپٹی نذیر احمد ☆محمد حسین آزاد ☆ **مولانا عبدالحلیم شرر**

2. سبق "نوجوان سپہ سالار کا عزم و حوصلہ" ماخوذ ہے:

☆مرآۃ العروس ☆ **منصور موہنا** ☆آنگن

3. اسلامی تاریخی ناول نگاری کی ابتداء انھوں نے کی:

☆ **عبدالحلیم شرر** ☆محمد حسین آزاد ☆حسن نظامی

4. "محشر، پردۂ عصمت اور مہذب" نامی رسالے انھوں نے جاری کیے:

☆میاں بشیر احمد ☆ **عبدالحلیم شرر** ☆حسن نظامی

5. منصور کس کی فوج کا کمانڈر تھا:

☆ **محمود غزنوی** ☆نورالدین زنگی ☆سلطان التمش

6. اجمیر کے راجہ کی بیٹی کا نام تھا:

☆لیلیٰ ☆عذرا ☆ **موہنا**

7. یحییٰ، منصور کا تھا:

☆ **راہبر** ☆دوست ☆دشمن

8. شرر کے ناولوں کی تعداد ہے:

☆بیس ☆ **چالیس** ☆پچاس

9. "فردوس بریں، زوال بغداد اور فتح اندلس" ان کی تصانیف ہیں:

☆ **عبدالحلیم شرر** ☆محمد حسین آزاد ☆حسن نظامی

آزادی کی راہ میں

1. سبق "آزادی کی راہ میں" ان کی تحریر ہے:

☆ڈپٹی نذیر احمد ☆عبدالحلیم شرر ☆ **خدیجہ مستور**

2. سبق "آزادی کی راہ میں" ماخوذ ہے:

☆ **آنگن** ☆ابن الوقت ☆تہذیب نسواں

3. ناول "آنگن" ان کی تحریر ہے:

☆ **خدیجہ مستور** ☆محمد حسین آزاد ☆حسن نظامی

4. عالیہ کا کردار نصاب میں شامل اس سبق میں موجود ہے:

☆ماما عظمت ☆بردبار اور دانشمند ☆ **آزادی کی راہ میں**

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS BASIM www.studypak.xyz

5. "کھیل، بوچھاڑ، چند روز" ان کے افسانوی مجموعے ہیں:

☆میاں بشیر احمد ☆ **خدیجہ مستور** ☆حسن نظامی

6. ناول آنگن کو اس ادبی ایوارڈ سے نوازا گیا:

☆لینن ☆ **آدم جی** ☆رائٹر

7. عالیہ کے چچا کا تعلق اس جماعت سے تھا:

☆مسلم لیگ ☆کمیونسٹ ☆ **کانگریس**

8. عالیہ کی جذباتی وابستگی کس کے ساتھ ہے؟

☆ماموں ☆ **ابا** ☆بڑے چچا

9. عالیہ کس کی دعوت کا اہتمام کر رہی تھی؟

☆بڑے چچا ☆اسکول کی نگراں ☆ **انگریز افسر**

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS BASIM
www.studyrank.xyz

بائیسکل کی تعلیم

1. سبق "بائیسکل کی تعلیم" ان کی تحریر ہے:

☆ **شوکت تھانوی** ☆محمد حسین آزاد ☆سرسید احمد خان

2. شوکت تھانوی کا اصل نام تھا:

☆شوکت محمد ☆محمد شوکت ☆ **محمد عمر**

3. سبق "بائیسکل کی تعلیم" ماخوذ ہے:

☆ **بحرِ تبسم** ☆ مضامین شوکت ☆ جنم کہانیاں

میبل اور میں

1. سبق "میبل اور میں" ان کی تحریر ہے:

☆ڈپٹی نذیر احمد ☆محمد حسین آزاد ☆ **پطرس بخاری**

2. سبق "میبل اور میں" ماخوذ ہے:

☆ **مضامین پطرس** ☆مقالات شبلی ☆طنز و ظرافت

3. پطرس بخاری اور میبل اس یونیورسٹی میں پڑھتے تھے:

☆آکسفورڈ ☆ **کیمبرج** ☆ہارورڈ

4. اقوام متحدہ میں ملک کی نمائندگی کرنے والے ادیب ہیں:

☆ **پطرس بخاری** ☆محمد حسین آزاد ☆سرسید احمد خان

5. پطرس بخاری کا اصل نام ہے:

☆محمد علی ☆ **احمد شاہ** ☆عمر فاروق

6. پطرس بخاری نے اس ادارے سے تعلیم حاصل کی:

☆ **گورنمنٹ کالج لاہور** ☆اسلامیہ کالج ☆اورینٹل کالج

7. میبل اور پطرس بخاری اس مضمون کے طالب علم تھے:

☆اردو ادب ☆ **انگریزی ادب** ☆فلسفہ

8. پطرس بخاری کا پول کھلنے سے پہلے وہ اس بیماری کا شکار ہوئے:

☆ **انفلوئنزا** ☆ملیریا ☆تپ دق

9. "لاہور کا جغرافیہ، میں ایک میاں ہوں، مرید پور کا پیر" ان کے مضامین ہیں:

☆شوکت تھانوی ☆محمد حسین آزاد ☆ **پطرس بخاری**

10. پطرس بخاری کو اردو کے علاوہ اس زبان میں بھی عبور حاصل تھا:

☆ **انگریزی** ☆عربی ☆فارسی

بردبار اور دانشمند

1. سبق "بردبار اور دانشمند" ان کی تحریر ہے:

☆ڈپٹی نذیر احمد ☆ **شفیق الرحمن** ☆سر سید احمد خان

2. شفیق الرحمن کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے:

☆ **کرنیں** ☆چاندنی ☆آنگن

3. سبق "بردبار اور دانشمند" میں اس پرندہ کا ذکر ہے:

☆ **الّو** ☆مور ☆کبوتر

4. الّو کو کس چیز کی نشانی سمجھا جاتا ہے؟

☆خوشی ☆برکت ☆ **نحوست**

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS BASIM
www.studypak.xyz

ایک شام ماضی کی محرابوں میں

1. سبق "ایک شام ماضی کی محرابوں میں" ان کی تحریر ہے:

☆ **ابن انشاء** ☆محمد حسین آزاد ☆سر سید احمد خان

2. سبق "ایک شام ماضی کی محرابوں میں" ابن انشاء کے اس سفر نامہ سے ماخوذ ہے:

☆دنیا گول ہے ☆ابن بطوطہ کے تعاقب میں ☆ **آوارہ گرد کی ڈائری**

3. میاں ہدہد کا کردار اس مضمون میں موجود ہے:

☆میبل اور میں ☆ **ایک شام ماضی کی محرابوں میں** ☆بردبار اور دانشمند

4. ابن انشاء نے میاں ہدہد کس کو کہا؟

☆ **گائیڈ** ☆دکاندار ☆امام مسجد

5. فاتح بیت المقدس انھیں کہا جاتا ہے:

☆ٹیپو سلطان ☆ **صلاح الدین ایوبی** ☆محمود غزنوی

6. ابن انشاء نے اپنے سفر نامے میں اس مجاہد کا ذکر کیا ہے:

☆ٹیپو سلطان ☆ **صلاح الدین ایوبی** ☆محمود غزنوی

7. "اردو کی آخری کتاب" اور "خمار گندم" کے مصنف ہیں:
☆پطرس بخاری ☆شفیق الرحمن ☆ **ابن انشاء**

8. ابن انشاء کا اصل نام تھا:
☆احمد شاہ ☆ **شیر محمد خان** ☆محمد عمر

9. مدرسہ ناصریہ کی بنیاد انھوں نے رکھی:
☆ **ناصر الدین ایوبی** ☆ صلاح الدین ایوبی ☆سر سید احمد خان

میکسیکو سٹی اور میں

1. سبق "میکسیکو سٹی اور میں" ان کی تحریر ہے:
☆ڈپٹی نذیر احمد ☆محمد حسین آزاد ☆ **بیگم اختر ریاض الدین**

2. سبق "میکسیکو سٹی اور میں" کا ماخذ ہے:
☆ **دھنک پر قدم** ☆سات سمندر پار ☆دنیا گول ہے

3. خاتون سفر نامہ نگار کی حیثیت سے شہرت پانے والی ادیبہ کا نام ہے:
☆خدیجہ مستور ☆ہاجرہ مسرور ☆ **بیگم اختر ریاض الدین**

4. اس سفر نامے کو آدم جی انعام سے نوازا گیا:
☆سات سمندر پار ☆چلتے ہو تو چین کو چلیے ☆ **دھنک پر قدم**

5. میکسی ملین کا تعلق اس ملک سے تھا:
☆جاپان ☆ **فرانس** ☆اٹلی

6. ہسپانوی فاتح کورتے نے اس شہر کو نئی دنیا کے وینس کا لقب دیا:
☆اٹلی ☆نیویارک ☆ **میکسیکو سٹی**

7. سطح سمندر سے میکسیکو سٹی کی بلندی کتنے فٹ ہے؟
☆ **سات ہزار** ☆دس ہزار ☆پندرہ ہزار

خطوط

1. خطوط نگاری کی ابتداء اس سلطنت سے ہوئی:
☆ **سلطنت روم** ☆سلطنت یونان ☆سلطنت عثمانیہ

2. اردو میں جدید خطوط نگاری کی ابتداء انھوں نے کی:
☆ **مرزا غالب** ☆علامہ اقبال ☆اکبر الہ آبادی

3. شاعری کے علاوہ مرزا غالب کی شہرت کی دوسری وجہ ہے:
☆افسانہ نگاری ☆شراب نوشی ☆ **خطوط نگاری**

4. مراسلے کو مکالمہ بنانے والے مکتوب نگار کا نام ہے:
☆اکبر الہ آبادی ☆اقبال ☆ **غالب**

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS www.studyparh.xyz

5. اردوئے معلی ان کے خطوط کا مجموعہ ہے:

☆ **غالب** ☆اقبال ☆آزاد

6. نصاب میں شامل خط میں غالب نے بے سروپا کس کو کہا:

☆میر مہدی مجروح ☆میر سرفراز ☆ **یوسف مرزا**

7. میر مہدی مجروح غالب کے کون تھے؟

☆دوست ☆ **شاگرد** ☆بھائی

8. نصاب میں شامل خط علامہ اقبال نے ان کے نام لکھا:

☆ **مولوی انشاء اللہ خان** ☆میر سرفراز ☆یوسف مرزا

9. اقبال نے اپنے خط میں اس شہر کو اسلامی شان و شوکت کا قبرستان کہا:

☆کراچی ☆ **دہلی** ☆بمبئی

10. اکبر الہ آبادی کا اصل نام ہے:

☆ابرار حسین ☆ **اکبر حسین** ☆انور حسین

11. نصاب میں موجود خطوط میں سے سید افتخار حسین اور حبیب الرحمن شیروانی کو خطوط انھوں نے لکھے:

☆ **اکبر الہ آبادی** ☆اقبال ☆غالب

12. نصاب میں موجود خطوط میں سے میر مہدی مجروح اور یوسف مرزا کو خطوط انھوں نے تحریر کیے:

☆اکبر الہ آبادی ☆اقبال ☆ **غالب**

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS www.studypak.xyz

حصہ نظم

حمد

1. جس نظم میں اللہ کی تعریف کی جائے اسے کہا جاتا ہے:

☆ **حمد** ☆نعت ☆غزل

2. نصاب میں شامل حمد کے شاعر ہیں:

☆ظفر علی خان ☆حفیظ جالندھری ☆ **نظیر اکبر آبادی**

نعت

1. جس نظم میں محمد رسول اللہ ﷺ کی تعریف کی جائے اسے کہا جاتا ہے:

☆حمد ☆ **نعت** ☆غزل

2. نصاب میں شامل نعت کے شاعر ہیں:

☆ **ظفر علی خان** ☆حفیظ جالندھری ☆نظیر اکبر آبادی

خواجہ میر دردؔ

1. تصوف کو سب سے پہلے اردو شاعری میں لانے والے شاعر ہیں:

☆میر تقی میر	☆ **میر درد**	☆اسد اللہ غالب

2. اردو غزل کا پہلا "صوفی شاعر" انھیں کہا جاتا ہے:

☆علامہ اقبال	☆میر تقی میر	☆ **میر درد**

3. خواجہ میر درد کا تعلق ہندوستان کے اس شہر سے تھا:

☆ **دہلی**	☆لکھنؤ	☆حیدر آباد

4. اردو شاعری میں تصوف کا امام انھیں کہا جاتا ہے:

☆میر تقی میر	☆ **میر درد**	☆اسد اللہ غالب

5. میر درد کے والد کا نام تھا:

☆رفیع سودا	☆حسرت موہانی	☆ **ناصر عندلیبؔ**

JOIN FOR MORE!!!

میر تقی میرؔ

1. اردو شعراء میں سے انھیں خدائے سخن کہا جاتا ہے:

☆ **میر تقی میر**	☆میر درد	☆اسد اللہ غالب

2. سر تاج الشعراء ان کا لقب ہے:

☆میر درد	☆ **میر تقی میر**	☆اسد اللہ غالب

3. کس شاعر کے بہتر اشعار کو بہتر نشتر سے تعبیر کیا جاتا ہے؟

☆فیض احمد فیض	☆میر درد	☆ **میر تقی میر**

4. شہنشاہ غزل انھیں کہا جاتا ہے:

☆ **میر تقی میر**	☆میر درد	☆اسد اللہ غالب

5. شاعرِ غم کے لقب سے انھیں یاد کیا جاتا ہے:

☆میر درد	☆ **میر تقی میر**	☆اسد اللہ غالب

6. میر تقی میر کا اصل نام تھا:

☆میر محمد مہدی	☆میر محمد علی	☆ **میر محمد تقی**

M.HARIS BASIM

خواجہ حیدر علی آتشؔ

1. کس شاعر کے کلام میں محاورہ کا لطف سب سے زیادہ ہے؟

☆ **آتش**	☆میر درد	☆اسد اللہ غالب

2. خواجہ حیدر علی آتش کا تعلق شاعری کے اس دبستان سے تھا:

☆دہلی	☆ **لکھنؤ**	☆لاہور

مرزا اسد اللہ خان غالبؔ

1. شاعری میں جدت طرازی اور فلسفہ کو انھوں نے اجاگر کیا:

☆میر تقی میر ☆میر درد ☆ **اسد اللہ غالب**

2. حیوان ظریف انھیں کہا جاتا ہے:

☆ **اسد اللہ غالب** ☆میر درد ☆حالی

3. غالب کو حیوان ظریف کس نے کہا؟

☆میر تقی میر ☆میر درد ☆ **حالی**

4. غالب پہلے اس نام سے شاعری کیا کرتے تھے:

☆میر ☆ **اسد** ☆ظریف

5. نجم الدولہ اور دبیر الملک ان کے خطابات ہیں:

☆ **اسد اللہ غالب** ☆میر درد ☆علامہ اقبال

6. ان کے دیوان کو "ہندوستان کی الہامی کتاب" کہا جاتا ہے:

☆میر تقی میر ☆میر درد ☆ **اسد اللہ غالب**

7. پہلا فلسفی شاعر انھیں کہا جاتا ہے:

☆میر تقی میر ☆ **اسد اللہ غالب** ☆علامہ اقبال

8. بذلہ سنج شاعر انھیں کہا جاتا ہے:

☆میر تقی میر ☆میر درد ☆ **اسد اللہ غالب**

9. شاعری کے علاوہ غالب کی شہرت کی دوسری وجہ یہ ہے:

☆ **خطوط نگاری** ☆ خود پسندی ☆ شراب نوشی

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS BASIM
www.studyplan.xyz

مولانا حسرتؔ موہانی

1. حسرت موہانی کا اصل نام تھا:

☆میر حسرت ☆ **سید فضل الحسن** ☆محمد حسرت

2. مسیحائے غزل / غزل کا مسیحا انھیں کہا جاتا ہے:

☆ **حسرت موہانی** ☆میر درد ☆اسد اللہ غالب

3. رئیس المتغزلین ان کا لقب ہے:

☆میر تقی میر ☆میر درد ☆ **حسرت موہانی**

4. آبروئے غزل انھیں کہا جاتا ہے:

☆میر تقی میر ☆ **حسرت موہانی** ☆اسد اللہ غالب

5. تحریک آزادی کے دوران کس اردو شاعر نے قید بامشقت کی سزا کاٹی؟

☆ **حسرت موہانی** ☆میر درد ☆علامہ اقبال

6. سید الاحرار ان کا لقب ہے:

☆میر تقی میر ☆میر درد ☆ **حسرت موہانی**

7. اردو غزل کے احیاء کی شاعری ان کے کلام کو کہا جاتا ہے:

☆میر تقی میر ☆ **حسرت موہانی** ☆اسد اللہ غالب

فیض احمد فیضؔ

1. فیض کا شمار کن شاعروں میں ہوتا ہے؟

☆رجعت پسند ☆ **ترقی پسند** ☆رومانویت پسند

2. لینن ادبی انعام پاکستان کے کس اردو شاعر کے حصے میں آیا؟

☆ **فیض احمد فیض** ☆بشیر بدر ☆ جگر

3. "نقش فریادی، دست صبا، سرِ وادیٔ سینا اور مرے دل مرے مسافر" ان کے مجموعہ ہائے کلام ہیں:

☆میر تقی میر ☆میر درد ☆ **فیض احمد فیض**

ناصرؔ کاظمی

1. ناصر کاظمی کا اصل نام ہے:

☆ناصر علی ☆ناصر خان ☆ **ناصر رضا**

2. نئے تجربات کا شاعر انھیں کہا جاتا ہے:

☆ **ناصر کاظمی** ☆میر درد ☆اسد اللہ غالب

سچل سرمست

1. شاعر ہفت زبان انھیں کہا جاتا ہے:

☆میر تقی میر ☆میر درد ☆ **سچل سرمست**

2. سچل سرمست اس زبان کے شاعر ہیں:

☆اردو ☆ **سندھی** ☆پنجابی

3. نصاب میں شامل سچل سرمست کی سندھی نظم کا اردو ترجمہ انھوں نے کیا:

☆ **آفاق صدیقی** ☆ شیخ ایاز ☆شاہ عبد اللطیف

برسات کی بہاریں

1. نظم "برسات کی بہاریں" ان کا شاہکار ہے:

☆میر تقی میر ☆میر درد ☆ **نظیر اکبر آبادی**

2. اردو کا پہلا عوامی یا جمہوری شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے:

☆ **نظیر اکبر آبادی** ☆میر درد ☆اسد اللہ غالب

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS BASIM

3. "ہنس نامہ، مفلسی، بنجارانامہ، آدمی نامہ" کے شاعر ہیں:

☆میر تقی میر ☆ **نظیر اکبر آبادی** ☆اسد اللہ غالب

4. اردو کا وہ کون سا شاعر ہے جس نے غزل کے دور میں نظم کی اہمیت و افادیت ثابت کی؟

☆ **نظیر اکبر آبادی** ☆میر درد ☆اسد اللہ غالب

5. اردو زبان کا بنجارہ شاعر انھیں کہا جاتا ہے:

☆میر تقی میر ☆میر درد ☆ **نظیر اکبر آبادی**

6. مصوّرِ فطرت انھیں کہا جاتا ہے:

☆ **نظیر اکبر آبادی** ☆میر درد ☆اسد اللہ غالب

آمد صبح

1. نظم "آمد صبح" کے شاعر ہیں:

☆ **میر انیس** ☆میر درد ☆اسد اللہ غالب

2. اردو مرثیہ نگاری کا سب سے سب سے بڑا شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے:

☆میر تقی میر ☆میر درد ☆ **میر انیس**

3. میر انیس کا تعلق ہندوستان کے اس شہر سے تھا:

☆الہ آباد ☆دہلی ☆ **لکھنؤ**

4. نظم "آمد صبح" ہیئت کے اعتبار سے کیا ہے؟

☆رباعی ☆ **مسدس** ☆مخمس

5. نظم "آمد صبح" کس نوعیت کی نظم ہے؟

☆غزل ☆نعت ☆ **مرثیہ**

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS
www.studyhub.xyz

تعلیمات نبوی ﷺ

1. نظم "تعلیمات نبوی ﷺ" کے شاعر ہیں:

☆ **الطاف حسین حالی** ☆محمد حسین آزاد ☆سر سید احمد خان

2. اردو میں قومی شاعری کی ابتداء انھوں نے کی:

☆میر تقی میر ☆میر درد ☆ **الطاف حسین حالی**

3. اردو کا پہلا قومی شاعر انھیں کہا جاتا ہے:

☆میر تقی میر ☆ **الطاف حسین حالی** ☆اسد اللہ غالب

4. حالی کی سب سے اہم نظم کون سی ہے؟

☆ **مسدس مدو جزر اسلام** ☆برسات کی بہاریں ☆پرانا کوٹ

5. نظم تعلیمات نبوی ﷺ کی ہیئت کیا ہے؟

☆مثنوی ☆مخمس ☆ **مسدس**

6. حالی نے مسدس مد و جزر اسلام ان کے کہنے پر لکھی:

☆ **سر سید احمد خان** ☆ میر درد ☆ اسد اللہ غالب

7. نظم تعلیمات نبوی ﷺ منتخب ہے:

☆ شاہنامۂ اسلام ☆ **مسدس مد و جزر اسلام** ☆ ضرب کلیم

روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے

1. نظم "روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" کے شاعر ہیں:

☆ **علامہ اقبال** ☆ میر درد ☆ اسد اللہ غالب

2. نظم "روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" اقبال کے اس مجموعے سے ماخوذ ہے:

☆ **بال جبریل** ☆ ضرب کلیم ☆ بانگ درا

3. شاعر مشرق انھیں کہا جاتا ہے:

☆ میر تقی میر ☆ میر درد ☆ **علامہ اقبال**

4. حکیم الامت ان کا لقب ہے:

☆ میر تقی میر ☆ **علامہ اقبال** ☆ اسد اللہ غالب

5. اقبال نے باب لندن اس شہر کو کہا:

☆ لکھنؤ ☆ کلکتہ ☆ **بمبئی**

6. اقبال نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری اس مضمون میں حاصل کی:

☆ اردو ادب ☆ **فلسفہ** ☆ انگریزی ادب

7. اقبال نے اردو کے علاوہ اس زبان میں بھی شاعری کی:

☆ **فارسی** ☆ انگریزی ☆ عربی

8. علامہ اقبال کا پہلا مجموعہ کلام ہے:

☆ ارمغانِ حجاز ☆ جاوید نامہ ☆ **پیامِ مشرق**

9. علامہ اقبال یہاں پیدا ہوئے:

☆ فیصل آباد ☆ **سیالکوٹ** ☆ لاہور

سلطان ٹیپو کی وصیت

1. نظم "سلطان ٹیپو کی وصیت" کے شاعر ہیں:

☆ **علامہ محمد اقبال** ☆ میر درد ☆ اسد اللہ غالب

2. نظم "سلطان ٹیپو کی وصیت" اقبال کے اس مجموعے سے ماخوذ ہے:

☆ بانگ درا ☆ **ضرب کلیم** ☆ بال جبریل

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS BASIM
www.studyxyz

سورۂ رحمٰن (ایک تاثر)

1. نظم "سورۂ رحمٰن ایک تاثر" ان کی نظم ہے:

☆میر تقی میر ☆ **جوش ملیح آبادی** ☆اسد اللہ غالب

2. شاعر انقلاب انھیں کہا جاتا ہے:

☆ **جوش ملیح آبادی** ☆میر درد ☆اسد اللہ غالب

3. شاعر شباب ان کا لقب ہے:

☆میر تقی میر ☆میر درد ☆ **جوش ملیح آبادی**

4. نظم "سورہ رحمٰن ایک تاثر" ہیئت کے اعتبار سے کیا ہے؟

☆مسدس ☆ **مخمس** ☆مثنوی

5. سورۂ رحمٰن قرآن پاک کی کون سی سورت ہے:

☆ **پچپیویں** ☆چھبیویں ☆ستائیسویں

6. عروس القرآن اور زینت القرآن اس سورت کو کہا جاتا ہے:

☆سورۃ البقرۃ ☆سورۃ یٰس ☆ **سورۃ الرحمٰن**

7. "شعلہ و شبنم، حرف و حکایت، عرش و فرش" اس شاعر کے مجموعہ ہائے کلام ہیں:

☆میر تقی میر ☆ **جوش ملیح آبادی** ☆اسد اللہ غالب

8. یادوں کی بارات ان کی تصنیف ہے:

☆ **جوش ملیح آبادی** ☆میر درد ☆اسد اللہ غالب

پرانا کوٹ

1. نظم "پرانا کوٹ" کے شاعر ہیں:

☆ **سید محمد جعفری** ☆الطاف حسین حالی ☆علامہ اقبال

2. سید محمد جعفری کی نظم "پرانا کوٹ" مشتمل ہے:

☆درد و غم ☆رنگ تغزل ☆ **طنزومزاح**

3. مزاحیہ شاعر انھیں کہا جاتا ہے:

☆اکبر الہ آبادی ☆ **سید محمد جعفری** ☆اسد اللہ غالب

4. نظم "پرانا کوٹ" میں کن دو مشہور سیاحوں کا ذکر ہے؟

☆ **واسکوڈی گاما، مارکوپولو** ☆کولمبس، انڈیانا ☆ابن بطوطہ، ابن خلدون

متفرقات

1. اردو اس زبان کا لفظ ہے:

☆فارسی ☆ہندی ☆ **ترکی**

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS BASIM
www.studyan.xyz

2. اردو کے لفظی معنیٰ ہیں:

☆ **لشکر** ☆ہتھیار ☆سپاہی

3. اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں:

☆اسد اللہ غالب ☆میر تقی میر ☆ **قلی قطب شاہ**

4. اردو کے پہلے غزل گو شاعر ہیں:

☆میر تقی میر ☆ **امیر خسرو** ☆رفیع سودا

5. اردو کے پہلے قومی شاعر ہیں:

☆میر تقی میر ☆امیر خسرو ☆ **الطاف حسین حالی**

6. اردو کے پہلے فلسفی شاعر ہیں:

☆ **اسد اللہ غالب** ☆امیر خسرو ☆رفیع سودا

7. بابائے اردو انھیں کہا جاتا ہے:

☆علامہ اقبال ☆سر سید احمد خان ☆ **مولوی عبد الحق**

8. اردو زبان کا سب سے پہلا قصہ ہے:

☆ **سب رس** ☆الف لیلیٰ ☆نیا قانون

9. اردو زبان کا پہلا ڈرامہ ہے:

☆سب رس ☆ **اندر سبھا** ☆انار کلی

10. مقالہ کس مضمون کو کہا جاتا ہے؟

☆مزاحیہ ☆تاریخی ☆ **تحقیقی**

11. اکبر الہ آبادی کو خطاب دیا گیا:

☆ابو الکلام ☆ **لسان العصر** ☆غزل کا مسیحا

12. شاعر رومان انھیں کہا جاتا ہے:

☆میر تقی میر ☆امیر خسرو ☆ **اختر شیرانی**

13. شاہنامۂ اسلام ان کا شاہکار ہے:

☆میر تقی میر ☆ **حفیظ جالندھری** ☆رفیع سودا

14. پاکستان کا قومی ترانہ انھوں نے لکھا:

☆ **حفیظ جالندھری** ☆علامہ اقبال ☆فیض

15. اس ڈرامہ نگار کو اردو کا شیکسپیئر کہا جاتا ہے:

☆سعادت حسن منٹو ☆ **آغا حشر کشمیری** ☆امتیاز علی تاج

16. اردو نثر کی ابتداء اس شہر سے ہوئی:

☆دہلی ☆لکھنؤ ☆ **دکن**

17. جس نظم کا ایک بند پانچ مصرعوں پر مشتمل ہو، اسے کہا جاتا ہے:

☆مسدس ☆ **مخمس** ☆رباعی

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS BASIM

18. مسدس کے ایک بند میں مصرعے ہوتے ہیں:

☆چار ☆پانچ ☆ **چھ**

19. شعر میں کسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا جائے تو اسے کہا جاتا ہے:

☆ **تلمیح** ☆استعارہ ☆تشبیہ

20. غزل کے پہلے شعر کو کہا جاتا ہے:

☆مقطع ☆ **مطلع** ☆حسن مطلع

21. غزل کے آخری شعر کو کہا جاتا ہے:

☆ **مقطع** ☆مطلع ☆حسن مطلع

22. غزل میں کس چیز کا ہونا ضروری ہے؟

☆مقطع ☆مطلع ☆ **قافیہ**

23. غزل میں ایک مطلع کے بعد دوسرا مطلع آئے تو اسے کہا جاتا ہے:

☆مقطع ☆مطلع ☆ **حسن مطلع**

JOIN FOR MORE!!!

24. ایک چیز کو دوسری چیز کے جیسا قرار دینے کا عمل کہلاتا ہے:

☆ **تشبیہ** ☆مطلع ☆حسن مطلع

25. وہ نظم جس کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں، اسے کہا جاتا ہے:

☆مسلسل نظم ☆ **مثنوی** ☆قصیدہ

26. استعارہ کے لفظی معنی ہیں:

☆کاٹنا ☆ **ادھار لینا** ☆اشارہ کرنا

27. شعر میں کسی بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا کہلاتا ہے:

☆تشبیہ ☆استعارہ ☆ **مبالغہ**

28. کسی چیز کی اصل وجہ کو چھوڑ کر، کوئی شاعرانہ وجہ بیان کرنا کہلاتا ہے:

☆تضاد ☆ **حسن تعلیل** ☆ تلمیح

☆......☆......☆

JOIN FOR MORE!!!
www.studypak.xyz

طریقۂ جواب سوال نمبر ۲

سوال نمبر۳: سالِ اوّل اور سال دوم میں دو اشعار کی تشریح کے ۱۰ نمبر ہیں ۔ اس لحاظ سے ایک شعر کی تشریح کے ۵ نمبر ہیں۔

☆ حوالہ شاعر ۱نمبر

☆ تشریح ۴نمبر

حوالہ ءشاعر میں شاعر کا درست نام تحریر کر دینا ہی کافی ہے۔ البتہ تشریح کے ذیل میں شعر کا بنیادی خیال اور فنی محاسن کی نشان دہی کے ساتھ ممکنہ تاریخی معاشرتی پس منظر موزوں الفاظ میں سلیقے سے تحریر کیا گیا ہو۔ تشریح کے ذیل میں اگر ہو سکے تو مناسب مماثل شعر لکھا جائے۔ ہر شعر کی تشریح میں لازمی طور پر بھرتی کے مماثل شعر شامل کرنے سے گریز کیا جائے۔

جوابی خاکہ

حوالہ ءشاعر:

مرکزی خیال:

فنی محاسن:

مشکل الفاظ:

تشریح:

مماثل شعر:

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS BASIM
www.studypak.xyz

اشعار کی تشریح

خواجہ میر درد

تعارفِ شاعر:

خواجہ میر درد کو اردو غزل گوئی کا سب سے بڑا صوفی شاعر کہا جاتا ہے۔ آپ نے شاعری کے دامن میں تصوف کے پھول کھلائے اور غزل کی بنیاد عشقِ حقیقی پر رکھی۔ آپ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے چنانچہ ایک دیوان فارسی کا ہے اور ایک دیوان اردو کا ۔فارسی نثر میں آپ نے تصوف کے موضوع پر کئی کتابیں لکھیں جن میں "اسرار الصلوٰۃ، نالہ درد، آہ سرد اور درد دل" قابل ذکر ہیں۔ مرزا علی لطف آپ کے بارے میں لکھتے ہیں:

اگرچہ دیوانِ درد بہت مختصر ہے لیکن سراپا درد و اثر رکھتا ہے۔

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS BASIM
www.studypak.xyz

شعر نمبر ۱:

دنیا میں کون کون نہ یک بار ہو گیا
پر منہ اس طرف نہ کیا اس نے جو گیا

حوالہ شاعر:

پیشِ نظر شعر خواجہ میر درد کی غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو اردو کا پہلا صوفی شاعر کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

یہ دنیا کوئی ایسا دلکش مقام نہیں جس سے کبھی نہ ختم ہونے والا تعلق قائم کیا جائے۔ دنیا کی بے ثباتی کا بیان۔

فنی خوبی:

مطلع،[غزل کا پہلا شعر]

تشریح:

اس شعر میں شاعر اپنا صوفیانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب سے یہ دنیا بنی ہے اس میں طرح طرح کے لوگ آئے اور اپنی زندگی گزار کر چلے گئے۔ ایک مرتبہ اس دنیا سے لوٹ کر چلے جانے والا شخص کبھی لوٹ کر نہ آیا۔ شاہ و گدا، آقا و غلام کسی نے بھی اس دنیا میں لَوٹنے کی آرزو نہ کی۔ اگر دنیا کوئی جاذبِ نظر جگہ ہوتی تو لوگ اس میں آنے کی خواہش کرتے اور ہمیشہ اس میں رہنے کی جستجو کرتے۔ شاعر کہتا ہے کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ دنیا ایک ناپسندیدہ مقام ہے۔ یہ کوئی امن و آشتی اور سکون کا گہوارہ نہیں کہ اس سے محبت کی جائے اور اس کی رنگینیوں میں دل لگایا جائے۔ اس مرکز میں ہر کوئی مصیبت میں مبتلا رہتا ہے' کسی کو سکون اور چین میسر نہیں۔ یہ ایک کانٹوں کا بستر اور دکھوں کی آماجگاہ ہے۔ تمام خواہشات کے پورے ہونے کا مرکز صرف آخرت ہے جہاں کی زندگی ابدی ہے۔ اس لئے ہمیں چاہئے کہ ہم اپنی زندگی کا ہر فعل آخرت کے مطابق کریں اور دنیا کی دلچسپیوں سے بے رغبت رہیں۔

مماثل شعر:

دنیا بری جگہ تھی کچھ اتنی کہ اس میں لوگ
اک بار آگئے تو دوبارہ نہ آسکے

شعر نمبر ۲:

پھرتی ہے میری خاک صبا دربدر لئے　　　اے چشمِ اشکبار! یہ کیا تجھ کو ہو گیا

حوالہ شاعر:

پیشِ نظر شعر خواجہ میر درد کی غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو اردو کا پہلا صوفی شاعر کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

شاعر نے اپنی بربادی اور محرومی کے احساس کو ظاہر کیا ہے۔

مشکل الفاظ:

صبا: صبح کی ہوا

چشم: آنکھ

اشکبار: آنسو بھری

تشریح:

پیشِ نظر شعر میں شاعر نے اپنے شکستہ جذبات کی نمائندگی کی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اِس دنیا میں عشق کی بدولت مجھے بہت آلام و مصائب کا سامنا کرنا پڑا اور میں نے اپنے محبوب سے بچھڑ کر بہت تکالیف و صعوبتیں برداشت کی ہیں۔ میں نہایت بے قراری کی حالت میں ہوں، میرا دل بہت مضطرب ہے اور میرے وجود پر سکتہ طاری رہتا ہے۔ میرا جسم ایسی آوارہ ریت کی مانند ہے جو ہوا کے رحم و کرم پر اِدھر سے اُدھر اُڑتی پھرتی ہے۔ محبوب سے جدائی کے بعد میرے اندر ایک ناقابلِ بیان خلاء پیدا ہو گیا ہے اور میں ایک ناگفتہ بہ کرب محسوس کر رہا ہوں۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جب انسان کا دل بوجھل ہوتا ہے تو اُس کی آنکھ اُس کا ساتھ دیتی ہے اور اَشک بہا کر دل کا بوجھ ہلکا کر دیتی ہے۔ شاعر اپنی پُرنم آنکھ کو مخاطب کر کہ کہتا ہے اے میری چشمِ تصور تجھے کیا ہو گیا ہے، تو نے مجھ سے بے وفائی کیوں کی؟ تو میری بے سہارگی اور لاچارگی میں میرا سہارا بنتی تھی! تو نے بھی اہلِ سماج کی طرح میرا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور آنسو بہانا بند کر دیا۔ تیری اِس بے رُخی کی وجہ سے میں مظلوم تر ہوتا گیا اور میری حالت بہت غیر ہو گئی۔ میری محبت رسوا ہو گئی اور مری زندگی برباد ہو گئی۔ اِس شعر میں شاعر کی بے قراری حد سے زیادہ بڑھی ہوئی نظر آتی ہے۔

مماثل شعر:

محبت میں ایک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

شعر نمبر ۳:

طوفانِ نوح علیہ السلام نے تو ڈبوئی زمین فقط　　　میں ننگِ خلق ساری خدائی ڈبو گیا

حوالہ شاعر:

پیشِ نظر شعر خواجہ میر درد کی غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو اردو کا پہلا صوفی شاعر کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

شاعر عاجزی اور انکساری کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ نہایت خطاکار اور گنہگار ہے۔

مشکل الفاظ:

ننگِ خلق: خلقت کی ذلت کا باعث

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS

خدائی: مخلوق

فنی خوبی:

صفت تلمیح،[حضرت نوح علیہ السلام کے واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا۔]

تشریح:

اس شعر میں شاعر نے صنعت تلمیح استعمال کی ہے۔ شاعر طوفانِ نوح علیہ السلام کا تاریخی واقعہ یاد دلاتے ہوئے یہ منظر پیش کرتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے دور میں لوگ نہایت سرکش و نافرمان تھے۔ ان کے گناہوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان سے ناراض ہو گیا اور ایک زبردست سمندری طوفان کی شکل میں ان پر عذاب نازل کیا۔ اس طوفان کے باعث اس قدر تباہی مچی کہ یہ کرہ ارض ڈوب گیا۔ شاعر کہتا ہے کہ میں اس سرکش قوم سے بھی بدتر ہوں۔ میں بہت گنہگار اور نافرمان ہوں۔ میرا رتبہ اللہ کے نزدیک اِس قدر کم ہے کہ پوری انسانیت میری وجہ سے شرمندہ ہے۔ تمام انسانوں اس بات پر افسوس اور ندامت ہے کہ ان کے درمیان ایک نہایت گنہگار شخص موجود ہے۔ شاعر کا کہنا ہے کہ قوم نوح علیہ السلام کی خطاؤں نے تو صرف یہ دنیا ڈبوئی تھی، مجھ نافرمان کی وجہ سے تمام انسانیت ہی شرم سے ڈوب گئی ہے۔ اس شعر میں شاعر نے عاجزی اور انکساری سے کام لیا ہے۔ ان کا ایسا کہنا ان کی بڑائی کی بہت بڑی دلیل ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا کہ جس ٹہنی پر جتنے شجر ہوتے ہیں وہ اتنی ہی جھکی ہوئی ہوتی ہے۔ شاعر کے ساتھ بھی کچھ اسی طرح کا معاملہ ہے۔

مماثل شعر:

میں ہوں وہ ننگِ خلق کہ کہتی ہے مجھ کو خاک
اس کو بنا کے کیوں میری مٹی خراب کی

شعر نمبر۴:

واعظ کسے ڈراوے ہے یومِ حساب سے
گریہ میرا تو نامہ اعمال دھو گیا

حوالہ شاعر:

پیشِ نظر شعر خواجہ میر درد کی غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو اردو کا پہلا صوفی شاعر کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

اللہ کے حضور عاجزی اور انکساری سے آہ وزاری کرنے والے شخص کے گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔

مشکل الفاظ:

واعظ:	نصیحت کرنے والا
یوم حساب:	قیامت کا دن
گریہ:	آہ وزاری، رونا

تشریح:

مندرجہ بالا شعر میں شاعر وعظ کرنے والے کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اے شیخ! تم ہم کو کیوں قیامت اور روزِ حساب کا خوف دلاتے ہو، تم ہم سے یہ کیوں کہتے ہو کہ اس دنیا میں اگر اچھے اعمال نہیں کریں گے تو روزِ آخرت ہمیں سخت سزا ملے گی اور خوف کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تم کو کیا خبر کہ ہم اپنے گناہوں اور خطاؤں پر کس قدر نادم ہیں۔ ہم اللہ کے حضور رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتے ہیں۔ ہم اپنی سرکشی اور نافرمانی پر اس قدر اشک بہاتے ہیں کہ ہمارا دامن بھیگ جاتا ہے۔ ہماری آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے بہت پر امید ہیں

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS BASIM www.studypak.xyz

اور ہمیں یہ یقین ہے کہ خدائے بزرگ و برتر نے ہمارے گناہ معاف کر دیے ہوں گے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اللہ کو اشکِ ندامت بہت پسند ہے۔ ہمارا دل بھی یہ کہتا ہے کہ روزِ جزا و سزا اللہ ہم پر رحم فرمائے گا اور ہمیں دوزخ کی آگ سے بچائے گا۔

مماثل شعر:

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

شعر نمبر ۵

پھولے گا اس زبان میں گلزارِ معرفت
یاں میں زمینِ شعر میں یہ تخم بو گیا

حوالہ شاعر:

پیشِ نظر شعر خواجہ میر درد کی غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو اردو کا پہلا صوفی شاعر کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

خواجہ میر درد یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ دنیائے سخن میں انھوں نے تصوف کا آغاز کر دیا ہے جس کی وجہ سے علمِ معرفت اردو شاعری میں عام ہو جائے گا۔ کنایۃً اپنی رفعتِ کلام کا بیان۔

فنی خوبی:

تشبیہ، [اردو زبان کو گلزار سے اور صوفیانہ شاعری کو بیج سے تشبیہ دی گئی ہے۔]

مشکل الفاظ:

گلزار: باغ
معرفت: علم
تخم: بیج

تشریح:

پیشِ نظر شعر میں شاعر کہتا ہے کہ میں نے اردو شاعری میں ایسا اندازِ بیان اختیار کیا ہے جس سے لوگوں کے اذہان علمِ الٰہی سے روشناس ہو رہے ہیں۔ گویا میں نے اردو شاعری کی زمین میں معرفت کا بیج بو دیا ہے اور اب اس بیج کی بدولت خدا شناسی کی ابتداء ہو گی۔ اردو شاعری میں بھی لوگ صوفیانہ اشعار کہیں گے اور یہ بیج ایک لہلہاتے گلشن کی صورت اختیار کر لے گا۔ اس شعر میں شاعر نے اپنی بات کو بڑی خوبصورتی سے واضح کیا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اردو شاعری کی دنیا اب تک صوفیانہ خیالات سے عاری تھی۔ انھوں نے اس گوشے کو بھی پُر کر دیا ہے۔ اب آنے والے شعراء ان کی اس سوچ کو آگے بڑھائیں گے اور اردو شاعری پاکیزگی اور رشد و ہدایت کا ذریعہ بن جائے گی۔ درد کا یہ دعویٰ بالکل درست ثابت ہوا۔ وقت کے ساتھ ساتھ تصوف اور معرفتِ الٰہی اردو شاعری کی ایک خصوصیت بن گئی۔

مماثل شعر:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

شعر نمبر ۶:

آیا نہ اعتدال پر ہرگز مزاجِ دہر　　　میں گرچہ گرم و سردِ زمانہ سمو گیا

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS BASIM www.studyplan.xyz

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر خواجہ میر درد کی غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو اردو کا پہلا صوفی شاعر کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

زمانے کے ظلم و جبر پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اب بھی اہلِ سماج کا رویہ ہمارے ساتھ درست نہیں ہے۔

فنی خوبی:

صنعت تضاد، [گرم و سرد]

مشکل الفاظ:

اعتدال:	درمیانی راہ
دہر:	زمانہ
گرم و سرد:	برا بھلا

تشریح:

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS

پیشِ نظر شعر سے شاعر کے ذہن کی فصاحت و فلسفیانہ طرزِ فکر کا پتا چلتا ہے۔ شاعر تنقید و تنقیص سے کام لیتے ہوئے کہتا ہے کہ زمانہ بہت انتہا پسند واقع ہوا ہے۔ زمانہ انسان کو بہت خوشیوں اور شادمانیوں سے نوازتا ہے۔ اُسے بہت سے خوبصورت لمحات دیتا ہے اور بہت لطیف اور نرم و ملائم نقوش چھوڑ جاتا ہے۔ ساتھ ساتھ یہی زمانے انسان کو بہت سی تلخ حقیقتوں سے بھی روشناس کراتا ہے اور یہ تاریکیاں اُس کے وجود کا حصہ بن جاتی ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ میں نے زندگی اور معاشرے کے یہ دونوں رنگ دیکھے ہیں۔ دنیا کا نشیب و فراز دیکھا ہے اور اچھائیوں اور برائیوں کا بہت قریب سے تجربہ کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جب انتہاء اور ابتداء ملا دی جائے تو ایک درمیانی راہ نکل آتی ہے اور یہ میانہ روی کا راستہ ہی بہترین اور پسندیدہ راستہ ہوتا ہے۔ میں نے جب زمانے کے دکھ اور سکھ دونوں دیکھ لیے ہیں تو زمانے کا میرے ساتھ سلوک اور برتاؤ اعتدال پر آجانا چاہیئے تھا اور میرے معاملات سے شدت ختم ہو جانی چاہیئے تھی۔ جبکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس زندگی کو خوشیوں کے احساسات سے سجاؤں لیکن یہ سماج، یہ معاشرہ اور یہ زمانہ اب بھی میرے وجود پر بہت تند، سخت اور جفاکار ہے اور میری جذبات کی قدر نہیں کرتا۔

مماثل شعر:

برسوں چلے قتیلؔ زمانے کے ساتھ ہم
واقف ہوئے نہ پھر بھی زمانے کی چال سے

شعر نمبر ۷:

اے دردؔ جس کی آنکھ کھلی اِس جہان میں
شبنم کی طرح جان کو وہ اپنی رو گیا

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر خواجہ میر درد کی غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو اردو کا پہلا صوفی شاعر کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

دنیا کی رونقیں اور تمام معاملات انسان کی وجہ سے ہیں اور دنیا کا وجود انسان کے لئے ایک امتحان ہے۔

فنی خوبی:

تشبیہ، [زندگی کے اختصار کو شبنم سے تشبیہ دی گئی ہے۔]

تشریح:

پیشِ نظر شعر میں شاعر ایک خوبصورت حقیقت کو بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ شاعر نے صوفیانہ انداز میں انسانی زندگی کی تصویر کشی کی ہے۔ درد کہتے ہیں کہ دنیا میں جب کوئی آتا ہے تو اُس کی پیدائش پر بہت خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ مٹھائیاں تقسیم ہوتی ہیں، شکرانے کے نوافل ادا کئے جاتے ہیں اور خاندان میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہی۔ آپ نے انسان کی اس دنیا میں آمد کو شبنم سے تشبیہ دی ہے۔ شبنم جب رات کو پھولوں پر پڑتی ہے تو درخت اور پتے چمک اٹھتے ہیں۔ گلشن میں ہر سو اُجالا پھیل جاتا ہے اور پورا چمن مہک اٹھتا ہے۔ یہی حال انسان کا ہے۔ اس دنیا میں آمد کے ساتھ ہی وہ مسرت و شادمانیاں لے کر آتا ہے اور انسانوں کی بستی کو رنگین بنا دیتا ہے۔ لیکن جس طرح شبنم چند لمحوں کے لئے ہوتی ہے اور دھوپ کی سختی کا مقابلہ کرتے کرتے آخر کار فنا ہو جاتی ہے اسی طرح انسانی وجود بھی اس دنیا میں چند طویل لمحوں کا مہمان ہے۔ یہ بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زندگی کی مشکلوں اور پریشانیوں میں گھر جاتا ہے۔ معاشرے اور سماج کے ظلم و جبر برداشت کرتے کرتے اُس کی قوت زائل ہو جاتی ہے اور آخر کار وہ اِس زندگی سے ہار کر ہمیشہ کے لئے فنا ہو جاتا ہے۔ اپنی جان اُس کے اختیار میں نہیں رہتی اور وہ اُس کا تابع بن کر اِس دنیا کو خیر باد کہہ دیتا ہے۔

مماثل شعر:

نہ تو زمین کے لئے نہ آسمان کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہان کے لئے

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS BASIM
www.studypak.xyz

غزل(۲)

شعر نمبر ۱:

ہے غلط گر گمان میں کچھ ہے
تجھ سوا بھی جہان میں کچھ ہے؟

حوالہ شاعر:

پیشِ نظر شعر خواجہ میر درد کی غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو اردو کا پہلا صوفی شاعر کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

اللہ تعالیٰ کی وحدت کا اقرار۔ اس وسیع و عریض کائنات میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور ہستی موجود نہیں ہے۔

فنی خوبی:

مطلع، [غزل کا پہلا شعر]

تشریح:

پیشِ نظر شعر میں شاعر اپنی کیفیت کی ترجمانی کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہیں کہ کون و مکان کی وسعتوں میں صرف ایک ہی ہستی جلوہ گر ہے اور صرف ایک ہی معبود کا نور پھیلا ہوا ہے۔ اگر ہم گنہگار انسانوں کے اذہان میں یہ خیال آتا ہے کہ اس کائنات میں خدائے بزرگ و برتر کے علاوہ بھی کوئی اور ہستی موجود ہے تو یہ سراسر غلط ہے اور شرک کی ابتداء ہے۔ ارض و سما کا ہر ذرہٗ جمال نورِ خداوندی کا مظہر ہے۔ اس کرہٗ ارض میں موجود چمکتی نہریں، حسین و دلکش وادیاں، آفتاب و مہتاب، فلک و زمین ہر شے اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور کا وجود نہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ جب اس پھیلی ہوئی کائنات میں ہر طرف اللہ تعالیٰ کا حسن موجود ہے تو ہمارے دل و دماغ اور سوچ و فکر میں بھی اسی کا خوف ہونا چاہئے۔ ہمیں اپنے خالقِ حقیقی سے محبت کرنی چاہئے، ہمارا ہر عمل اسی کے احکامات کے مطابق ہونا چاہیے، ہماری خواہشات، ہماری آرزوئیں، ہمارے افکار

سب اللہ تعالیٰ کے امر و نہی کے پابند ہونے چاہئے۔ ہماری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ ہم اپنی زندگیاں اللہ تعالیٰ کے دین کے مطابق بسر کریں اور دنیاو آخرت میں سرخرو ہو کر اللہ تعالیٰ کی قربت حاصل کریں۔

مماثل شعر:

جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

شعر نمبر۲:

دل بھی تیرے ہی ڈھنگ سیکھا ہے — آن میں کچھ ہے، آن میں کچھ ہے

حوالہ شاعر:

پیشِ نظر شعر خواجہ میر درد کی غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو اردو کا پہلا صوفی شاعر کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

مندرجہ بالا شعر میں شاعر نے دل کی کیفیات کا سہارا لیتے ہوئے بڑی خوبصورتی سے محبوب کی تلوّن مزاجی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

تشریح:

اِس شعر میں شاعر اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ آج کل میرا دل کچھ عجیب سی کیفیت سے دوچار ہے۔ میرے دل میں ایک بے چینی اور بے قراری ہے۔ میرا دل فیض، سکون، نشاط اور راحت سے عاری ہے۔ ہر لمحہ میرے دل میں ایک نئی اضطرابی کیفیت جنم لیتی ہے اور میرا دل طرح طرح کے طریقوں سے مجھ پر ظلم کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اے دل گرفتہ محبوب! میرا دل تیری محبت میں گرفتار ہے اس لئے اِس نے بھی تیرے ہی طور طریقے سیکھیں ہیں۔ اس کا رویہ آج کل ایسا ہے جیسا تیرا برتاؤ ہے۔ شاعر کو اپنی محبوب کی رضا و مشیت بہت عزیز ہے۔ اس لئے وہ بڑی خوبصورتی سے اپنے محبوب کو اِس بات سے آگاہ کرتے ہیں کہ تیرا مزاج بھی ہر گھڑی بدلتا رہتا ہے اور یکساں نہیں رہتا۔ میرا دل بالکل تیرے برتاؤ کی طرح ہے۔ کسی لمحہ تو ہم پر مہربان ہو جاتا ہے اور کسی لمحہ تو ہم کو امتحان میں ڈال دیتا ہے، کبھی بیگانگی کا مظاہرہ کرتا ہے تو کبھی یگانگت کا۔ غرض ہر نیا آنے والا لمحہ مجھے ایک نئے سلوک سی ہمکنار کراتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہمارا یہ تم سے متاثر دل کبھی ایک حالت پر نہیں رہتا۔

مماثل شعر:

ایک حالت پر نہ رہنے پائیں دل کی حالتیں — تم نے جب دیکھا نئے انداز سے دیکھا مجھے

شعر نمبر۳:

"لے خبر" تیغِ یار کہتی ہے — "باقی اس نیم جان میں کچھ ہے"

حوالہ شاعر:

پیشِ نظر شعر خواجہ میر درد کی غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو اردو کا پہلا صوفی شاعر کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

محبوب کی سنگ دلی کا بیان۔

مشکل الفاظ:

تیغ: تلوار

نیم جان: ادھ موا

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS

تشریح:

مندرجہ بالا شعر میں شاعر نے ایک سچے عاشق کے کردار کی ترجمانی کی ہے۔ شاعر کا محبوب جو اُس کے نہایت کرخت امتحان لیتا ہے شاعر کے ذہن میں یہ بات نقش کر جاتا ہے کہ اُس کا عاشق اُس پر شاید اس لئے ظلم و ستم کر رہا ہے کہ وہ مر جائے اور اُس کی موت کی وجہ سے محبوب کی روح کو تسکین پہنچ جائے۔ وہ مخاطب کرتا ہے کہ اے میرے ناراض محبوب! تو نے ہم پر بہت ظلم و ستم کر لئے۔ تیرے مظالم و جبر ہم پر اِس حد تک ہیں کہ ہمارے اندر ہماری جان بھی باقی نہیں رہی۔ ہم نہایت ہی مظلوم اور بے کس ہو گئے ہیں۔ لیکن پھر بھی ہم کو تیری رضا اور خوشنودی مشروط ہے۔ ہم یہی چاہتے ہیں کہ ہم تیری توجہ کا مرکز بنے رہیں اور اسی حالت میں رخصت ہو جائیں۔ تو ہمارے قتل کا بہت شائق ہے اور شاید تو سمجھ رہا ہے کہ تیرے اِن سختیوں کی وجہ سے اب تک ہم تم سے جدا بھی ہو گئے ہوں گے۔ لیکن ہم تجھ کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اب بھی ہم میں کچھ جان موجود ہے حالانکہ تیری خوشی اس میں ہے ہم بالکل فنا ہو جائیں۔ اس لئے ہماری آرزو ہے کہ تو ہمارے مزید امتحان لے کر ہماری اِس حیاتِ فانی کو بالکل ختم کر دے۔ ہماری بھی آرزو پوری ہو جائے گی کہ مرتے وقت ہم کو صرف اور صرف تیرا دیدار نصیب ہو گا۔

مماثل شعر:

تجھ کو برباد تو ہونا تھا مرے دل لیکن
ناز کر ناز! کہ اُس نے تجھے برباد کیا

JOIN FOR MORE!!!

شعر نمبر ۴:

اِن دنوں کچھ عجب ہے میرا حال	دیکھتا کچھ ہوں، دھیان میں کچھ ہے

حوالہ شاعر:

پیشِ نظر شعر خواجہ میر درد کی غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو اردو کا پہلا صوفی شاعر کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

زیرِ تشریح شعر میں شاعر نے عشق کی والہانہ کیفیت کا ذکر کیا ہے۔

تشریح:

مندرجہ بالا شعر میں شاعر نے عشق کی کیفیت کو بیان کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جذبہ عشق ایک ایسا جذبہ ہے جس کی شدت کا یہ عالم ہے کہ دل و دماغ پر محبوب کا تصور چھایا رہتا ہے۔ محبوب چاہے اُس کے نزدیک ہو یا نہ ہو، اُس کے پاس آئے یا نہ آئے، اُس سے کوئی بندھن رکھے یا نہ رکھے، اُس کی عزت و عقیدت کرے یا نہ کرے، وہ ہمیشہ اُس کی ذات میں بسا رہتا ہے۔ ہر لمحے محبوب کی یاد اُسے ستاتی رہتی ہے۔ بظاہر وہ اس دنیا کے معاملات میں مگن نظر آتا ہے لیکن در حقیقت وہ اپنے ہم عصروں کو دھوکا دے رہا ہوتا ہے۔ اُسے ہر چیز میں اپنا محبوب نظر آتا ہے، ہر آواز اپنے چاہنے والے کی معلوم ہوتی ہے اور ہر آہٹ محبوب کی سنائی دیتی ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ۔

بیٹھے بیٹھے اپنے خیالوں میں گم ہو جاتا ہوں
اب میں اکثر میں نہیں رہتا تم ہو جاتا ہوں

شاعر کہتا ہے کہ اگر یہ جذبہ کسی کے دل میں موجود ہو تو وہ ایک عجیب کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے۔ اُس کا دل و دماغ بے خودی کے عالم میں چلا جاتا ہے اور کائنات کی ہر شے اُسے محبوب کی یاد دلاتی ہے۔ ہر لمحہ اُس کے ذہن میں اپنے چاہنے والے کی خوشبو مہکتی رہتی ہے اور وہ خوبصورت یادوں کو دہرا کر ایک نشے میں مست ہو جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ آج کل ہم بھی اسی قسم کی کیفیت سے دوچار ہیں اور ہم پر بھی ہر وقت کسی کا سایہ رہتا ہے۔ درد کا یہ شعر سہلِ ممتنع کی بہترین مثال ہے۔

مماثل شعر:

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

شعر نمبر ۵:

اور بھی چاہئے سو کہیئے اگر　　　دلِ نامہربان میں کچھ ہے

حوالہ شاعر:

پیشِ نظر شعر خواجہ میر درد کی غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو اردو کا پہلا صوفی شاعر کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

شاعر اپنے محبوب سے کہ آپ کو جو بھی کہنا ہے کہہ لیں میں سر جھکا کر سننے کو تیار ہوں۔ شاید اس سے اِس نامہربان دِل کی بھڑاس نکل جائے اور آپ کے دل میں میرے لئے مہربانی کے جذبات پیدا ہوں۔

تشریح:

پیشِ نظر شعر میں شاعر خندہ پیشانی اور کشادہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اپنے محبوب کے طعنے، سرد مہری اور ظلم و ستم برداشت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے میرے محبوب! ہم تیرے سچے عاشق ہیں۔ ہم تیری توجہ ہر حال میں حاصل کرنا چاہتے ہیں چاہے اس کے لئے ہمیں ہر قسم کے طعنے اور کلمات سننے پڑیں۔ ہمیں اگر تیری زبان سے دل شکنی کی باتیں بھی سننی پڑیں تو بھی ہم نہایت خوش دلی سے اُن کو قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اگر تو ہمارے محبوب کی طرح ہم پر توجہ نہیں دے سکتا تو ہم کو یہی منظور ہے کہ تو ہم پر غصہ ہو اور ہم سے ناراضگی کا اظہار کرے۔ اِس لئے ہماری درخواست ہے کہ اگر تمہارے دل میں اور بھی کچھ ہے تو بلا تکلف کہو اور یہ مت سمجھنا کہ ہم برداشت نہیں کر سکیں گے۔ ہم بڑی خوشنودی اور رضا سے اس کا استقبال کریں گے اور تجھ پر بالکل ناراض نہ ہوں گے۔

شاعر اپنے محبوب کو اس اُمید پر دعوت دے رہے ہیں کہ شاید اُن کا محبوب غصے کے اظہار کے بعد اپنے رویے پر خود ہی شرمندہ ہو جائے اور اُس کا دل مہربان ہو جائے۔ اِس طرح شاعر کو اپنے محبوب کی قربت حاصل ہو جائے گی۔

JOIN FOR MORE!!!

مماثل شعر:

ناروا کہیے، ناسزا کہیے
کہیے کہیے مجھے برا کہیے

شعر نمبر ۶:

دردؔ تو جو کرے ہے جی کا زیاں　　　فائدہ اس زیاں میں کچھ ہے

حوالہ شاعر:

پیشِ نظر شعر خواجہ میر درد کی غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو اردو کا پہلا صوفی شاعر کہا جاتا ہے۔

مشکل الفاظ:

زیاں:　ضائع کرنا

تشریح:

شاعر اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اے درد تم جو ہر وقت اپنے ستم پیشہ اور تغافل پسند محبوب کے عشق میں خود کو

گھلاتے رہتے ہو، اذیتیں اٹھاتے ہو اور اس طرح اپنے دل کا نقصان کرتے ہو، اس نقصان میں آخر تم کیا فائدہ دیکھتے ہو؟ ظاہر ہے کہ جس چیز کو نقصان قرار دیا جائے اس کے ساتھ کسی قسم کے فائدے کا کیا تصور وابستہ کیا جاسکتا ہے؟ کیونکہ نقصان اور فائدہ دونوں کبھی بھی ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتے۔ چنانچہ اے درد تمھیں یہ عشق کا جھنجھٹ چھوڑ دینا چاہئے اور اپنے فائدے کی بات سوچنی چاہئے۔

میر تقی میر

تعارفِ شاعر:

میر تقی میر آسمانِ سخن کے درخشاں آفتاب ہیں۔ آپ کو اردو غزل گوئی میں ''خدائے سخن، سرتاج الشعراء اور شہنشاہِ غزل کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ انسانی احساسات وجذبات کی مکمل ترجمانی کرتے ہیں۔ بقول غالب ؎

ریختہ کہ تم ہی استاد نہیں ہو غالب! کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

غزل(۱)

JOIN FOR MORE!!!

حوالہء شاعر:

مندرجہ بالا شعر میر تقی میر کی ایک غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو خدائے سخن اور شہنشاہِ غزل کہا جاتا ہے۔

شعر نمبر۱:

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوا نے کام کیا دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

مرکزی خیال:

عشق ایک نہ ختم ہونے والی بیماری ہے جو انسان کو موت کے دہانے پر پہنچا دیتی ہے۔

مشکل الفاظ:

تدبیر: رائے، تجویز

کام تمام: ختم کرنا

فنی خوبی:

مطلع، [غزل کا پہلا شعر]

تشریح:

مندرجہ بالا شعر میں شاعر نے عجیب بے کسی کے ساتھ اپنی داستانِ حیات کو بیان کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم کو ایک نہایت سنگین مرض لاحق ہو گیا۔ زندگی گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ مرض بڑھتا گیا اور اس کی آثار ظاہر ہونے لگے۔ ہم نے اس مرض کے علاج کے لئے طرح طرح کی تدبیریں کی اور مختلف دواؤں سے علاج کیا، ہر طرح سے جتن کر ڈالے۔ لیکن عشق کوئی ایسا مرض نہیں ہے کہ اس کا علاج ہو جائے۔ جوں جوں ہم اس کا علاج کرتے رہے اس کی سنگینی بڑھتی گئی، دوائیں بے اثر ہو گئیں اور تمام تدبیریں الٹی ہو گئیں۔ پھر وہ وقت آگیا کہ یہ بیماری نا قابلِ برداشت ہو گئی اور اس کی وجہ سے ہم موت کے دہانے پر پہنچ گئے۔ اس روگ نے ہم سے ہماری زندگی چھین لی اور مرضِ دل کی بدولت ہم اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مصرعہ ثانی میں لفظ "دیکھا" ایک ڈرامائی کیفیت پیدا کر رہا ہے۔ اس سے پتا لگتا ہے شاعر کو یہ اندیشہ پہلے ہی سے تھا۔ وہ اس اندیشۂ جان کا ذکر محبوب سے پہلے بھی کر چکے تھے۔ اب یقین کے ساتھ محبوب کو جتاتے ہیں کہ دیکھا! اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا۔

مماثل شعر:

مریضِ عشق پر رحمت خدا کی
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

شعر نمبر ۲:

عہدِ جوانی رورو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند   یعنی رات بہت تھے جاگے، صبح ہوئی آرام کیا

حوالہءشاعر:

مندرجہ بالا شعر میر تقی میر کی ایک غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو خدائے سخن اور شہنشاہِ غزل کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

پیشِ نظر شعر میں شاعر اپنی دُکھ بھری داستانِ حیات بیان کر رہے ہیں۔

فنی خوبی:

صنعت تضاد،[جوانی، پیری-رات، صبح -جاگے، آرام کیا]

JOIN FOR MORE!!!

مشکل الفاظ:

عہد: زمانہ

پیری: بڑھاپا

موندنا: بند کرنا

تشریح:

زیرِ تشریح شعر میں شاعر نے اپنی حسرت ویاس بھری زندگی کی کہانی بیان کی ہے۔ جوانی کا دور حیاتِ انسانی کا سنہری دور ہوتا ہے۔ یہ امنگوں، آرزوؤں، خوابوں اور دلکشی ورعنائی کی نرم وملائم جہت ہوتی ہے۔ اِس میں انسان آزاد پنچھی کی مانند عزم وہمت اور بے فکری کی فضاؤں میں اُڑتا ہے۔ اِس عہد میں انسان کے پاس توانائیاں ہوتی ہیں اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے قوتیں ہوتی ہیں۔ شاعر کہتا کہ میں اتنا بدنصیب انسان ہوں کہ یہ سنہرا دور بھی آلام ومصائب کی نذر ہو گیا اور میں جوانی کے عشق کے سبب اس دور کی لطافتوں اور قوتوں سے بچھڑ گیا۔ میں نے یہ دور بھی نہایت دکھ درد اور بے چینی کے عالم میں اشک بہاتے ہوئے گزارا ہے۔ اب جب میں عمر کے آخری حصے میں پہنچ گیا ہوں تو میرے پاس اتنی ہمت وامید نہیں ہے کہ میں اپنے بھیانک ماضی کی وحشتیں دیکھ سکوں۔ میں اِس قدر ناتواں اور بے جان ہو گیا ہوں کہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ میری زندگی ایک ایسے شخص کی مانند ہے جس کی آنکھیں خمار آلود اور جسم بوجھل صرف اس وجہ سے ہے کہ وہ رات بھر کسی فکر میں جاگتا رہا ہے۔ اب اُس میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ دن اور طلوعِ آفتاب کے مناظر دیکھے۔ اسی لئے وہ خوابیدہ ہو جاتا ہے۔

مماثل شعر:

گیا شباب تو پیری نے آ کے دستک دی
پھر اس کے بعد ہمیشہ کو سو گیا انسان

شعر نمبر ۳:

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تُہمت ہے مختاری کی   چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں' ہم کو عبث بدنام کیا

حوالہءشاعر:

مندرجہ بالا شعر میر تقی میر کی ایک غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو خدائے سخن اور شہنشاہِ غزل کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

اس شعر میں شاعر اپنی زندگی کی بے کسی اور مجبوری بیان کر رہا ہے۔

فنی خوبی:

صنعت تضاد، [مجبور، مختار]

مشکل الفاظ:

ناحق: بلاوجہ

تہمت: الزام

مختاری: آزادی

عبث: بلاوجہ

JOIN FOR MORE!!!

تشریح:

مندرجہ بالا شعر میں شاعر اپنی مجبوری اور بے کسی کی منظر کشی کر رہا ہے۔ شاعر اپنے محبوب کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تم ہم سے یہ کیوں کہتے ہو کہ ہم اپنے فیصلوں اور ارادوں میں بااختیار ہیں اور ہر فعل اپنی مرضی اور خوشنودی سے سرانجام دیتے ہیں، ہماری زندگی کے لمحات ہمارے اپنے ہیں اور اس کا دارومدار ہمارے ذہن اور ہمارے ارادوں پر ہے۔ جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ہم تو بے کس اور مجبور ہیں۔ ہم تو وہی کرتے ہیں جو تم ہم سے کہتے ہو، ہمارے تمام اعمال تو تمہاری خواہشات کے مطابق ہیں، ہماری عشق کی انتہا یہ ہے کہ ہم نے اپنی مرضی بالکل ختم کر دی ہے اور ہر کام کرتے ہوئے اس بات کا خیال کرتے ہیں کہ تمہاری کیا مرضی ہے، تم کس طرح رضامند ہو گے اور ہمیں اپنے چاہنے والوں میں جگہ دو گے۔ اس کے باوجود اگر تم ہمیں اپنے ارادوں میں خود مختار کہتے ہو تو یہ ہم کو بے وجہ بدنام کرنے والی بات ہے اور یہ محض ایک الزام ہے۔

M.HARIS

مماثل شعر:

زندگی جبرِ مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

شعر نمبر ۴:

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اس کی اور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا

حوالہءشاعر:

مندرجہ بالا شعر میر تقی میر کی ایک غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو خدائے سخن اور شہنشاہِ غزل کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

محبوب کی دلی عقیدت و عزت کا بھرپور اظہار کیا ہے۔

مشکل الفاظ:

وحشت: تنہائی

کوس: سفر کی ایک مقررہ حد (تقریباً دو میل)

اور:　　طرف

گام:　　قدم

فنی خوبی:

صفت مبالغہ

تشریح:

شاعر کہتا ہے کہ ہمیں اپنے محبوب سے اس قدر لگاؤ ہے اور ہم اس کی اتنی عزت کرتے ہیں کہ نیم بے ہوشی اور مستی کی حالت میں بھی اس کی بے ادبی نہیں کرسکتے اور ہر حال میں اس کا احترام کرتے ہیں۔ چاہے ہم جتنے بھی ہوش وحواس سے عاری ہوں ہم اپنے رفیق کی عزت کرتے ہیں۔ چاہے ہم اس کے نزدیک ہوں یا اس سے کوسوں دور ہوں وہ ہماری عزت واحترام کا مستحق رہتا ہے۔ کبھی اگر ہم نہایت بے خودی کی حالت میں زبان سے کلمات نکال رہے ہوں تب بھی ہمارے ذہن میں یہ بات نقش ہوتی ہے کہ دنیا کے تمام انسانوں سے بڑھ کر ہمارا محبوب لائقِ احترام ہے۔ اس شعر میں جس کیفیت کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ عشق کی معراج ہے۔

مماثل شعر:

اس شوخ کو رسوا نہ کیا ہے نہ کریں گے
ہم نے کبھی ایسا نہ کیا ہے نہ کریں گے

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS www.studypak.xyz

شعر نمبر۵:

یاں کے سپید وسیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے　　رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

حوالہء شاعر:

مندرجہ بالا شعر میر تقی میر کی ایک غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو خدائے سخن اور شہنشاہِ غزل کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

شاعر اپنی زندگی کی بے بسی، لاچاری اور مجبوری بیان کر رہا ہے۔

مشکل الفاظ:

یاں:　　یہاں

سپید وسیاہ:　　برا بھلا

جوں توں:　　جیسے تیسے

فنی خوبی:

صنعت تضاد: [سپید وسیاہ]، [رات، دن]، [صبح، شام]

تشریح:

شاعر کہتا ہے کہ میں ایک بے اختیار اور بے بس انسان ہوں۔ میری بے چارگی کی حد یہ ہے کہ میں اپنی زندگی کے تمام تر معاملات میں مجبور ہوں اور میری مرضی کوئی اور تشکیل دیتا ہے۔ اس بے کس زندگی کے کسی بھی معاملے میں میرا دخل نہیں ہے اور میں سب کچھ اپنی مرضی کے خلاف کرتا ہوں۔ میرا اختیار ہے تو صرف اِس حد تک کہ میں دن کو بے قراری میں گزار دیتا ہوں اور رات کو چند آنسو بہا کر صبح دیکھ لیتا

ہوں۔ میں لطفِ زیست سے مایوس ہو چکا ہوں۔ میں جبر فطرت کا پیروکار بنا ہوا ہوں اور یہ دردوالم بھری زندگی لاچاری اور مجبوری میں بسر کر رہا ہوں۔

یہاں ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ شاعر نے یہ نہیں کہا کہ **"رات کو جوں توں صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا"**، بلکہ کہا کہ رات کو رو رو صبح کیا۔ اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ تکلیف کا مارا انسان دن کو تو کسی نہ کسی طرح گزار ہی لیتا ہے لیکن رات کو جب وہ تنہا ہوتا ہے تب رات کی وحشت اس کے درد کو دونا کر دیتی ہے اور وہ درد و غم اور ماضی کی تلخ یادوں کے تابڑ توڑ حملوں تلے دب کر اپنے آنسوؤں کے ذریعے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

مماثل شعر:

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

شعر نمبر۶:

ایسے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی — سحر کیا، اعجاز کیا، جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS BASIM
www.studyhub.xyz

حوالہ شاعر:

مندرجہ بالا شعر میر تقی میر کی ایک غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو خدائے سخن اور شہنشاہِ غزل کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

اس شعر میں میر اپنے محبوب کی اُن سے بیزاری کا تذکرہ کر رہا ہے۔

مشکل الفاظ:

آہوئے رم خوردہ: خوفزدہ ہرن
وحشت: تنہائی، خوف
سحر: جادو
اعجاز: عاجز کرنا
رام کرنا: راضی کرنا

فنی خوبی:

استعارہ، [محبوب کیلئے ہرن کا استعارہ استعمال کیا۔]

تشریح:

محبوب کی فطرت میں کرم کے بجائے بے رخی اور بے نیازی ہوتی ہے۔ وہ اپنے عاشق پر کبھی نظر عنایت نہیں کرتا۔ اگر کبھی التفات کرتا بھی ہے تو رقیب پر، اس لئے نہیں کہ اسے رقیب سے محبت ہے بلکہ اس لئے کہ وہ اپنے عاشق کو مزید تکلیف پہنچائے۔ یہاں شاعر نے محبوب کو آہوئے رم خوردہ سے استعارہ کیا ہے۔ جس طرح ہرن انسان کو دیکھ کر چوکڑیاں بھرتا ہوا اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح جب ہماری نظر محبوب سے ملتی ہے تو وہ ہم سے فوراً ہی نظریں چرا کر گزر جانا چاہتا ہے۔ اس کی ہم سے بیزارگی کا یہ عالم ہے کہ وہ ہمیں دیکھتے ہی کترا کر گزر جاتا ہے۔ اور ہمیں اتنا عکس بھی نہیں دیتا کہ ہم اس کا حسین عکس اپنی آنکھوں میں سمو سکیں۔ جبکہ وہ ہمارے رقیب پر نظر والتفات کی بارشیں کرتا ہے اور ہم یہ دیکھ کر حیران ہو جاتے ہیں کہ یہ وحشت زدہ ہرنی ہمارے سامنے ایک لمحہ بھی ٹھہرنے کو تیار نہیں۔ وہ ہماری لاکھ کوشش کے باوجود ہم سے مانوس نہیں۔

میر اپنے رقیبوں کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ واقعی وہ باکمال لوگ ہیں جنھوں نے تجھ کو اپنا اسیر بنالیا اور ہمیں تو اظہارِ محبت کا سلیقہ تک نہ آیا۔ ہمارا محبوب راستے کے پتھر کی طرح ہمیں ٹھوکر مارتا ہوا گزر جاتا ہے اور ہر بار ہمارے دل کو ایک نیا زخم دے جاتا ہے۔ ہم سے اچھے تو ہمارے رقیب ہیں جنھوں نے جانے کیا جادو کیا کہ وہ محبوب کو رام کر گئے۔

مماثل شعر:

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

غزل(۲)

شعر نمبر۱:

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

حوالہءشاعر:

مندرجہ بالا شعر میر تقی میر کی ایک غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو خدائے سخن اور شہنشاہِ غزل کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

یادِ ماضی عذاب ہے یارب!

مشکل الفاظ:

کسو: کسی

ستم زدہ: مظلوم

فنی خوبی:

مطلع، [غزل کا پہلا شعر]

تشریح:

میر تقی میر زیرِ نظر شعر میں عشق کی بے چینی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ محبت میں محبوب کی ذات سے ایک عجیب تعلق اور لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے اور عاشق اس کا نام سنتے ہی بے تاب ہو جاتا ہے۔ میر اپنے محبوب کے بارے میں کہتے ہیں کہ تیرے نام کے ساتھ جو احساسِ بے وفائی کا غم ہے، تیرا تصور اضطراب کن ہے۔ اب اگرچہ ہمارا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں مگر جب بھی کوئی ہمارے سامنے تیرا نام لیتا ہے تو ہمیں ماضی میں تجھ سے تعلق اور تیرے ظلم و ستم سبھی کچھ یاد آجاتے ہیں اور ہمارا دل اس قدر تڑپتا ہے کہ جیسا سینے سے باہر آجائے گا اور اس لمحے ہم اپنے آپ کو سنبھالنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

مماثل شعر:

آج کسی نے باتوں باتوں میں جب ان کا نام لیا
دل نے جیسے ٹھوکر کھائی، درد نے بڑھ کے تھام لیا

شعر نمبر۲:

قسم جو کھایئے تو طالعِ زُلیخا کی عزیزِ مصر کا بھی صاحب ایک غلام لیا

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS BASIM
www.studypark.xyz

حوالہءشاعر:

مندرجہ بالا شعر میر تقی میر کی ایک غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو خدائے سخن اور شہنشاہِ غزل کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

شاعر زلیخا کی خوش قسمتی بیان کر رہا ہے اور کہتا ہے کہ اس کی خوش نصیبی کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔

مشکل الفاظ:

طالع: قسمت

عزیز: سربراہ، گورنر

فنی خوبی:

- صنعتِ تلمیح،[حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا]
- صنعت تضاد،[صاحب، غلام]
- حسنِ تعلیل،[حضرت یوسف علیہ السلام کی کامیابیوں کی وجہ زلیخا کے عشق کو قرار دیا گیا ہے]

JOIN FOR MORE!!!

تشریح:

مندرجہ بالا شعر میں شاعر نے حُسنِ تلمیح سے کام لیتے ہوئے حضرت یوسف علیہ السلام کے مشہور واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ شاعر اس واقعہ کی روشنی میں زُلیخا کی قسمت کو قابلِ رشک اور بلند کہہ رہا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ زُلیخا وہ خوش قسمت عورت ہے جس کے گھر آنے والا ایک غلام بادشاہت کے بلند ترین منصب پر فائز ہو جاتا ہے اور زلیخا کو ہمیشہ کے لئے اُن کی قربت حاصل ہو جاتی ہے۔ زلیخا کے نصیب سے متاثر ہو کر شاعر کہتا کہ محبوب کا حصول ہی سب سے اچھی قسمت ہے۔ اس لئے اگر قسم کھانی ہو تو ہمیں عزیزِ مصر کی بیوی کی کھانی چاہئے جس کے بخت کی بدولت ایک ادنیٰ غلام دینی و دنیاوی دونوں اعتبار سے کمال بلندی پہ پہنچ گیا۔ گویا شاعر نے حضرت یوسف علیہ السلام کی کامیابیوں کی وجہ زلیخا کے عشق کو قرار دیا ہے۔

(۲)...... شعر کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عشق جب ہو جاتا ہے تو اِنسانی پابندیاں، اُونچ نیچ وغیرہ سب چیزیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر دنیا کے عاشقوں کو قسم کھانی ہے تو پھر زلیخا کی قسمت کی قسم کھائی جائے کیوں کہ زلیخا نے ایک عزیز کی بیوی ہونے کے باوجود ایک غلام سے عشق کیا اور یہ نہیں دیکھا کہ میرے اور اس کے مرتبے میں کتنا فرق ہے۔ شاعر نے اس کے لئے شعر میں صاحب کا لفظ اِستعمال کیا ہے کہ صاحب وہی ہے جسے زلیخا نے اپنے لئے چن لیا۔

مماثل شعر:

کیا خوش بختی ہے زلیخا کی، کیا زور ہے اُس کی قسمت کا
کل اُس نے خریدا تھا جس کو وہ آج ہے شامل شاہوں میں

شعر نمبر۳:

خراب رہتے تھے مسجد کے آگے میخانے نگاہِ مست نے ساقی کا انتقام لیا

حوالہءشاعر:

مندرجہ بالا شعر میر تقی میر کی ایک غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو خدائے سخن اور شہنشاہِ غزل کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

اس شعر میں میر اپنے محبوب کے حسن کی سحر انگیزی بیان کر رہے ہیں۔ خصوصاً نگاہ کی۔

مشکل الفاظ:

خراب: ویران

میخانہ: شراب خانہ

ساقی: شراب پلانے والا

فنی خوبی:

استعارہ،[محبوب کے لیے ساقی کا لفظ مستعار لیا گیا ہے۔]

تشریح:

اس شعر میں میر نے ایک واقعاتی نقشہ کھینچا ہے کہ کسی جگہ پر مسجد اور شراب خانہ آس پاس تھے۔ مگر خلقِ خدا کا یہ حال تھا کہ میخانے کے بجائے مسجد کا رخ کرتی تھی۔ مسجد آباد رہتی تھی اور میخانہ خراب و ویران تھا۔ پھر یہ ہوا کہ اس میخانے میں ایک ساقی آیا۔ اس ساقی کی نگاہ میں ایک عجیب تاثیر تھی، عجیب مستی تھی۔ اس نے جو آنے جانے والوں پر نظر ڈالی تو لوگ بغیر شراب ہی کے مخمور ہو گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اب معاملہ بالکل اُلٹ ہو گیا اور مسجد خالی ہو گئی اور میخانہ آباد ہو گیا۔ گویا میخانے کی ''توہین'' کا انتقام لے لیا گیا۔ بقول شاعر ؎

لوگ بڑھ بڑھ کر جام پیتے رہے
اور ہم ساقی کی آنکھوں کا مزہ لیتے رہے

میر فرماتے ہیں کہ بالکل اسی طرح ہمارے محبوب نے بھی لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لئے بناؤ سنگھار کیا اور لوگوں پر اپنے حسن کی بجلیاں گرائیں۔ نتیجتاً اس کے سحر انگیز حسن اور نشیلی آنکھوں کا جام پینے والے لوگوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ عابد تک رند بن گئے، مساجد ویران ہونے لگیں اور مست نگاہوں کی لوٹ مار سے کوئی بھی اپنا دامن نہ بچا سکا۔ ہمارے محبوب کی نگاہوں کا جام پینے والا کبھی ہوش کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

مماثل شعر:

ہزار جام تصدّق، ہزار میخانے
نگاہِ یار کی لذت شراب کیا جانے

JOIN FOR MORE!!!

شعر نمبر ۴:

وہ کج روش نہ ملا راستی میں مجھ سے کبھی — نہ سیدھی طرح سے اُن نے مرا اسلام لیا

حوالہ شاعر:

مندرجہ بالا شعر میر تقی میر کی ایک غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو خدائے سخن اور شہنشاہِ غزل کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

محبوب کی بد مزاجی اور طرزِ تغافل کا بیان۔

مشکل الفاظ:

کج روش: بد اخلاق

راستی: راستہ

تشریح:

میر اپنے محبوب کے تغافل کا ذکر کر رہے ہیں کہ جب کبھی راستے میں ہماری محبوب سے مڈ بھیڑ ہو جائے تو وہ تغافل کا خوگر ہمارے سلام

تک کا جواب نہیں دیتا۔ شاعر کہتا ہے کہ اے مرے محبوب! میں تری محبت میں ایک زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہا ہوں لیکن تجھ کو رحم و محبت کا واسطہ نہیں۔ تو نے بڑی بے رحمی سے میرے تڑپنے کا منظر دیکھا اور اب تو میں فراق کی صعوبتیں سہہ سہہ کر نڈھال ہو چکا ہوں۔ تیری ان جفا کاریوں کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہم تیری جدائی کا ناسور لئے اس جہانِ فانی سے کوچ کر جائیں گے اور تیرے پاس سوائے پچھتاوے کے کچھ نہیں ہو گا۔ اور لوگ تجھے ہماری موت کا سبب جانیں گے۔

مماثل شعر:

کون کہتا ہے ملاقات نہیں ہوتی
روز ملتے ہیں مگر بات نہیں ہوتی

شعر نمبر ۵:

مزا دکھاویں گے بے رحمی کا تیری صّیاد
گر اضطرابِ اسیری نے زیرِ دام لیا

حوالہ شاعر:

مندرجہ بالا شعر میر تقی میر کی ایک غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو خدائے سخن اور شہنشاہِ غزل کہا جاتا ہے۔

JOIN FOR MORE!!!

مرکزی خیال:

مظلوم ایک حد تک ظلم و ستم برداشت کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے افعال، حرکات و سکنات سے ظالم کے لئے پریشانی کا سبب بن جاتا ہے۔

مشکل الفاظ:

بے رحمی:	ظلم
صیاد:	شکاری
اضطراب:	تکلیف، مشکل
اسیری:	قید
زیر دام لینا:	قابو میں لینا

فنی خوبی:

استعارہ، [محبوب کیلئے لفظ صیاّد (شکاری) کا لفظ مستعار لیا گیا۔]

تشریح:

شاعر نے اس شعر میں تمثیلی اندازِ بیان اختیار کرتے ہوئے اپنے آپ کو ایک مظلوم اور بے کس پرندہ ظاہر کیا ہے جو شکاری کی قید میں ظلم و جبر کا نشانہ بن رہا ہے اور محبوب کیلئے لفظ صیاد مستعار لیا۔

شاعر اپنے محبوب سے ہم کلام ہو کر کہتا ہے کہ ہم تیری محبت کے پنجرے میں قید ہیں اور تو ہم پر مسلسل ستم ڈھا رہا ہے۔ وہ مخاطب کرتا ہے کہ اے صّیاد! تو نے ہم پر بہت ستم کر لئے اور ہم کو بہت جبر کا نشانہ بنا لیا۔ تو ایک بے رحم اور بے حس شخص ہے جو ہم پر نہایت بے دردی سے اپنے حربے آزما رہا ہے۔ شاید تجھ کو اس بات کا احساس نہیں کہ اگر ہماری مظلومیت اور تیرے تکلیف دہ افعال برداشت کی حد پار کر گئے تو ہم تجھ کو تیری اِن ظالمانہ حرکتوں کو خوب مزہ چکھائیں گے اور تجھ سے اپنی بے کسی کا بدلہ لیں گے۔ اگرچہ ہم قید ہیں لیکن ہم کو صیاد سے بدلہ لینا آتا ہے۔ ہم خود ہی اپنے جسم سے روح کو علٰحدہ کر دیں گے اور تجھ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بے چینی، بے قراری اور اضطراب کے بھنور میں پھنسا جائیں

گے۔ تو ہم کو یاد کر کر کے اپنے دل کو تڑپائے گا اور تا موت خلش اور اذیت سے دوچار رہے گا۔ اِس لئے ہم کہتے ہیں کہ ہم پر ظلم و ستم اتنا کر جتنا تو برداشت کر سکے، ورنہ اِس کا انجام دونوں کے حق میں بہت برا ہو گا۔

اس شعر میں شاعر نے ایک خوبصورت حقیقت بیان کی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ محبوب جب اپنے چاہنے والے کا بہت کرخت اور مشکل امتحان لیتا ہے تو وہ امتحان میں کامیاب نہیں ہوتا اور محبوب سے دور ہو جاتا ہے۔ آخر کار محبوب اس کی یاد میں ہمیشہ بے قرار اور مضطرب رہتا ہے۔

مماثل شعر:

آئے ہے بے کسیِ عشق پہ رونا، غالبؔ!
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد؟

شعر نمبر۶:

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

حوالہء شاعر:

مندرجہ بالا شعر میر تقی میر کی ایک غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو خدائے سخن اور شہنشاہِ غزل کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

شاعر کا فلسفہء محبت۔

تشریح:

عشق میں رنج و غم، حسرت و یاس، ناکامیوں اور محرومیوں سے سابقہ رہتا ہے۔ عاشق ابتداء میں صبر و ضبط سے کام لیتا ہے لیکن بالآخر صبر و تحمل کھو بیٹھتا ہے، دیوانہ ہو جاتا ہے، شائستگی جاتی رہتی ہے، ایسی حرکتیں کرنے لگتا ہے جس سے محبوب بدنام ہو جائے۔

شاعر کہتا ہے کہ میں نے اس کے برعکس بڑے سلیقے اور شائستگی سے عاشقی میں زندگی بسر کر دی۔ محبوب کے ظلم و ستم کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ اس راہ کی ناکامیوں اور محرومیوں سے واسطہ رہا مگر اس کا اظہار نہیں ہونے دیا اور نہایت شائستہ اور مہذب انداز میں زندگی گزار دی کہ نہ تو محبت بدنام ہوئی نہ ترکِ محبت کا خیال دامن گیر ہوا۔

مماثل شعر:

اک طرزِ تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

خواجہ حیدر علی آتشؔ

تعارف شاعر:

دبستان لکھنؤ کے نمائندہ شاعر خواجہ حیدر علی آتش کا کلام حسن کلام کی ایک خوبصورت مثال ہے۔ لفظوں کا انتخاب، ترکیبوں کا امتزاج، اور محاورے کا برمحل استعمال ان کے کلام کو اور زیادہ حسین بناتے ہیں۔ ان کی شاعری لکھنؤ دور کی شاعری کے تمام نقائص سے پاک ہے۔ خیالات بلند اور متنوع ہیں۔ ان میں سوز و گداز اور خلوص و صداقت پائی جاتی ہے۔

ان کے کلام میں تکلف اور بناوٹ کا اثر بہت کم ہے۔ وہ شاعری کو "مرصع ساز" کا کام سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان کا ہر لفظ موتیوں کی طرح شعروں میں جڑا نظر آتا ہے۔ انہی کے بقول ؎

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں شاعری بھی کام ہے آتشؔ مرصع ساز کا

غزل(۱)

شعر نمبر ا:

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے ہم اور بلبل بیتاب گفتگو کرتے

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر خواجہ حیدر علی آتش کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔ آپ کو دبستانِ لکھنؤ کا نمائندہ شاعر کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

اس شعر میں شاعر اپنے عشق کی شدت بیان کر رہے ہیں۔

JOIN FOR MORE!!!

مشکل الفاظ:

گل: پھول

روبرو: آمنے سامنے

بیتاب: بے چین

فنی خوبی:

مطلع

تشریح:

یہ ایک انتہائی لطیف شعر ہے جس میں شاعر نے بڑی خوبصورتی سے اپنے عشق کو بلبل کے عشق سے شدید تر اور اپنے محبوب کو گلاب سے زیادہ حسین قرار دیا ہے۔

M.HARIS www.studypak.xyz

اردو شاعری میں گل و بلبل کے حسن و عشق کی داستان مسلم ہے۔ گلاب خوبصورتی، خوشبو اور لطافت کا شاہکار ہے تو بلبل اس کے عشق میں دیوانہ ہے۔۔۔ شاعر کہتا ہے کہ میری آرزو جو کبھی پوری نہ ہو سکی مگر دل میں رہی، یہ تھی کہ میں کسی روز اپنے محبوب کے ساتھ چمن میں جاتا اور اپنے محبوب کو بلبل کے محبوب (گل) کے سامنے بٹھاتا اور خواہش کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ میں بلبل کے ساتھ بیٹھ کر گفتگو کرتا، یعنی ایک طرف دو حسین اور چاہے جانے والے ایک ساتھ ہوتے اور دوسری طرف دو عاشق مل کر بیٹھتے۔ ہر چاہنے والے کے نزدیک کا محبوب ساری دنیا سے خوبصورت ہوتا ہے چنانچہ بلبل کا بھی پھول کے بارے میں یہی خیال ہے۔ شاعر کا مقصود یہ ہے کہ لوگ خود جان جاتے کہ میرا محبوب، گل سے کہیں زیادہ حسین ہے اور میرے عشق میں بلبل کے عشق سے کہیں زیادہ تڑپ اور شعلگی ہے۔

مماثل شعر:

برابری کا تری گل نے جب خیال کیا
صبا نے مار تھپیڑا منھ اس کا لال کیا

شعر نمبر ۲:

پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا زبانِ غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر خواجہ حیدر علی آتش کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔ آپ کو دبستانِ لکھنؤ کا نمائندہ شاعر کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

اس شعر میں شاعر نے اپنے احساسات کو اپنے محبوب تک پہنچانے کے لئے کسی قاصد کے نہ ملنے کو بہتر گردانا ہے۔

مشکل الفاظ:

پیامبر: پیغام پہنچانے والا

شرح آرزو: اظہار خواہش

تشریح:

آتش اس شعر میں اپنے احساسات کو اپنے محبوب تک پہنچانے کے لئے کسی قاصد کے نہ ملنے کو بہتر گردانتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ مجھے کوئی پیامبر

نہ مل سکا جس کے ذریعے میں اپنے دل کی بات محبوب تک پہنچا سکوں جس کی وجہ سے میرے دل میں احساسات وجذبات کے طوفان برپا ہوئے اور وہیں دفن ہو کر رہ گئے، یعنی یہ عشق کی منازل طے کرنے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ تھی۔

مگر شاعر کہتا ہے کہ یہ بھی خوب ہوا کہ مجھے کوئی قاصد نہ مل سکا ورنہ کسی اور کی زبان کس طرح ہمارے دل کی صحیح ترجمانی کر سکتی۔ ہماری کیفیت واحساسات جنہیں ہم خود الفاظ کے پیرائے میں نہیں لاسکتے تو بھلا کوئی اور ان کا مفہوم کس طرح ادا کرتا۔ اس شعر میں گویا اولاً شاعر عشق کے ہاتھوں مجبور ہو کر دیوانہ وار پیغامبر تلاش کرتا ہے اور ناکامی کی صورت میں کہتا ہے کہ اس کے حق میں یہی بہتر ہوا۔

مماثل شعر:

قاصد نہیں یہ کام ترا، اپنی راہ لے
اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

شعر نمبر۳:

میری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ　　کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر خواجہ حیدر علی آتش کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔ آپ کو دبستانِ لکھنؤ کا نمائندہ شاعر کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

چاند اور سورج کی گردش کا سبب محبوب کی تلاش ہے۔

مشکل الفاظ:

مہ و مہر: چاند اور سورج

جستجو: تلاش

فنی خوبی:

حسن تعلیل، [چاند سورج کی گردش کی وجہ محبوب کی تلاش کو قرار دیا گیا۔]

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS BASIM
www.studyhard.xyz

تشریح:

اردو شاعری میں عشاق کی آوارگی اور دربدر کی ٹھوکروں کی داستان عام ہے۔بقول شاعر ؎

آوار گانِ عشق کا پوچھا جو میں نشان	مشتِ غبار لے کے صبا نے اڑادیا

اس شعر میں شاعر نے حسن تعلیل سے کام لیا ہے یعنی چاند اور سورج کی گردش کے اصل سبب کو پوشیدہ رکھ کر ان کی گردش کا سبب محبوب کی تلاش قرار دیا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ سورج اور چاند جورات دن گردش کرتے رہتے ہیں دراصل یہ میری طرح اپنے محبوب کی تلاش میں ہیں جیسا کہ میں اپنے محبوب کی جستجو میں ادھر ادھر مارامارا پھرتا ہوں بالکل اسی طرح یہ چاند اور سورج بھی کسی محبوب کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔گویاشاعر یہ بتاناچاہتا ہے کہ محبوب کا ملنا ایک انتہائی مشکل کام ہے اور عاشق ازل سے محبوب کے حصول کے لئے کوشاں ہیں۔

مماثل شعر:

چاند ستاروں سے کیاپوچھوں کب دن میرے پھرتے ہیں

وہ تو بے چارے خود ہیں بھکاری،ڈیرے ڈیرے پھرتے ہیں

شعر نمبر۴:

جو دیکھتے تری زنجیر زلف کا عالم	اسیر ہونے کی آزاد، جستجو کرتے

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر خواجہ حیدر علی آتش کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔آپ کو دبستانِ لکھنؤ کا نمائندہ شاعر کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

اس شعر میں شاعر اپنے محبوب کا حسن وجمال کی تعریف بیان کررہے ہیں۔

فنی خوبی:

- صنعت تضاد:[اسیر، آزاد]
- صنعت استعارہ:[زلف کے لئے زنجیر کالفظ استعمال کیا گیا۔]

مشکل الفاظ:

اسیر: قیدی

زلف: بال

تشریح:

کوئی آزاد انسان یہ نہیں چاہتا کہ اسے قید کیا جائے، مگر کچھ قیدیں ایسی ہوتی ہیں جن کے اسیر ہونے کی خواہش کی جاتی ہے۔اس شعر میں شاعر بھی ایک ایسی ہی قید کا ذکر کررہا ہے۔شاعر اپنے محبوب کے حسن وجمال کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اے میرے محبوب تو کتنا حسین وجمیل ہے اور یہ تیرے سیاہ وحسین بال کتنے پرکشش ہیں اور جب تو انھیں گوندلیتا ہے اور چوٹی سے ایک زنجیر سی بن جاتی ہے تو تیرے حسن پر جوبن آجاتا ہے اور ایسے عالم میں ہم جیسے تیرے اسیر تو ایک طرف، بے تعلق رہنے والے لوگ بھی تجھے دیکھ لیں تو وہ بھی تیری محبت میں مبتلا ہو جائیں اور تیری حسین زنجیرِ زلف کے اسیر ہونے کی آرزو کریں۔

شعر اگرچہ خارجیت کا ہے مگر اس میں بھی ایک اخلاقی پہلو یہ ضرور ہے کہ شاعر نے "جو دیکھتے" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔یعنی اگر دیکھ لیتے، گویا محبوب کا حسن بہرحال "حسن عام" نہیں ہے۔

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS BASIM
www.studyhelp.xyz

مماثل شعر:

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
سب اسی زلف کے اسیر ہوئے

غزل(۲)

شعر نمبرا:

ہوائے دور مئے خوشگوار راہ میں ہے   خزاں چمن سے ہے جاتی، بہار راہ میں ہے

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر خواجہ حیدر علی آتش کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔ آپ کو دبستانِ لکھنؤ کا نمائندہ شاعر کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

مصائب و تکالیف کا وقت ختم ہونے کو ہے۔

JOIN FOR MORE!!!

مشکل الفاظ:

دور: زمانہ
چمن: باغ

فنی خوبی:

- مطلع [غزل کا پہلا شعر]
- صنعت تضاد: [خزاں، بہار]

تشریح:

شاعر اس شعر میں پر امید انداز میں موجودہ مصائب و آلام کے ختم ہو جانے اور حسین مستقبل کی آمد کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ بس اب خزاں جانے والی ہے۔ یعنی مصائب و تکالیف کا یہ دور ختم ہونے والا ہے اور بہار کی آمد آمد ہے اور موسم بہار کی وہ ہوائیں بس چلا ہی چاہتی ہیں جن میں شراب جیسی مستی ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عیش و عشرت اور سکون و راحت کا دور شروع ہونے والا ہے۔

شاعر پیغام امید دیتا ہے، ہر دکھی انسان کو، ہر حالات کے مارے ہوئے شخص کو وہ امید کی طرف لاتا ہے کیونکہ امید ہی زندگی ہے، شاید اسی لئے کہا گیا ہے کہ **"مایوسی گناہ ہے"** اور لاتقنطوا کے الفاظ قرآن کا حصہ ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ وہ وقت دور نہیں کہ جب ہر غم مٹ جائے گا اور خوشیاں دل کے دروازے پر دستک دے رہی ہوں گی۔ بس امید رکھتے ہوئے اپنے فرض اور عمل سے غافل نہیں ہونا چاہئے۔

مماثل شعر:

وقت اچھا بھی آئے گا ناصرؔ
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

شعر نمبر۲:

عدم کے کوچ کی لازم ہے فکر ہستی میں   نہ کوئی شہر، نہ کوئی دیار راہ میں ہے

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر خواجہ حیدر علی آتش کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔ آپ کو دبستانِ لکھنؤ کا نمائندہ شاعر کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

انسان کو آخرت کی تیاری کی فکر کرنی چاہئے۔

مشکل الفاظ:

دیار: ملک

کوچ: روانگی

تشریح:

شاعر اس شعر میں انسان کو سفر آخرت کے لئے زادِ راہ تیار کرنے کو کہتا ہے کیونکہ جب انسان ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کرتا ہے تو راستے میں مصائب و تکالیف سے بچنے کے لئے سامان سفر تیار کر کے چلتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ انسان کو چاہئے کہ آخرت کے سفر کے لئے بھی سامان سفر تیار کر تا رہے کیونکہ انسان کو اس دنیا سے دوسری دنیا میں جانا ہے، راہ میں مصائب اور تکالیف کا سامنا ہے۔ راستہ سنسان و ویران ہے۔ درمیان میں نہ کوئی شہر ہے نہ کوئی ایسی آبادی کہ جہاں سے زادِ راہ حاصل کیا جاسکے لہٰذا جو کچھ لے کر جانا ہے اس کا انتظام یہیں سے کر کے چلنا ہو گا۔

مطلب یہ ہے کہ انسان کو اس دنیا میں ہی آخرت کے سفر کی فکر کرنی چاہئے اور نیک اعمال کی صورت میں زاد سفر تیار کرتے رہنا چاہئے۔ یہ سفر یوں بھی اہمیت رکھتا ہے کہ یہ ایک اندھا سفر ہے۔ دنیا میں ایک مقام سے دوسری جگہ جانے میں کئی سہولتیں تو راستے میں ہی مل جایا کرتی ہیں۔ مگر اس سفر میں کوئی شہر، کوئی ٹھکانہ، کوئی پڑاؤ راستے میں نہیں ہے۔ عقل مندی یہی ہے کہ موت سے پہلے موت کی تیاری رکھی جائے۔

مماثل شعر:

کر لے جو کرنا ہے، آخر موت ہے
ایک دن مرنا ہے، آخر موت ہے

شعر نمبر۳:

سمند عمر کو اللہ رے شوق آسائش عناں گستہ و بے اختیار راہ میں ہے

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر خواجہ حیدر علی آتش کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔ آپ کو دبستانِ لکھنؤ کا نمائندہ شاعر کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

انسان کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔

مشکل الفاظ:

سمند: بادامی رنگ کا گھوڑا

سمند عمر: عمر کا تیز گھوڑا

عناں گستہ: بے لگام

بے اختیار: بے قابو

فنی خوبی:

صنعت استعارہ: [انسان کی عمر کا ایک خوبصورت گھوڑے سے استعارہ لیا گیا ہے۔]

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS www.studypan.xyz

تشریح:

شاعر نے اس شعر میں صفت استعارہ سے کام لیا ہے۔ اس نے عمر کو ایک خوبصورت گھوڑے سے تشبیہ دی ہے۔ بادامی رنگ کا یہ خوبصورت گھوڑا

جس کی ٹانگیں اور گردن کالی ہوتی ہے، اپنے اندر ایک کیفیت دل کشی اور رعنائی کی رکھتا ہے۔ سونے پہ سہاگہ یہ کہ اس کا سوار اسے حسین تر بنانے کا شوق رکھتا ہے۔ وہ اسے سجاتا ہے، اس کی آرائش کرتا ہے، اس پر اپنی صلاحیتیں اور توانائیاں صرف کرتا ہے۔ لیکن گھوڑے کا حال یہ ہے کہ اس کی لگام ٹوٹی ہوئی ہے جس کی وجہ سے سوار کا اس پر کوئی اختیار نہیں ہے کیونکہ سوار کو اختیار تو لگام سے ہی ملتا ہے۔ چنانچہ گھوڑا جہاں چاہے رکے، جہاں چاہے رفتار کم زیادہ کرے، جہاں کا چاہے رخ کرے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر، جہاں اس کا جی چاہے گا وہ سوار کو پٹخ کر آگے بڑھ جائے گا۔

انسان کی زندگی یا عمر کا بھی بالکل یہی حال ہے۔ یہ دل کش ہے اور انسان اسے خوبصورت تر بنانے کے لئے کیا کیا جتن نہیں کرتا، اپنی ساری صلاحیتیں اس کے لئے جھونک دیتا ہے۔ جب کہ اس زندگی پر اسے کسی طرح کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ موت کا ہرکارہ آتا ہے اور انسان کا سب کچھ دھرا رہ جاتا ہے۔

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں　　　سامان سو برس کا، پل کی خبر نہیں

انسان کی نادانی یہی ہے کہ ایک چیز پر اس کا کوئی اختیار نہیں ہے اور وہ اس کے پیچھے دیوانگی سے لگا ہوا ہے۔ شاعر کو اس پر حیرت ہے اسی لئے حیرت کے مارے اس نے **"اللہ رے"** کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

شعر نمبر۴:

نہ بدرقہ ہے، نہ کوئی رفیق ساتھ اپنے　　　فقط عنایت پروردگار راہ میں ہے

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر خواجہ حیدر علی آتش کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔ آپ کو دبستانِ لکھنؤ کا نمائندہ شاعر کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

سفر آخرت میں اللہ کی رحمت کے سوا کوئی ہم سفر نہیں۔

مشکل الفاظ:

بدرقہ:	رہنما
رفیق:	دوست / ساتھی

تشریح:

اس شعر میں شاعر دنیا سے آخرت کی طرف سفر کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جب انسان دنیا سے آخرت کی طرف کوچ کرتا ہے تو اس کا تمام مال و اسباب اور دولت جائیداد سب یہیں رہ جاتا ہے اور اس کے عزیز و اقارب اور دوست احباب بھی صرف قبرستان تک اس کے ساتھ رہتے ہیں۔ گویا کہ یہ سفر انسان کو تنہا طے کرنا ہے اور اس سفر میں نہ اس کا کوئی ساتھی ہے اور نہ ہی کوئی رہبر۔ ایسے میں یہ طویل اور پر خطر سفر صرف اور صرف اللہ کی رحمت سے ہی طے کیا جا سکتا ہے۔ لہذا سفر آخرت میں انسان کو اللہ کی رحمت کا حصول ہی ممکن ہے۔

مقصد یہ ہے کہ انسان کو سفر آخرت کے لئے اللہ کی رحمت کا حصول یقینی بنانا چاہئے اور اس کے لئے نیک اعمال کرنا چاہئے۔

مماثل شعر:

دبا کے چل دیے سب قبر میں دعا نہ سلام　　　ذرا سی دیر میں کیا ہو گیا زمانے کو

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS BASIM www.studypak.xyz

شعر نمبر۵:

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

حوالہ شاعر:

پیشِ نظر شعر خواجہ حیدر علی آتش کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔ آپ کو دبستانِ لکھنؤ کا نمائندہ شاعر کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

انسان کو حوصلہ اور بہادری سے منزل کے حصول کے لئے سفر اور جدوجہد کا آغاز کرنا چاہئے۔

مشکل الفاظ:

مسافر نواز:	مسافروں کی مدد کرنے والے
شجر سایہ دار:	سایہ دار درخت
بہتیرے:	بہت زیادہ

تشریح:

JOIN FOR MORE!!!

اس شعر میں آتش نے حوصلہ مندی اور عزم و عمل کا درس دیا ہے۔ قدیم زمانے میں جب لوگ پیدل سفر کیا کرتے تھے تو دوران سفر آنے والے سایہ دار درخت ان کے لئے رحمت خداوندی اور تسکین کا سبب ہوتے تھے۔ شاعر کہتا ہے کہ انسان کو حوصلہ اور بہادری سے منزل کے حصول کے لئے سفر اور جدوجہد کا آغاز کرنا چاہئے۔ تکالیف اور مصائب کے خوف سے بیٹھے نہیں رہنا چاہئے کیونکہ جب انسان عزم و حوصلہ سے کسی جدوجہد کا آغاز کرتا ہے تو عام مصائب و مشکلات پر قابو پاتا چلا جاتا ہے اور جس طرح مسافر راہ کی دشواریوں کو نظر انداز کر کے سفر شروع کرتا ہے اور سایہ دار درختوں کی صورت میں اس کو آسانیاں میسر آتی ہیں بالکل اسی طرح کسی منزل کے حصول کے لئے جدوجہد کرنے والوں کو بھی ہمدرد اور مہربان لوگ مل جاتے ہیں۔ ورنہ اللہ کی رحمت تو سایہ فگن ہوتی ہی ہے۔

لہذا راہ میں مشکلات اور تکالیف کو نظر انداز کرتے ہوئے منزل کے حصول کے لئے عزم و حوصلہ سے جدوجہد کا آغاز ضروری ہے۔

M.HARIS www.....xyz

مماثل شعر:

اٹھ باندھ کمر کیوں ڈرتا ہے
پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے

☆......☆......☆

مرزا اسد اللہ خان غالب

تعارفِ شاعر:

مرزا اسد اللہ خان دنیائے سخن میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں جن کا فن رسوم کی حدود و قیود سے بالاتر ہے۔ آپ کے کلام میں ہر رنگ کا موضوع ملتا ہے جو اردو شاعری کے اعلی ترین مقام کا عکاس ہے۔ آپ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ آپ کے دیوان کو ہندوستان کی الہامی کتاب قرار دیا گیا۔

"دورِ مغلیہ نے ہندوستان کو تین چیزون عطا کیں۔ اردو زبان، تاج محل اور مرزا غالب"۔**(رشید احمد صدیقی)**

شعر نمبر ۱:

کوئی امید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی

حوالہ شاعر:

مندرجہ بالا شعر مرزا اسد اللہ خان غالب کی ایک غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو اردو کا پہلا فلسفی شاعر کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

اس شعر میں غالب اپنے حالات سے مایوسی کا اظہار کر رہے ہیں۔

مشکل الفاظ:

بر آنا: پورا ہونا

صورت: شکل

فنی خوبی:

مطلع، [غزل کا پہلا شعر]

تشریح:

زیرِ نظر شعر غالب کے کلام کا ایک حصہ ہے۔ آپ اس میں کہتے ہیں کہ ہماری زندگی کا بحر کبھی پُر سکون نہیں رہا بلکہ اس میں ہر لمحہ کوئی نہ کوئی مقناطیسی لہر طوفان برپا کر دیتی ہے۔ غمِ دوراں نے ہماری زندگی اجیرن کر دی ہے۔ ہماری کوئی دعا کوئی تمنا پوری نہیں ہوتی۔ ہماری امید میں صرف خواب ہیں جن کی کوئی تعبیر نہیں۔ ہ ہمیں اس تاریکی میں اپنی سانسیں ڈوبتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ لیکن ہمیں اس اندھیرے سے نکالنے والا کوئی نہیں اور کوئی مشعل نہیں۔ یہ زندگی ایک پر خار راہ ہے اور ہمیں یہ کٹھن راہ کسی منزل تک جاتی ہوئی نظر نہیں آتی۔

اصل میں شاعر یہاں پر بتانا چاہ رہے ہیں کہ انسان کی زندگی خواہشات اور آرزوؤں سے معمور ہے اور نامرادی عشق کا مقدر رہے۔

غالب اب عشق کی اُس منزل تک پہنچ چکے ہیں جہاں سے واپسی ممکن نہیں۔ لیکن تمنائے عشق کی تکمیل کی صورت بھی نظر نہیں آتی۔ اُمیدیں دم توڑ دیتی ہیں۔ جینے کی ہر راہ مفقود ہو چکی ہے۔ لیکن حصولِ محبوب ناممکن ہو گیا ہے یعنی عشق میں ہم ناکام اور محروم تمنا ہو کر رہ گئے ہیں۔

مماثل شعر:

کوئی اُمید بر آئی نہ ارماں نکلا

زندگی بھر کسی کنجوس کا داماں نکلا

شعر نمبر ۲:

موت کا ایک دن معیّن ہے پھر نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

حوالہ شاعر:

مندرجہ بالا شعر مرزا اسد اللہ خان غالب کی ایک غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو اردو کا پہلا فلسفی شاعر کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

اس شعر میں شاعر نے انسانی فطرت کی ایک کمزوری کا تذکرہ کیا ہے کہ انسان موت سے خوف زدہ رہتا ہے۔

مشکل الفاظ:

معیّن: مقرر

تشریح:

پیشِ نظر شعر میں شاعر نے یہ حقیقتِ حال بیان کی ہے کہ موت اٹل ہے اور ہر انسان کو آنی ہے۔ ہر انسان ایک نہ ایک دن قبر کی گود میں سلا دیا جائے گا۔ شاعر کہتا ہے کہ جب انسان کو پتہ ہے کہ اس کی موت کا وقت مقرر ہے اور وہ ایک دن ایک مقررہ وقت پر ہی اس زندگی سے محروم کیا جائے گا تو وہ کس چیز کا خوف کھاتا ہے۔ اسے کیوں اس زندگی سے اتنا پیار ہے اور وہ کیوں موت سے بھاگتا ہے اور اس فکر میں پریشان ہوتا کہ کہیں ابھی اس کی زندگی ختم نہ ہو جائے۔ شاعر کہتا ہے کہ جب کسی حقیقت پر پختہ یقین ہو جائے تو اسے تسلیم کر کے اپنی باقی مصروفیات پر عمل کرنا چاہیئے بجائے اس کے کہ اس اٹل حقیقت جو کہ ناقابلِ ترمیم ہے کو بدلنے کی فکر کی جائے۔ اس شعر میں انسانی فطرت کی کمزوری بیان کی گئی ہے۔

مماثل شعر:

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی، غم سے نجات پائے کیوں

JOIN FOR MORE!!!

شعر نمبر ۳:

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

حوالۂ شاعر:

مندرجہ بالا شعر مرزا اسد اللہ خان غالب کی ایک غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو اردو کا پہلا فلسفی شاعر کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

اس شعر میں غالب اپنے دل کے مرجھانے کا تذکرہ کر رہے ہیں۔

تشریح:

اس شعر میں غالب کہتے ہیں کہ تقدیر نے ہمیں اس زندگی میں اتنی ضربات لگائی ہیں کہ ہم لہولہان ہو گئے ہیں۔ ہم کبھی تو اپنی خرابیٔ قسمت کا شکوہ کرتے ہیں اور کبھی آپ ہی اپنی تقدیر کی کم ظرفی پر مسکرا دیے، پہلے کبھی ہمیں اپنے حال پر آپ ہی ہنسی آجایا کرتی تھی کہ غمِ دوراں سے نڈھال ہوئے بیٹھے ہیں اور ہم اپنے آپ کا ہی تمسخر اُڑایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ہم اپنی بے بسی سے محظوظ ہوا کرتے تھے لیکن اب مقدر کی بے رحمی حد سے تجاوز کر گئی ہے۔ اس نے ہمیں غمِ جاناں دے کر ہم سے وہ مسکراہٹ بھی چھین لی جو اپنے حال کو دیکھ کر ہی ہمارے لبوں پر آجاتی تھی۔ یہ شعر سادگی و سلاست کے اعتبار سے لاجواب ہے۔ غالب فرماتے ہیں کہ عشق میں آدمی بدحواس اور بدحال ہو جاتا ہے کیونکہ رنج و غم اس کی زندگی کا جز بن جاتا ہے۔ ابتدائے عشق میں جب عشق کا غلبہ بڑھتا ہے۔ محبوب نے ابتداء اور آزمائش میں مبتلا کر دیا تو حالت دگرگوں ہو جاتی۔ اس وقت اپنی یہ حالت دیکھ کر خود اپنے ہی حال پر ہنسی آجاتی۔ لیکن اب عادت سی ہو گئی ہے۔ افسردگی اور پژمردگی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ کسی بات پر ہنسی نہیں آتی۔

مماثل شعر:

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہؔ
ہے آگ سی جو سینے کے اندر لگی ہوئی

شعر نمبر۴:

جانتا ہوں ثوابِ طاعت وزُہد پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

حوالہ شاعر:

مندرجہ بالا شعر مرزا اسد اللہ خان غالب کی ایک غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو اردو کا پہلا فلسفی شاعر کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

پیشِ نظر شعر میں شاعر اپنی دین کی طرف سے بے رغبتی اور اس دنیا کی طرف کشش بیان کر رہے ہیں۔

مشکل الفاظ:

طاعت: فرمانبرداری

زہد: عبادت

تشریح:

شاعر کہتا ہے کہ ہم ایک صاحبِ شعور انسان ہیں اور ہم میں عقل و فہم موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں علم و حکمت کی دولت سے نوازا ہے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ کے دین کا علم حاصل ہے۔ ہم اسلامی تعلیمات سے مکمل آگہی رکھتے ہیں۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کو کتنی اہمیت حاصل ہے اور تقویٰ و پرہیزگاری کا کیا صلہ ملے گا۔ اللہ تعالیٰ کے احکامات کی پابندی کرنے سے ہماری دنیوی و اخروی زندگی سنور جائے گی۔ ہمیں یہ بھی خبر ہے کہ کس نیکی کا کیا اجر ملے گا اور ان کے کیا ثمرات ہوں گے لیکن ہم کیا کریں کہ عبادت اور دین کی طرف ہماری طبعیت مائل نہیں ہوتی۔ ہم نمازوں اور روزوں کی پابندی نہیں کرتے، ہم اللہ تعالیٰ کے احکامات بجا نہیں لاتے، ہم دنیا کی دلکش و حسین رنگینیوں میں گم ہو گئے ہیں۔ ہمارے دل کو اس دنیا کی دلکشیوں نے اپنی طرف مائل کر لیا ہے اور ہم اب اس سے منہ پھیرنے کے لئے تیار نہیں۔ ہم اب صرف وہی کرتے ہیں جو ہمارا دل ہم سے کہتا ہے۔

(۲)۔ شعر کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں عبادت اسلئے نہیں کرتا کہ اس کے بدلے میں مجھے ثواب ملے گا۔ وہ عبادت ہی کیا جو ثواب کے بدلے کی جائے۔ یہ عبادت نہیں مبادلہ ہے۔ عبادت تو اللہ تعالیٰ کی محبت میں کی جانے چاہئے اور اس کے عوض کسی چیز کی تمنا نہ کرنی چاہئے اور چونکہ ایسا ممکن نہیں اسلئے میں عبادت نہیں کرتا۔

مماثل شعر:

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر! جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

شعر نمبر۵:

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چُپ ہو ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

حوالہ شاعر:

مندرجہ بالا شعر مرزا اسد اللہ خان غالب کی ایک غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو اردو کا پہلا فلسفی شاعر کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

اس شعر میں غالب اپنی خاموش طبعی کا ذکر کر رہے ہیں۔

تشریح:

شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ عاشق اپنے محبوب کے سامنے زیادہ تر خاموش دو وجوہات ہی کی بناء پر ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ محبوب کے حسن کے جلووٴں کا اُس کے دل پر اس قدر ہجوم ہوتا ہے کہ وہ ساکت وصامت جلوہٴ محبوب میں گم ہو جاتا ہے یا دوسری وجہ یہ ہے کہ مصلحتاً خاموش رہتا ہے کہ کہیں محبوب کی رسوائی نہ ہو یا اُس کے راز فشاں نہ ہو جائیں اور پھر محبوب عاشق سے ناراض ہو جائے۔

غالب کہتے ہیں کہ ہم بھی اپنے محبوب کے تصور میں اس قدر مدہوش ہیں کہ دنیا و مافیہا ہی سے بے خبر ہو گئے ہیں۔ ورنہ ہمیں بھی اندازِ بیاں پر قدرت حاصل ہے اور ہم بھی اظہارِ جذبات پر قادر ہیں۔ مگر بولتے اس لئے نہیں کہ کہیں اظہارِ محبت اور حالِ دل سن کر ہمارا محبوب خفا نہ ہو جائے یا ہمارے دل کی تحریر پر اپنا نام لکھا دیکھ کر اُس کے مزاجِ نازک پر گراں نہ گزر جائے۔ خاموشی کے پردے میں ہم بھی اپنے عشق کی معراج چاہتے ہیں۔ ہمیں ہر بات کرنا آتی ہے لیکن ہر بات کا اظہار کرنا عقلمندی نہیں ہوتی۔ منزلِ عشق کا حصول ہی وہ مصلحت ہے جس کی خاطر ہم چُپ چاپ ہیں۔

شعر نمبر۶:

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی

JOIN FOR MORE!!!

حوالہ شاعر:

مندرجہ بالا شعر مرزا اسد اللہ خان غالب کی ایک غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو اردو کا پہلا فلسفی شاعر کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

اس شعر میں غالب اپنے عالمِ بے خودی کا ذکر کر رہے ہیں۔

تشریح:

عشق میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے کہ جب آدمی فنا فی المحبوب ہو جاتا ہے۔ ہمہ وقت محبوب کے خیال اور تصور میں ڈوبا رہتا ہے۔ اس کا وجود محبوب کے وجود میں مدغم ہو جاتا ہے۔ غالب بھی اس شعر میں یہی کہہ رہے ہیں کہ ہم عشق کی بھول بھلیوں مین اس طرح کھو گئے ہیں کہ اس سے نکلنے کی کوئی راہ نظر نہیں آتی۔ جس راہ پر نکلتے ہیں وہ راہ اسی طرح ہمیں دھوکہ دے رہی ہے جس طرح خضر نے سکندر سے فریب کاری کی تھی۔ ہم راہِ عشق میں اُلجھے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن پھر بھی محبوب کی یاد کو دل سے نکالنا نہیں چاہتے۔ کیونکہ ہم نے اس کے عشق کے مے پی ہیں۔ اور اس کی آنکھوں کے شباب نے ہمیں پُر کیف کر دیا ہے۔ ہم مدہوشی کی حالت میں دنیا و مافیہا سے بے خبر اس پتھر کے صنم کی پرستش کئے چلے جا رہے ہیں۔ ہم اپنی منزل کی تلاش میں سرگرداں ہیں لیکن منزل حدِ نظر تک نہیں، بس ہم اسکی یاد کے سہارے اس کے نقش پر چلتے ہی چلے جا رہے ہیں۔

مماثل شعر:

بے خودی کہاں لے گئی ہم کو
بہت دیر سے انتظار ہے اپنا

شعر نمبر۷:

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی موت آتی ہے، پر نہیں آتی

حوالہ شاعر:

مندرجہ بالا شعر مرزا اسد اللہ خان غالب کی ایک غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو اردو کا پہلا فلسفی شاعر کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

زندگی کے ہموم و غموم کا ذکر۔ موت کی تمنا کرتے ہیں مگر موت نہیں آتی۔

تشریح:

جب مصائب کو ہجوم ہو، ناکامیوں اور محرومیوں سے رات بھر سابقہ رہے، کوئی تدبیر کارگر نہ ہو، معمولی معمولی خواہشات اور آرزوؤں کا خون ہونے لگے تو پھر آدمی زندگی سے بدظن ہو جاتا ہے اور موت کی آرزو کرنے لگتا ہے۔ لیکن موت پر چونکہ اختیار نہیں ہوتا اس لئے آدمی عجیب کشمکش میں مبتلا رہتا ہے۔

غالب یہی چیز سامنے رکھ کر کہتے ہیں کہ ہماری قسمت میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کے علاوہ کچھ تحریر نہیں۔ ہم نے گردشِ زمانہ کے ہاتھوں بڑے زخم کھائے ہوئے ہیں۔ رنج و الم کی آندھیوں کے درمیان معلق ہیں۔ اور ان آندھیوں کی تنگ مزاجی نے ہماری روح کو کچل کے رکھ دیا ہے۔ ہم موت کی آرزو کرتے ہیں اور مر مر کر موت طلب کرتے ہیں لیکن بدنصیبی کی انتہاء یہ ہے کہ موت بھی ہم تک نہیں پہنچ پاتی۔ ہماری زندگی کی آج تک کوئی خواہش پوری نہیں ہوئی اور اب موت کی آرزو بھی پوری نہیں ہوتی۔ اور غمِ زمانہ سے ہم روز مر کر زندہ ہوتے ہیں۔

مماثل شعر:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

JOIN FOR MORE!!!

شعر نمبر ۸:

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

حوالۂ شاعر:

مندرجہ بالا شعر مرزا اسد اللہ خان غالب کی ایک غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو اردو کا پہلا فلسفی شاعر کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

اس شعر میں غالب اپنی زندگی پر بڑی ہی لطیف انداز میں تبصرہ کر رہے ہیں۔

تشریح:

شاعر کہتا ہے کہ آدمی عمر کی آخری منزل میں قدم رکھتا ہے تو پھر اسے آنے والی نئی زندگی کا خیال دامن گیر ہوتا ہے اور وہ اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اے غالب! تم نے خانہ کعبہ کی زیارت کا ارادہ کیا ہے جبکہ تمہارا دامن معصیت اور گناہوں سے بھرا ہوا ہے۔ تم نے ساری زندگی شاہد پرستی، شراب خوری اور قمار بازی میں گزار دی۔ اب تمہیں ایسی گناہ آلود زندگی کے ساتھ اللہ کے دربار میں حاضر ہوتے ہوئی شرم نہیں آئے گی؟ تمہارے پاس کون سا عمل ایسا ہے جس کو لے کر تم وہاں جاؤ گے اور اُس کر کرم طلب کرو گے؟ مطلب یہ کہ ہماری زندگی میں سوائے گناہوں کے اور کچھ نہیں ہے۔ اب آخری وقت میں خدا کے حضور کیا منہ لے کر جائیں گے؟

مماثل شعر:

رحمت نے مرا جذبۂ اخلاص دیکھ کر
سارے گناہ کر دیے شامل ثواب میں

غزل(۲)

شعر نمبر ا:

سب کہاں، کچھ لالہ وگُل میں نُمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

حوالۂ شاعر:

مندرجہ بالا شعر مرزا اسد اللہ خان غالب کی ایک غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو اردو کا پہلا فلسفی شاعر کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

ازل سے آج تک طرح طرح کی خوبیاں رکھنے والے اور بے شمار حسین لوگ مرنے کے بعد مٹی میں مل گئے۔ مگر ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنے کارناموں کی بدولت لالہ وگُل بن کر اپنی بہارِ حسن دکھا رہے ہیں۔

مشکل الفاظ:

لالہ وگل:	پھول
پنہاں:	چھپنا

فنی خوبی:

مطلع، [غزل کا پہلا شعر]

حسن تعلیل، [شاعر نے پھولوں کے کھلنے کا سبب خوبصورت لوگ بتائے ہیں۔]

تشریح:

یہ شعر مرزا غالب ندرت خیال اور تأسف کا ایک خوبصورت اور انوکھا نمونہ ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ یہ بات مسلمہ ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ کوئی اس دنیا میں نہیں آتا۔ لیکن حسن کا جوشِ نمو اور شوقِ نمائش ایک ایسی چیز ہے کہ جو حسن کو دوبارہ وجود میں لاتا ہے۔ اور سے لالہ وگُل کی شکل دے کر ایک دفعہ پھر اہلِ نظر کے لئے سامانِ تسکین مہیا کرتا ہے۔ اسی لئے یہ جو ہمیں حسین و جمیل اور خوبصورت پھول نظر آتے ہیں یہ دراصل ان حسینوں کی خاک سے حسن لے کر نمود پاتے ہیں۔ گویا کہ پھولوں کا تمام حسن، خاک تلے دبے حسینوں کے حسن کا مظہر ہے اور پھر یہ پھول تو صرف چند ایک حسینوں کے حسن کا اظہار ہیں، نہ جانے کتنے او حسین و جمیل تہ خاک ہوں گے۔ یہ صورتِ حال تمام اہلِ حسن کے لئے ہے جو کہ زندگی کے اسٹیج پر اپنا اپنا کردار ادا کر کے واپس چل دیے اور دوبارہ اس خاک میں مل گئے۔

اس شعر میں ندرت خیال تو یہ ہے کہ شاعر کی نظر جب لالہ وگل پر پڑتی ہے تو وہ عام لوگوں کی سوچ کی طرح ان کی رعنائی میں نہیں الجھتی، بلکہ فوراً اس کی سوچ ان حسینوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے جو زمین میں جا چکے ہیں۔ شاعر نے تأسف اس امر پر کیا ہے کہ نہ جانے کتنے حسینوں کو فنا نے تہہ بہ خاک کر دیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ دنیا کی بے ثباتی کا حکیمانہ نکتہ پیدا کیا ہے۔

مماثل شعر:

خاک میں مل کے یہ اندازِ نمائش توبہ
لالہ وگل میں نظر آتے ہیں چہرے کیا کیا

شعر نمبر ۲:

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
اب مگر نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

حوالۂ شاعر:

مندرجہ بالا شعر مرزا اسد اللہ خان غالب کی ایک غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو اردو کا پہلا فلسفی شاعر کہا جاتا ہے۔

JOIN FOR MORE!!!

مرکزی خیال:

اس شعر میں غالب اپنے ماضی کی فراموشی کا تذکرہ کر رہا ہے۔

مشکل الفاظ:

بزم آرائی:	محفل سجانا
رنگارنگ:	رنگ برنگی
نقش و نگار:	ڈیزائن
طاق نسیاں ہونا:	بھول جانا(محاورہ)
نسیاں:	بھول

تشریح:

اس شعر میں غالب کہتے ہیں کہ جب ہمیں غمِ جاناں کا سامنا نہ تھا تو اُس وقت زندگی بڑی حسین و دلکش تھی، صبر و فکر سے پاک تھی اور ہر لحاظ سے مثالی زندگی تھی۔ وہ زمانے بھی ہمیں یاد ہیں جب ہم جانِ محفل ہوا کرتے تھے۔ جب زندگی کا لطف دوبالا ہوا کرتا تھا لیکن جب سے گردشِ زمانہ نے عشق کے مرض میں مبتلا کیا ہے اس وقت سے زندگی کی وہ رنگینی باقی نہیں رہی اور صرف دل کے صنم خانے میں اپنے محبوب کا خوبصورت مجسمہ رکھے اسی کی پرستش کئے جا رہے ہیں۔ محبوب کے عشق نے وہ بے خودی کا عالم کر دیا ہے کہ اس کے سوا کچھ یاد ہی نہیں۔ نہ وہ غافل نہ وہ دوست احباب، پر دنیاوی شہرت اور ہر رشتے کو بھول کر ہم اسی کی زلف کے سائے تلے زندگی بتانا چاہتے ہیں۔ اب تو مئے عشق نے اس قابل بھی نہیں چھوڑا کہ اس حسین زندگی کے دھندلکی میں تیری شبیہ بھی ذہن میں رکھ سکوں۔ اس لئے کہ مدہوشی نے ماضی کے ہر عکس کو مٹا دیا ہے۔

(۲)۔۔ شعر کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے جس کی طرف پہلے مصرعے کا لفظ "بھی" اشارہ کر رہا ہے کہ جوانی میں ہم نے بھی خوب عیش و عشرت سے کام لیا مگر اب جبکہ پیری کا زمانہ شروع ہو چکا ہے تو ہمارا حال یہ ہے کہ ان محفلوں کا انعقاد تو دور کی بات، ہمیں تو ان کی یاد بھی نہیں رہی اور ہم انھیں بالکل بھول چکے ہیں۔ اگر یہ مطلب لیا جائے تو غالب کا یہ شعر سامانِ عبرت ہو گا جس میں وہ نوجوانوں کو مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں کہ ہم نے بھی تمہاری طرح عہدِ شباب میں خوب عیش و عشرت کی محفلیں سجائیں لیکن عہدِ پیری میں ہماری ناتوانی کا یہ عالم ہے کہ ہمیں ان محفلوں کی یاد بھی نہیں۔ تمہیں ہماری حالت سے عبرت حاصل کرنی چاہئے کہ عمر کا بے لگام گھوڑا سرپٹ دوڑے جا رہا ہے۔

مماثل شعر:

ایسا الجھا ہوں غمِ دنیا میں
ایک بھی خوابِ طرب یاد نہیں

شعر نمبر ۳:

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زُلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

حوالۂ شاعر:

مندرجہ بالا شعر مرزا اسد اللہ خان غالب کی ایک غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو اردو کا پہلا فلسفی شاعر کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

عام عادت کے برعکس زلیخا کا اپنے رقیبوں سے خوش ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔

JOIN FOR MORE!!!

مشکل الفاظ:

رقیب: دشمن

ناخوش: ناراض

زنان: زن کی جمع یعنی عورت

محو: مگن ہونا

ماہ: چاند

کنعاں: شام کا صوبہ فلسطین (جہاں حضرت یوسف علیہ السلام پیدا ہوئے)

فنی خوبی:

صفت تلمیح

تشریح:

زیر نظر شعر اُس واقعے کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے احسن القصص سے تعبیر کیا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام بہت حسین و خوبصورت تھے۔ انھیں اُن کے بھائیوں نے حسن کی وجہ سے کنویں میں گرا دیا تھا۔ بعد میں قافلے والوں کے ہاتھوں فروخت ہوئے۔ عزیز نے اپنی زوجہ زلیخا کو آپ کی پرورش پر مامور کیا۔ لیکن عہد شباب میں آپ کا حسن لاثانی ہو گیا اور عزیزِ مصر کی بیوی آپ کے حسن و جمال کو دیکھ کر فدا ہو گئی۔ جب اس عشق کا چرچا مصر میں ہوا تو وہاں کو عورتیں زلیخا پر آوازیں کستی تھیں کہ تم ایک غلام پر عاشق ہو گئی ہو۔ تم نے اس میں کیا خوبی، کیا حسن اور کیا رعنائی دیکھی جو دل دے بیٹھی۔ اس طرح کے طنز سے تنگ آکر زلیخا نے ایک روز تمام عورتوں کو جمع کیا۔ اُن کے ہاتھوں میں چھری اور لیموں دے دیا کہ جب یوسف کو دیکھو تو کاٹنا۔ پھر حضرت یوسف علیہ السلام کو بلایا گیا۔ وہ سب حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن و جمال میں ایسی محو ہو گئیں کہ لیمو کاٹنے کے بجائے اپنی انگلیاں کاٹ بیٹھیں اور کہا کہ یہ آدمی نہیں فرشتہ ہے۔

اس واقعے کو پیشِ نظر رکھ کر شاعر کہتا ہے کہ عشق میں یہ بات عام ہے کہ عاشق اپنے رقیبوں سے جلتے ہیں۔ لیکن عام عادت کے خلاف زلیخا مصر کی عورتوں یعنی رقیبوں سے خوش ہے کہ وہ بھی اُسی طرح یوسف پر عاشق ہو گئیں۔ اس خوشی کا سبب یہ تھا کہ یہ عورتیں زُلیخا کو اب کوئی طعنہ نہیں دیں گی۔

مماثل شعر:

قسم جو کھایئے تو طالع زلیخا کی
عزیزِ مصر کا بھی صاحب ایک غلام لیا

شعر نمبر۴:

جوئے خون آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

حوالہ شاعر:

مندرجہ بالا شعر مرزا اسد اللہ خان غالب کی ایک غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو اردو کا پہلا فلسفی شاعر کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

اس شعر میں غالب اپنے محبوب کی جدائی کے کرب کو بیان کر رہا ہے۔

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS

مشکل الفاظ:

جوئے خون:	خون کی ندی
شامِ فراق:	جدائی کی شام
شمع:	موم بتی
فروزاں:	روشن

فنی خوبی:

استعارہ،[آنسوؤں کیلئے لفظ شمع مستعار لیا گیا۔]

تشریح:

اس شعر میں غالب کہتے ہیں کہ شبِ فراق محبوب اور اہلِ عشق کے لئے کٹھن پہاڑ کی حیثیت رکھتی ہے جسے بسر کرنا بے حد دشوار ہوتا ہے۔ ہم بھی اپنے محبوب کی جدائی میں بے حد تڑپ رہے ہیں۔ اس سے دوری اور اُس کی جفا کا کرب ہمیں خون کے آنسو رُلاتا ہے۔ ہم اس کے فراق میں اس قدر روتے ہیں کہ ہمارے آنسو خشک ہو چکے ہیں اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جگہ خون سیلِ رواں بہہ نکلا ہے۔ محبوب کا فراق بہت بڑی اذیت ہے۔ اور اس اذیت میں مبتلا ہو کر رونا تو ہمارا حق ہے۔ اس لئے ہمیں کوئی نہ روکے کیونکہ یہ رونے والی دو آنکھیں ان دو چراغوں کی مانند ہیں کہ جو اس کڑی رات میں ہمیں روشنی کا احساس دلاتی ہیں۔ اور یہی دو شمعیں ہمارے محبوب کو بھی اس بات کا احساس دلائیں گی کہ ہم اس کے عشق میں کس قدر گرفتار ہیں اور اس کے فراق میں کس قدر عقوبت سے گزر رہے ہیں۔

مماثل شعر:

محبت میں ایک ایسا وقت بھی دل پہ گزرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں، طغیانی نہیں جاتی

شعر نمبر۵:

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سُن کر مرے نالے غزلخواں ہو گئیں

حوالۂ شاعر:

مندرجہ بالا شعر مرزا اسد اللہ خان غالب کی ایک غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو اردو کا پہلا فلسفی شاعر کہا جاتا ہے۔

مشکل الفاظ:

دبستاں:	مکتب، مدرسہ
نالے:	آہ و زاری
غزلخواں:	گنگنانا

تشریح:

یہ عام قاعدہ ہے کہ مکتب میں استاد کی غیر موجودگی میں طلبہ نہیں پڑھتے لیکن جیسے ہی استاد کو آتا دیکھتے ہیں یا اُس کی آواز سن لیتے ہیں تو اور بھی زیادہ جوش و خروش سے اپنا سبق دہرانے لگتے ہیں۔ شاعر نے اسی نفسیات کو پیشِ نظر رکھ کر شعر کہا ہے۔ کہتا ہے کہ میرا چمن میں جانا تھا کہ ایک مکتب و مدرسہ کا سماں پیدا ہو گیا۔ بلبلیں میرا نالہ سن کر اپنے اپنے نغمے نہایت جوش و خروش سے دہرانے لگیں۔ انھوں نے مجھ سے ہی نالہ و فریاد کرنا سیکھا ہے لیکن میرے نالوں کے مقابلے میں اُن کے نالوں میں درد و اثر کی کیفیت کم ہے۔

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS

(۲)۔۔ شعر کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے، کہا جاتا ہے کہ بلبل دلکش آواز سن کر خود بھی نغمہ سرا ہو جاتی ہے۔ میں باغ میں گیا میرے نالے سن کر بلبلیں جوش و مسرت میں غزل سرا ہو گئیں کہ دیکھو ہمارے ہی جیسا نالہ و فریاد کرنے والا آ گیا۔ چونکہ میں بھی عاشق ہوں اور بلبل بھی عاشق ہے اس لئے ہم دونوں کی کیفیات ملتی جلتی ہیں۔ میری غزلوں میں وہی کچھ ہے جو اس کے دل کی پکار ہے یا پھر مجھے دیوانہ سمجھ رہے ہیں کیونکہ دیوانے کو دیکھ کر بچے خوش ہوتے ہیں۔

مماثل شعر:

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

شعر نمبر۶:

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

حوالۂ شاعر:

مندرجہ بالا شعر مرزا اسد اللہ خان غالب کی ایک غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو اردو کا پہلا فلسفی شاعر کہا جاتا ہے۔

مشکل الفاظ:

موحد: توحید پر یقین رکھنے والا
کیش: طریقہ
ترک: چھوڑنا
ملتیں: اقوام

تشریح:

خدا واحد ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں اور خدا کو جو ایک مانتا ہے وہ موحد ہے اور موحد اُن تمام رسوم کو ترک کر دیتا ہے جو ملت و مذہب کی صورت میں نمودار ہوتی ہیں۔ وہ صرف اور صرف ایک خدائے واحد کی پرستش کرتا ہے۔
یہی بات شاعر کہتا ہے کہ ہم موحد ہیں اور ہمارا مذہب یہ ہے کہ ہم رسوم کو مٹائیں اور ترک کریں کیونکہ جب رسمیں ترک ہوتی ہیں تو تمام مذاہب اور فرقے آپ ہی آپ ختم ہو جائیں گے اور ملتیں مٹ کر اجزائے ایمان بنتی جائیں گی۔ مطلب یہ کے مذہب وملت کی آڑ میں طرح طرح کی رسمیں اختراع کر کے جزو ایمان بنا دی جاتی ہیں۔ اس طرح وحدانیت کا تصور خاک میں مل جاتا ہے جو کہ اصل ایمان ہے۔ لیکن موحدین ان رسومات کو ترک کرتے ہیں تو مذاہب وملت میں خالص وحدانیت کا تصور رہ جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ مذاہب مٹ کر ایمان کا جزو ہو جاتے ہیں اور صرف اصل دین جس کی بنیاد توحید پر ہے، باقی رہ جاتا ہے۔

شعر نمبر۷:

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

حوالۂ شاعر:

مندرجہ بالا شعر مرزا اسد اللہ خان غالب کی ایک غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو اردو کا پہلا فلسفی شاعر کہا جاتا ہے۔

مشکل الفاظ:

خوگر: عادی
رنج: غم

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS BASIM
www.studypak.xyz

فنی خوبی:

صنعتِ تضاد،[مشکل، آسان]

مرکزی خیال:

زمانے کے نشیب و فراز دیکھنے والے افراد میں مصائب و آلام کا احساس رفتہ رفتہ ختم ہو جاتا ہے۔ حقیقت پسندی کا بیان۔

تشریح:

شاعر نے بڑا خوبصورت اور مؤثر اندازِ بیان اختیار کرتے ہوئے اس حقیقت کو پیشِ عقل کیا ہے کہ کسی بھی چیز کی انتہاء اور زیادتی اس کے احساس و حقیقی اثر کو ختم کر دیتی ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کو بہت مصائب و آلام کا سامنا رہتا ہے اور وہ مشکلات میں گھرا رہتا ہے تو اس کا احساسِ غم فنا ہو جاتا ہے کہ اسے غم، غم معلوم نہیں ہوتا بلکہ معمول کی بات لگتی ہے۔ شاعر کا کہنا ہے کہ میرے ساتھ بھی کچھ اسی طرح کے واقعات پیش آئے ہیں اور میں بھی اس سے متاثر شخص ہوں۔ مجھے اس قدر دکھوں کا سامنا رہتا ہے کہ میں غم کی کیفیت ہی بھلا بیٹھا ہوں۔ اس شعر کو اگر ہم وسیع معنوں میں لیں تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی بھی چیز کی انتہاء نقصان دہ ہوتی ہے۔

مماثل شعر:

جب کوئی غم نہیں ہوتا ناصرؔ
بے کلی دل کی سوا ہوتی ہے

شعر نمبر ۸:

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا اِن بستیوں کو تُم کہ ویراں ہو گئیں

حوالہ شاعر:

مندرجہ بالا شعر مرزا اسد اللہ خان غالب کی ایک غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو اردو کا پہلا فلسفی شاعر کہا جاتا ہے۔

تشریح:

اس شعر میں غالب لوگوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے لوگو! اگر غالب اسی طرح روتا رہا یعنی مسلسل لگاتار بہت شدت سے روتا رہا تو اُس کا یہ رونا ضرور رنگ لائے گا۔ تم دیکھ لوگے کہ اس کے رونے سے بستیاں کی بستیاں ویران ہو جائیں گی کیونکہ اس کے رونے میں درد و اثر کی ایسی کیفیت ہے کہ وہ بستیاں چھوڑ کر ویرانوں میں نکل جائیں گے یا اُس کے آنسو ایسا سیلاب لائیں گے کہ یہ سیلابِ اشک آبادی کو بہا کر لے جائے گا، مکانوں کو مسمار کر دے گا۔ نتیجتاً پوری بستی ویراں ہو جائے گی۔

مولانا حسرت موہانی

تعارفِ شاعر:

نام سید فضل الحسن، تخلص حسرت، ضلع یوپی کے ایک قصبے "موہان" میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید اظہر حسین تھا۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی سیاسیات میں حصہ لینا شروع کیا۔ بی اے کرنے کے بعد ایک ادبی اور سیاسی پرچہ "اردوئے معلّٰی" کے نام سے جاری کیا۔

زندگی بھر حق و صداقت کی راہ پر گامزن رہے۔ وطن کی راہ میں قید و بند کی صعوبتیں بڑی حوصلہ مندی اور استقامت سے برداشت کیں۔ حسرت کا اپنا ایک منفرد انداز ہے۔ انھوں نے غزل کو ایک نیا وقار اور ایک نئی زندگی عطا کی۔ انہیں جدید اردو غزل کا مسیحا، غزل کا امام اور رئیس المتغزلین جیسے القابات دیے گئے۔

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS BASIM
www.studypak.xyz

غزل(۱)

شعر نمبر۱:

تجھ کو پاسِ وفا ذرا نہ ہوا ہم سے پھر بھی ترا گلہ نہ ہوا

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر مولانا حسرت موہانی کی غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو غزل کا مسیحا کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

محبوب کبھی بھی وعدہ پورا نہیں کرتا اس کے باوجود عاشق شکایت نہیں کرتا۔

فنی خوبی:

مطلع،[غزل کا پہلا شعر]

تشریح:

محبوب کی فطرت میں بے وفائی ہوتی ہے۔ وہ کسی بھی حال میں محبت کی قدر نہیں کرتا۔ اس کے مقابلے میں عاشق کو ہر لمحہ وفا کا پاس رہتا ہے۔ وہ کوئی بات ایسی نہیں کرتا جس سے اس کی وفا پر حرف آئے۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے کہ اے میرے محبوب! تو نے ہماری وفا کا ذرا بھی خیال نہ کیا، ہماری محبت کی بالکل قدر نہیں کی، تو نے ہمیشہ ہمارے ساتھ بے نیازی اور بے رخی کا برتاؤ کیا اور تیرا یہ طرزِ عمل ایسا تھا کہ ہم اگر اس پر کچھ کہتے تو حق بجانب تھے لیکن ہم نے تجھ سے کچھ شکوہ نہیں کیا کہ یہی محبت کا تقاضا تھا اور یہی وضع داری تھی۔

مماثل شعر:

ہر حال میں ہم تم سے وفا کرتے رہیں گے
دل توڑنے والوں کی شکایت نہ کریں گے

شعر نمبر۲:

ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر مولانا حسرت موہانی کی غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو غزل کا مسیحا کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

دوستی کے ساتھ ساتھ دشمنی کا رشتہ بھی ٹوٹ گیا۔

مشکل الفاظ:

بگڑنا: ناراض ہونا
جفا: بے وفائی

تشریح:

بگڑنا، خفا ہونا، ظلم و ستم کرنا محبوب کی عادت ہے۔ لیکن تعلق رکھنا مقصود ہوتا ہے تو عادت میں نرمی رکھنی پڑتی ہے۔ شاعر یہی کہتا ہے کہ ہمارا محبوب ہم پر ظلم و ستم کرتا تھا۔ ہم اسے برداشت کرتے تھے۔ اس صورت میں ہمارا کسی نہ کسی طور محبوب سے تعلق ضرور قائم تھا لیکن

اب وہ ہم سے ایسا ناراض ہوا کہ اس نے عادت کے برخلاف ظلم وجور بھی کرنا چھوڑ دیا اور جیسا کہ دشمنی کا حق تھا وہ بھی ادا نہیں کیا۔ ہم تو اس کے ظلم وستم پر خوش تھے کہ ایک نوع کا اس سے تعلق تو قائم ہے۔ اب دشمنی کا بھی تعلق نہیں رہا یہ ہمارے لئے سب سے زیادہ خطرناک بات ہے۔

مماثل شعر:

قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

شعر نمبر ۳:

کٹ گئی احتیاطِ عشق میں عمر — ہم سے اظہارِ مُدعا نہ ہوا

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر مولانا حسرت موہانی کی غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو غزل کا مسیحا کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

محبوب کے انکار کے خوف سے ساری زندگی اظہارِ محبت نہ کر سکے۔

مشکل الفاظ:

مدّعا: خواہش / مقصد

تشریح:

عشق میں احتیاط لازم ہے۔ عاشق کی ذرا سی بے احتیاطی سے محبوب کا مزاج برہم ہو سکتا ہے اور ویسے بھی اظہارِ مدعا عشق کی روایت کے خلاف ہے۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے کہ ہم ساری زندگی عشق میں احتیاط سے کام لیتے رہے۔ اس بات سے ڈرتے رہے کہ ہماری بے احتیاطی سے کہیں ہمارا محبوب ہمارا مخالف نہ ہو جائے۔ اس احتیاط کی پیشِ نظر ہم حرفِ مدعا زبان پر نہیں لائے۔ اس طرح ساری زندگی خاموش عشق کرتے رہے۔

احتیاطِ عشق میں دو باتیں شامل ہیں: ایک تو یہ کہ اس خوف سے اظہارِ محبت نہ کیا کہیں محبوب انکار نہ کر دے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمیں اس بات کا خوف تھا ہمارے اظہارِ محبت کرنے سے محبوب کی عزت پہ حرف نہ آئے، کہیں وہ بدنام نہ ہو جائے۔ اس خوف سے محبت کے ارمان کو دل میں چھپائے بیٹھے رہے۔

مماثل شعر:

دیکھنا بھی تو انہیں دور سے دیکھا کرنا
شیوۂ عشق نہیں، حُسن کو رسوا کرنا

شعر نمبر ۴:

مر مٹے ہم تو مٹ گئے سب رنج — یہ بھی اچھا ہوا برا نہ ہوا

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر مولانا حسرت موہانی کی غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو غزل کا مسیحا کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

مرنے کے بعد سب رنج ختم ہو جاتے ہیں۔ جب تک زندگی ہے رنج رہیں گے۔

JOIN FOR MORE!!!

فنی خوبی:

صنعت تضاد،[اچھا،برا]

تشریح:

تمام دکھ درد، رنج والم، آرام و آرایش زندگی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ زندگی قائم ہے تو سب ہی چیزوں سے واسطہ ہے اور مرنے کے بعد ہر چیز سے چھٹکارا مل جاتا ہے۔ یہی بات شاعر کہتا ہے کہ عشق میں ایسی تکلیفیں، ایسے مصائب اور رنج والم سے سابقہ پڑا کہ بالاخر موت سے ہمکنار ہوگئے۔ گویا عشق میں ہم مرمٹے۔ چلو یہ بہت اچھا ہوا۔ اس طرح ہمیں رنج والم سے چھٹکارا مل گیا۔ زندگی کے تمام دکھ درد سے نجات مل گئی۔ گویا جان کے بدلے میں یہ سودا مہنگا نہیں رہا۔

مماثل شعر:

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

شعر نمبر۵:

تم جفاکار تھے کرم نہ کیا   میں وفادار تھا خفا نہ ہوا

JOIN FOR MORE!!!

حوالہ شاعر:

پیشِ نظر شعر مولانا حسرت موہانی کی غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو غزل کا مسیحا کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

محبوب کے ظلم کے باوجود عاشق وفاداری کرتا ہے۔

مشکل الفاظ:

جفاکار: بے وفا

خفا ہونا: ناراض ہونا

تشریح:

جفا محبوب کی فطرت اور وفا محبوب کی سرشت ہوتی ہے اور دونوں اپنی سرشت پر قائم رہتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ تمہاری فطرت میں ظلم وستم کرنا ہے اس لئے تم ہر لحہ ہم پر ظلم وستم کرتے رہے اور کبھی ہم پر کبھی عنوان کرم نہیں کیا۔ اس کے برخلاف ہماری سرشت میں چونکہ وفاداری تھی اس لئے ہم ہر ظلم کو برداشت کرتے ہےن اور کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائے۔ گویا دونوں اپنی اپنی سرشت پر قائم رہے۔

مماثل شعر:

اک طرزِ تغافل ہے سو وہ اُن کو مبارک
اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

شعر نمبر۶:

ہجر میں جانِ مضطرب کو سکوں   آپ کی یاد کے سوا نہ ہوا

حوالہ شاعر:

پیشِ نظر شعر مولانا حسرت موہانی کی غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو غزل کا مسیحا کہا جاتا ہے۔

M.HARIS www.studypak.xyz

مرکزی خیال:

محبوب کی جدائی باعثِ غم ہے تو اسی کی یاد وجہِ سکوں ہے۔

مشکل الفاظ:

ہجر: جدائی

مضطرب: بے قرار

تشریح:

ہجر میں محبوب کی یاد ہی باعثِ تسکین ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ عاشق کے لئے سب سے بڑا غم محبوب سے جدائی کا ہے۔ اس سے بڑا غم اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جدائی میں اگر کوئی سکوں پہنچانے والی چیز تھی تو وہ صرف تیری یاد تھی۔ ہجر کے لمحات میں جب ہمارا دل مضطرب و بے چین ہوتا اس وقت تمہاری یاد ہی سکون کا باعث ہوتی تھی۔ اگر ایک لمحے بھی ہم یاد سے غافل ہو جائیں تو بے چینی اور بڑھ جاتی تھی۔

مماثل شعر:

جب بھی یہ دل اُداس ہوتا ہے
جانے کون آس پاس ہوتا ہے

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS
www.studypak.xyz

شعر نمبر ۷:

رہ گئی تیرے فقرِ عشق کی شرم میں جو محتاجِ اغنیاء نہ ہوا

حوالہ شاعر:

پیشِ نظر شعر مولانا حسرت موہانی کی غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو غزل کا مسیحا کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

اگر میں تیرے رویہ سے مایوس ہو کر کسی اور حسین کی طرف متوجہ ہو جاتا تو اِس میں تیری ہی رسوائی ہوتی لہٰذا میری وفاداری تیری عزت کا بنی۔

تشریح:

مندرجہ بالا شعر میں شاعر نے ایک انوکھا خیال پیش کیا ہے وہ محبوب کے در سے اپنی وابستگی کو محبوب کی عزت میں اِضافے کا باعث قرار دیتے ہیں کہ اِس دنیا میں حسینوں اور محبت کا جواب محبت سے دینے والوں کی کمی نہیں۔ اے میرے محبوب تو نے کبھی میری محبت کا جواب محبت سے نہیں دیا۔ اور نہ ہی میرے جذبۂ محبت کا احترام کیا۔ اگر میں تیرے رویہ سے مایوس ہو کر اگر کسی اور حسین کی طرف متوجہ ہو جاتا تو اِس میں تیری ہی رسوائی تھی۔ ہماری محبت کا بھرم ٹوٹ جاتا اور لوگ تجھے طعنہ دیتے کہ دیکھو اِس کا عاشق کسی اور کے در سے وابستہ ہو گیا ہے لہٰذا میری وفاداری تیرے لئے بھی باعثِ عزت بن گئی۔

(۲)۔۔ شعر کو عشقِ حقیقی پر بھی محمول کیا جاسکتا ہے پھر شعر کا مطلب ہو گا کہ محبوب حقیقی کے عشق میں مبتلا ہونا میرے لیے باعثِ فخر ہے کیوں کہ اس سے لو لگانے کے بعد مجھے دنیا میں کسی کے در پر سر جھکانے کی حاجت نہیں رہی اور کسی کے آگے دستِ سوال دراز کر کے مجھے شرمندہ نہیں ہونا پڑا۔

مماثل شعر:

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اَسرارِ شہنشاہی

غزل(۲)

شعر نمبر۱:

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے　　　وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر مولانا حسرت موہانی کی غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو غزل کا مسیحا کہا جاتا ہے۔

مشکل الفاظ:

یار: محبوب

آشنا: جاننے والا

خوبیٔ قسمت: اچھی قسمت

مرکزی خیال:

محبوب کی عظمت کا بیان

فنی خوبی:

مطلع، [غزل کا پہلا شعر]

تشریح:

عشق و محبت کے معاملات بھی بڑے نازک ہوتے ہیں۔ زندگی کا بیشتر حصہ محض آزمائش و امتحان میں ہی گزر جاتا ہے۔ بڑی بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ ان کے بعد بھی محبوب کا اعتماد حاصل نہیں ہوتا۔ اگر کسی کی قربانی قبول ہو جائے اور محبوب کا اعتماد حاصل ہو جائے تو اس سے زیادہ اور کون خوش قسمت ہو سکتا ہے۔ شاعر یہی بات اس شعر میں کہتا ہے۔ ہمارے محبوب کے حسن کی ہمہ گیری کا جہاں تک تعلق ہے ایک عالم اس کا پرستار ہے اور ہر ایک ہی اس سے محبت کا دعویٰ کرتا ہے۔ لیکن ایسے سعادت مند اور خوش نصیب مشکل ہی سے نظر آئیں گے جن پر اُسے اعتماد ہو اور جنہیں وہ اپنی دوستی کا اہل سمجھ کر اپنا محرمِ راز بنا لے۔ چنانچہ ایسے لوگ اپنی خوش قسمتی پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔ بظاہر شعر میں عشقِ مجازی ہے لیکن حقیقتاً یہ تصوف کا شعر ہے۔

مماثل شعر:

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

شعر نمبر۲:

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد　　　ترے جنوں کو خدا سلسلہ دراز کرے

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر مولانا حسرت موہانی کی غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو غزل کا مسیحا کہا جاتا ہے۔

مشکل الفاظ:

جنوں: پاگل پن

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS

دراز: لمبا

تشریح:

عشق میں سب سے بلند مقام جنون کا ہے۔ اس مقام پر پہنچنے کے بعد عاشق ہر چیز سے بے نیاز اور صرف اور صرف محبوب کے خیال میں ہمہ وقت مستغرق رہتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں تیرے عشق میں مبتلا ہو کر جنون کی حدود میں داخل ہو گیا ہوں۔ اب میں تمام فکروں سے آزاد ہوں، نہ مجھے دنیا کی فکر ہے نہ کسی اور چیز کی۔ اور یہ آزادی تیری جنون کے سبب میسر آئی ہے۔ اس لئے میری بارگاہِ رب العزت میں دعا ہے کہ تیرے جنون کے سلسلہ کو اور بڑھائے کہ میں اسی طرح ہر خیال اور ہر تصور سے آزاد صرف اور صرف تیری ہی خیال میں کھویا رہوں۔ یہ شعر مناسبتِ الفاظ، بندش کی چستی اور بے ساختگی کے سبب بہت ہی لطیف ہو گیا ہے۔ پھر مفہوم میں عشقِ حقیقی کا پہلو واضح ہے۔

مماثل شعر:

دنیا کی فکر، دین کی باتیں، خدا کی یاد
سب کچھ بھلا دیا ترے دو دن کے پیار نے

شعر نمبر ۳:

خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

JOIN FOR MORE!!!

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر مولانا حسرت موہانی کی غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو غزل کا مسیحا کہا جاتا ہے۔

مشکل الفاظ:

خرد: عقل

کرشمہ ساز: جادو کرنے والا

فنی خوبی:

صفت تضاد، [جنوں، خرد]

تشریح:

عشق کے معاملات میں عقل رہنمائی نہیں کر سکتی۔ عشق جس منزل تک پہنچ سکتا ہے عقل کا وہاں گزر بھی نہیں ہوتا۔ عقل عشق کی بلندی و رفعت کو دیکھ کر محوِ حیرت ہو جاتی ہے۔ اہلِ تصوف عقل و عشق کی اس کیفیت سے خوب واقف ہیں۔ حسرت کے اس شعر میں اس مسئلے کی کچھ نہ کچھ جھلک ضرور ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عشق کے معاملات بھی عجیب ہیں۔ جو چیزیں عام زندگی میں معیارِ خیال کی جاتی ہیں اور جن کا مفہوم مسلمہ اقدار و روایات کے تحت اخذ کیا جاتا ہے عشق میں ان کے معنی و مطالب تک بدل جاتے ہیں۔ عام زندگی میں جو چیزیں معیارِ عقل میں داخل ہو جاتی ہیں عشق میں وہی چیزیں ناسمجھی اور دیوانگی کی حدود میں داخل ہو جاتی ہیں۔ عشق و محبت میں گرفتار ہونا دماغ کا خلل سمجھا جاتا ہے۔ اسی لئے اس سے دامن بچانے کی تلقین کی جاتی ہے۔ لیکن یہ محبوب کی کرشمہ سازیوں کا نتیجہ ہے کہ عشق و محبت میں جنون کی حدود میں داخل ہونا عقل و دانش کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عشق و محبت میں عقل و خرد سے بیگانگی ہی خردمندی قرار پائی ہے۔ یہی مفہوم اہلِ تصوف کی زندگی سے منطبق ہوتا ہے۔

مماثل شعر:

پختہ ہوتی ہے گر مصلحت اندیش ہے عقل
عشق ہے مصلحت اندیش، تو ہے خام ابھی

شعر نمبر۴:

ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرتؔ — اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر مولانا حسرت موہانی کی غزل سے لیا گیا ہے۔ آپ کو غزل کا مسیحا کہا جاتا ہے۔

مشکل الفاظ:

سزاوار: مستحق

سرفراز: کامیاب

تشریح:

جب ہم دعا مانگتے ہیں تو گویا اللہ کے حضور اپنے گناہوں کی فہرست پیش کر کے نیاز مندانہ اس کے قہر و غضب سے پناہ مانگتے ہیں اور اس کے رحم و کرم کو دعوت دیتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ وہ مختارِ کل ہے۔ ہزار گناہوں کے باوجود بھی عفو و درگزر سے کام لے کر سربلند و سرفراز کر سکتا ہے۔ اسی امید پر شاعر اپنے محبوب کے حضور التجا کرتا ہے کہ میری گناہوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ میں نافرمانیوں کے سبب تیری لطف و کرم، عنایتوں اور نوازشوں کا مستحق قرار نہیں پاتا۔ مجھی اپنے گناہوں کا اعتراف ہے۔ ان گناہوں اور نافرمانیوں کے باوجود اگر تو مجھ سربلند و سرفراز کرے، مجھے اپنے رحم و کرم کا مستحق قرار دے دے تو مجھے اس کا پورا پورا اقرار ہے کہ تو مالک و مختارِ کل ہے۔ میں صرف تیرے حضور گناہوں کا اعتراف کر کے رحم و کرم کا طلب گار ہوں۔ آگے تیری مرضی، تو مختار ہے۔

مماثل شعر:

تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا، نہ شکایتِ زمانہ

☆......☆......☆

فیض احمد فیض

تعارف شاعر:

اردو شعر کو بامقصد بنانے کا آغاز، جیسا کہ تاریخ ادب کا ہر طالب علم جانتا ہے، سرسید تحریک کی بدولت انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیسویں صدی میں قدیم کلاسیکی طرز کے شاعر رفتہ رفتہ اپنی عمریں پوری کر کے ختم ہوتے چلے گئے، جدید تعلیم سے آراستہ اور حالی کی تحریک سے متاثر شعراء کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔

فیض بھی ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوئے اور ان کی شاعری نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ پہلے ان کا غم ذاتی تھا اب اجتماعی ہو گیا۔ اس دور میں انھوں نے انہی اقدار کی ترجمانی کی ہے جو اس دور کے تمام ترقی پسند ادیبوں میں پائی جاتی ہیں۔

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا — راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS www.studypak.xyz

غزل(۱)

شعر نمبر۱:

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر فیض احمد فیض کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔ آپ کو ترقی پسندوں کا میرؔ کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

اس شعر میں شاعر اپنی زبان بندی کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں۔

مشکل الفاظ:

لوح: تختی

رقم کرنا: لکھنا

فنی خوبی:

مطلع، [غزل کا پہلا شعر]

تشریح:

یہ غزل چونکہ فیض نے اس وقت لکھی تھی جب کہ حکومت کے خلاف لکھنے کی پاداش میں قید و بند اور زنجیر و سلاسل میں جکڑے ہوئے تھے۔ آپ کہتے ہیں کہ حق گوئی ہماری فطرت میں رچی بسی ہوئی ہے۔ ہمیں سچ بیان کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ کوئی ہماری زبان پر تالا نہیں لگایا جا سکتا۔ کیونکہ حقانیت پسِ پردہ کبھی نہیں رہتی۔ ہم ادب کی خدمت کرتے رہیں گے۔ یہ لوہے کے زیور ہمارے جسم کو تو سلاسل کر سکتے ہیں لیکن ہمارے قلم اور ہمارے خیالات کو کوئی پابۂ زنجیر نہیں کر سکتے۔ ہمارا قلم حق و صداقت لکھتا رہے گا۔ ہم اپنے جذبات و احساسات کو الفاظ کے سانچے میں اسی طرح ڈھال کر پیش کرتے رہیں گے۔

شاعر بہت حساس طبع ہوتے ہیں۔ وہ حالات و واقعات سے جو اثر قبول کرتا ہے اسے بعینہٖ بیان کر دیتا ہے۔ اس میں عشق کے معاملات ہوں کہ

زمانے کے حالات، کوئی تخصیص نہیں۔

مماثل شعر:

ہر چند لکھتے رہے جنوں کی حکایتِ خوں چکاں

ہر چند کہ اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

شعر نمبر۲:

اسبابِ غمِ عشق بہم کرتے رہیں گے ویرانیِ دوراں پہ کرم کرتے رہیں گے

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر فیض احمد فیض کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔ آپ کو ترقی پسندوں کا میرؔ کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

حالات کو بدلنے کی کوششیں کرنے کا عزم۔

مشکل الفاظ:

بہم کرنا: اکٹھا کرنا

دوراں: زمانہ

تشریح:

فیض کہتے ہیں کہ یہ دنیا نفرت، کدورت، تعصب، فرقہ بندی اور انتشار کی تاریکیوں سے اندھیری ہو چکی ہے۔ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی جستجو نے اس حسین کرۂ ارض کو پُر تشدد بنا دیا ہے۔ یہ دنیا ہنگامہ آرائی کا گہوارہ بن چکی ہے اور یہاں نفرت کا آدم خور پودہ جڑیں پکڑ رہا ہے۔ اس عمیق اندھیرے میں محبت، اتحاد و اتفاق اور حق و صداقت ہی ایک ایسی شمع ہے جو اس اندھیری کا گریباں چاک کر سکتی ہے۔ اس گلِ محبت کی معطر مہک ہی انسانیت کو دوبارہ بیدار کر سکتی ہے۔ ہم قاصد بن کر پیغامِ محبت کو عام کریں گے۔ محبت کی روشنی سے اس کو منور کر دیں گے۔ ہم اس دنیا کی بنجر زمین کو محبت کی شیرینی سے دوبارہ ہرا کر دیں گے۔ اور ہمارا وجود دنیا کی ویرانیوں پر بہت بڑا احسان ہو گا۔

مماثل شعر:

اے ظلم کے مارو لب کھولو، چپ رہنے والو چپ کب تک
کچھ حشر توان سے اٹھے گا، کچھ دور تو نالے جائیں گے

شعر نمبر۳:

ہاں! تلخیٔ ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں! اہلِ ستم مشقِ ستم کرتے رہیں گے

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر فیض احمد فیض کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔ آپ کو ترقی پسندوں کا میرؔ کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

اس شعر میں فیض ظلم و جبر کے خلاف عزم و استقلال کا اظہار کر رہیں ہیں۔

مشکل الفاظ:

تلخیٔ ایام: مشکل زمانہ

ستم: ظلم

تشریح:

اس شعر میں فیض کہتے ہیں کہ ہم ایک مدت سے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہیں ہے اور ہم ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں۔ ہمیں پابندِ سلاسل کر کے ہمارے جسم کے ساتھ ساتھ ہماری خیالات اور قلم کو بھی ختم کرنے کی سازش اور سعی کی جا رہی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ ظلم و ستم کا پیمانہ اس وقت تک بھرتا رہے گا جب تک اہلِ ستم چاہیں یا یہ پیمانہ لبریز نہ ہو جائے۔ ہم اس وقت تک تختہ مشق بنے رہیں گے جب تک کوئی اور ستم کرنے کو باقی نہ رہے گا۔ لیکن ہم اس طوفانِ ستم کے سامنے تناور درخت کی طرح کھڑے رہے ں گے اور آکر خار اس کا رخ موڑ دیں گے۔ یہ جسمانی اذیت راہِ حق سے ہمارے قدموں کو اکھاڑنے کی لئے کافی نہیں، ہر ظلم ہمارے عزم کو تقویت بخشتا ہے۔

مماثل شعر:

ادھر آ ستم گر، ہنر آزمائیں
تُو تیر آزما، ہم جگر آزمائیں

JOIN FOR MORE!!!

شعر نمبر۴:

منظور یہ تلخی ، یہ ستم ہم کو گوارا　　　دم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے

حوالہ شاعر:

پیشِ نظر شعر فیض احمد فیض کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔ آپ کو ترقی پسندوں کا میرؔ کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

اس شعر میں فیض ظلم و ستم مٹانے کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کا عزم کر رہے ہیں۔

مشکل الفاظ:

تلخی: سختی

مداوا: علاج

الم: درد

تشریح:

اس شعر میں فیض کہتے ہیں کہ اربابِ اقتدار ہم پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رہے ہیں اور ہمیں تختہ مشق و ستم بنا رہیں ہیں۔ وہ ہماری زبان و بیان پر قفل لگانے کے لئے ہر قسم کی عقوبت ہم پر ڈھا رہے ہیں۔ لیکن یہ ہمارا عزم ہے کہ ہم ہر ستم برداشت کریں گے، ہم اس ظلم کے ہر تیر کو مردِ آہن کی طرح اپنے سینے پر سہہ لیں گے۔ اس وقت تک جب تک بس چلے گا۔ اس وقت تک ہم اپنے دکھ کا مرہم کرتے رہیں گے۔ یہ زخم تو ایسے ہیں جو مٹ جاتے ہیں۔ اس لئے ہمیں ان زخموں اور ان جان سوزیوں کے آگے گھٹنے نہ ٹیکیں گے۔ ہم اپنی قوم کی اس قدر تاریکی سے نکالنے کے لئے اپنے قلم کی روشنی پھیلائیں گے اور اپنی قوم کو اس کڑی دھوپ میں سایہ فراہم کریں گے۔

مماثل شعر:

زندگی غم سے سنورتی ہے، نہ گھبرا اے دوست
حد سے بڑھ جائے اندھیرا، تو سحر ہوتی ہے

شعر نمبر۵:

باقی ہے لہو دل میں تو ہر اشک سے پیدا　　　رنگِ لب و رخسار صنم کرتے رہیں گے

حوالہ شاعر:

پیشِ نظر شعر فیض احمد فیض کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔ آپ کو ترقی پسندوں کا میرؔ کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

ظلم کے خاتمے کے لئے ہر قسم کے ایثار کا جذبہ۔

مشکل الفاظ:

اشک: آنسو

لب: ہونٹ

رخسار: گال

صنم: بت (محبوب)

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS www.studyhall.xyz

تشریح:

اس شعر میں فیض طوفانِ ستم کے آگے سینہ سپر ہونے کا عزم کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب تک روح اس جسم کی قفس میں ہے اور جب تک اس جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی ہے، جب تک شاخِ زندگی صفحہ ہستی کے ساتھ لگی ہوئی ہے تب تک ہم اپنی قوم وملت کی خدمت کریں گے اور ہر ظلم کو سہیں گے۔ ہم اپنے قلم میں اپنے اشکوں کی سیاہی بھر کر بھی آزادی کے لئے تڑپتی ہوئی اپنی قسم کی بیدار کریں گے اور ان پر کئے جانے والے مظالم کی داستانِ غم رقم کریں گے۔ ہم ایک ایسا انقلاب برپا کر دیں گے کہ سب سانسِ طمانیت لے سکیں۔ ہم اپنے لہو سے اس پروانہ آزادی کو سینچیں گے۔ زندگی مقصد سے عبارت ہوتی ہے اور مقصد کے حصول کے لئے آدمی بڑی سے بڑی قربانی دیتا ہے اور بڑی سے بڑی تکلیف برداشت کرتا ہے۔

مماثل شعر:

اُدھر تقاضے ہیں مصلحت کے، اِدھر تقاضائے دردِ دل ہے
زباں سنبھالیں کہ دل سنبھالیں اسیر اہلِ وطن سے پہلے

شعر نمبر ۶:

اک طرزِ تغافل ہے، سو وہ اُن کو مبارک
ایک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

حوالہ شاعر:

پیشِ نظر شعر فیض احمد فیض کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔ آپ کو ترقی پسندوں کا میرؔ کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

محبت میں محبوب کا نہیں اپنا رویہ دیکھا جاتا ہے۔

تشریح:

اس شعر میں فیض کہتے ہیں کہ ہم اپنے محبوب سے کئی بار اظہارِ عشق کر چکے ہیں لیکن وہ ہمیشہ ہمارے دلِ بے قرار کو بری ادا سے کچل کر چلا جاتا ہے۔ ہم نے کئی مرتبہ اس کے سامنے اپنے دل کو کھول دیا لیکن اس نے ہر بار نفرت کے زہر خند تیروں کی بوچھار کر کے ہمارے دل کو اور زخمی کر دیا ہے۔ یہ بے توجہی اور بے نیازی اس کی عادت ہی ہے۔ ہم اپنی اس امید کی تکمیل کے لئے کوشاں رہیں گے۔ اس کی کرم نوازیوں کے حامل ہوں گے۔ ہم اپنی فطرت کے مطابق دوستی کا بھرم بھرتے رہیں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہم جب اس کی طرف مدد بھری نظروں سے دیکھیں گے وہ نفرت سے منہ پھیر لے گا۔ لیکن ہم اس کی محبت کے دعوے دار رہیں گے اور اس کی زلف کے اسیر رہیں گے۔

محبوب کی عادت ہوتی ہے کہ وہ تغافل برتتا ہے۔ بے رخی اختیار کرتا ہے۔ ہماری خواہشات کا سے علم ہوتا ہے لیکن وہ اس کے باوجود توجہ نہیں دیتا اور یہ اس کی عادت ہوتی ہے کہ وہ اس انداز کو جانتے ہوئی بھی عرضِ تمنا کرتا رہتا ہے۔ اس امید پر کہ شاید کبھی تو اس کی تمنا پوری ہو گی اور مقصد بر آئے گا۔

مماثل شعر:

تم جفا کار تھے، کرم نہ کیا
میں وفادار تھا، جفا نہ ہوا

JOIN FOR MORE!!!

غزل (۲)

شعر نمبر ۱:

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے — چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر فیض احمد فیض کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔ آپ کو ترقی پسندوں کا میرؔ کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

باغ میں بہار محبوب کے آنے سے ہے۔

فنی خوبی:

- مطلع، [غزل کا پہلا شعر]
- حسنِ تعلیل، [بہار آنے کی وجہ محبوب کو قرار دیا گیا۔]

مشکل الفاظ:

گل: پھول

بادِ نو بہار: بہار کی تازہ ہوا

تشریح:

اس شعر میں فیض کہتے ہیں کہ جب گردشِ زمانہ سے ہم مایوس ہو جاتے ہیں جب ہم پر یاس و ہراس کی کیفیت چھا جاتی ہے اور زندگی میں خزاں کا خشک موسم ڈیرا جما لیتا ہے تو ایسے میں ہم چشمِ تصور میں اپنے محبوب کو دیکھ لیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اے محبوب! تم اگر ہمیں شرفِ دید بخش دو اور اگر تم ہمیں اپنی قربت سے نواز دو تو ہماری زندگی کی خزاں بہار میں تبدیل ہو جائی گی۔ ہمارے دل کے پھول کھل اٹھیں گے۔ تمہارے وجود کی خوشبو ہمارے دل اور روح کو معطر کر دی گی۔ تم صحرائے زندگی کی کڑی دھوپ اور آفتابِ زندگی کی تپش میں ہمارے لئے بادِ صبا بن کر چلے آؤ۔ تمہارا حسین چہرہ پھولوں کو کھلا دے گا۔ تمہاری ستم ظریف زلفیں ہمیں پر سکون سایہ فراہم کر دیں گی۔ تمھاری مدھ بھری آنکھوں میں چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھ کر ہم غمِ دوراں کی تاریکیوں کو بھول جائیں گے اور اپنی قسمت کی اندھیری غار سے نکل آئیں گے اور ہمیں بھی خوشی کے احساس سے آشنا ہونے کا موقع فراہم ہو جائے گا۔ انتظار کی کیفیت بڑی شدید ہوتی ہے۔ مشہور ہے کہ: انتظار کی کیفیت تو موت سے زیادہ سخت ہوتی ہے۔

مماثل شعر:

اب آ بھی جاؤ چاندنی راتوں کے اسیر
معنی بدل نہ جائیں خوشی کے بہار کے

شعر نمبر ۲:

قفس اُداس ہے یار و صبا سے کچھ تو کہو — کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر فیض احمد فیض کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔ آپ کو ترقی پسندوں کا میرؔ کہا جاتا ہے۔

JOIN FOR MORE!!!

مرکزی خیال:

محبوب اگر پاس نہ ہو تو اس کے تذکرے سے ہی دل کی اداسی و تاریکی، خوشی و مسرت میں تبدیل ہو جاتی ہے اور عاشق پھر سے تازہ دم ہو جاتا ہے۔

مشکل الفاظ:

قفس: پنجرہ

صبا: صبح کی ہوا

تشریح:

اس شعر میں فیض کہتے ہیں کہ اربابِ اقتدار ہمیں تو پابہ زنجیر کر کے پابندِ سلاسل کر دیا ہے اور ہم ہیں کہ نسیمِ سحر جب آئے تو ہمیں اپنے محبوب کی خیریت سے آگاہ کرے۔ صبح کی ہوا ہمارے محبوب کے وجود کی خوشبو لے کر آئے اور ہمارے اداس دل کو تر و تازگی فراہم کر دے۔ کاش کوئی جھونکا ایسا آئے جو ہماری ذات کی اس کے تصور اور اس کی یادوں کے سمندر میں غوطہ زن کر دے۔ کیونکہ زنداں کی حیات میں یہی تو ایک سہارا ہے جو ہر ایک کو غمِ دوروں سے آزاد کر دیتا ہے۔ اور ہم ہر الم کو دیکھ کر اپنے محبوب کی یاد میں کھو جاتے ہیں۔ ہم یہی چاہتے ہیں کہ غمِ دوراں پر غمِ جاناں غالب آجائے تاکہ ہم راہِ عشق کی مسافتوں کو طے کر سکیں اور محبوب کی یاد صحرا میں بھی ہمیں چھاؤں عطا کر دے۔

JOIN FOR MORE!!!

مماثل شعر:

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے

شعر نمبر ۳:

کبھی تو صبح ترے کنجِ لب سے ہو آغاز کبھی تو شب سر کاکل سے مشک بار چلے

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر فیض احمد فیض کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔ آپ کو ترقی پسندوں کا میرؔ کہا جاتا ہے۔

M.HARIS BASIM www.studypak.xyz

مرکزی خیال:

اس شعر میں فیض اپنے محبوب کی قربت کے متمنی نظر آتے ہیں۔

مشکل الفاظ:

کنجِ لب: ہونٹوں کے کنارے (مسکراہٹ)

کاکل: بالوں کی وہ لَٹ جو پیشانی پر آئے

تشریح:

اس شعر میں فیض کہتے ہیں کہ اے محبوب! ہم تمہارے ہجر و فراق کی عقوبت سہہ چکے ہیں اور ہم تیری جدائی میں صبح و شام مر مر کر جئے ہیں۔ ہم نے تیری یاد کے سہارے یہ پر خار راہ زندگی طے کی لیکن تم نے ہم پر کبھی نظر التفات نہیں کی اور ہمیشہ ہماری محبت کو رسوا کر چھوڑا۔ ہم اس امید کے سہارے زندہ رہے کہ کوئی طلوعِ شمس تو ہماری آمد کی نوید لے کر آئے گا اور کوئی مبارک سحر تو ایسی ہو گی جب بیدار ہوتے ہی تمہارے حسین چہرے پر نظر پڑے گی، کوئی صبح تو تمہاری قیامت خیز مسکراہٹ کو ساتھ لائے گی۔ جب تمہاری پھول کی پنکھڑیوں جیسے لب نشان ہوں گے۔ اور تمہاری دل کے دریچے صرف ہمارے لئے وا ہوں گے۔ ہم یہی خیال کر کے سوئے کہ کوئی شب تو ہو گی جب تمہاری مسحور کن

قربت ملے گی۔ جب ہم غمِ دوراں کا سامنا کر کے تھک جائیں گے تو تمہارے گھنے گیسوؤں کی چھاؤں میں آرام سے سو جائیں گے اور تمہاری گھٹا جیسی حسین زلفیں مسحور کن خوشبو برسائیں گی۔

مماثل شعر:

زندگی ہے مری ترسی ہوئی تنہا کب سے
جام ہو، تُو ہو، گھٹا ہو، کبھی ایسا بھی تو ہو

شعر نمبر ۴:

تمہارے نام پہ آئیں ہے غم گسار چلے　　　بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر فیض احمد فیض کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔ آپ کو ترقی پسندوں کا میؔر کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

جب درد مشترک ہو تو غم بانٹنے والے ہزاروں مل جاتے ہیں۔

مشکل الفاظ:

غم گسار: غم خوار، ہمدرد

تشریح:

اس شعر میں فیض کہتے ہیں کہ عشق میں مایوسیوں اور محرومیوں سے سابقہ رہتا ہے۔ محبوب طرح طرح کے ستم ڈھاتا ہے۔ عاشق کے پاس بجز رنج والم کے کچھ نہیں ہوتا اور یہی کیفیت بہت سے لوگوں کی ہو تو اس قدر مشترک ہونے کی سبب ان کا تعلق بہت گہرا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے تمام لوگوں کو جب بھی محبوب کے نام پر جمع کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ غم گسار بے اختیار یکجا ہو جاتے ہیں کیونکہ درد کا رشتہ سب رشتوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ عاشق کا مقصد اس کا محبوب ہوتا ہے اور جو لوگ بھی اس سے دل چسپی رکھتے ہیں وہ سب وقت پڑنے پر کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی یکجا ہو جاتے ہیں اور جدوجہد کو مزید تیز کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگ مقصد کے حصول کے لئے جان کا نزرانہ بھی پیش کر سکتے ہیں۔

شعر نمبر ۵:

ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے　　　جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر فیض احمد فیض کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔ آپ کو ترقی پسندوں کا میؔر کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

اس شعر میں فیض فرسودہ نظام ختم ہونے کی نوید سنا رہے ہیں۔

مشکل الفاظ:

شبِ ہجراں: جدائی کی رات

عاقبت: انجام

تشریح:

شاعر شبِ ہجراں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ محبوب کے فراق میں جو طویل رات ہم نے گزاری ہے اس میں جو جو ہم پر ظلم و

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS

ستم ہوئے وہ آنسوؤں میں ڈھل کر ہماری آنکھوں میں بہنے لگے۔ یہ ہمارے آنسوؤں کا ہی کرشمہ ہے۔ اے سیاہ رات! تیرا انجام اچھا ہوا یعنی تاریکی اجالے میں تبدیل ہوگئی۔ مطلب یہ کہ ہماری قربانیاں رنگ لے آئیں۔ جس کی وجہ سے پرانا اور فرسودہ نظام ختم ہوگیا۔ اب خوشیوں کا دور ہے اور سایوں سے لطف اندوز ہونے کا زمانہ ہے۔ اور یہی ہماری منزل بھی ہے۔ ترقی پسند شعراء کو یقین تھا کہ ان کی منزل قریب آن پہنچی ہے۔ اسی لئے وہ ہمیشہ خوش آئند خواب دیکھا کرتے تھے۔

شعر نمبر ۶:

حضورِ یار ہوئی دفترِ جنوں کی طلب   گرہ میں لے کے گریباں کا تار تار چلے

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر فیض احمد فیض کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔ آپ کو ترقی پسندوں کا میرؔ کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

اس شعر میں فیض مقصد کے حصول کے لئے بڑی قربانیاں دینے کا دعویٰ کررہے ہیں۔

مشکل الفاظ:

حضورِ یار: جدائی کی رات

دفتر: لمبی کہانی / رجسٹر

تشریح:

فیض کہتے ہیں کہ ہم عاشقی میں جنون کی سرحدوں میں داخل ہوگئے۔ اس مقام پر پہنچنے کے لئے بڑی قربانیاں دینی پڑیں۔ ہم نے سب کچھ قربان کردیا۔ اب ہمارے پاس ایک گریبان ہے وہ بھی تار تار۔ چنانچہ جب ہمارے محبوب کے حضور ہماری طلبی ہوئی اور اپنی دیوانگی کا حساب کتاب پیش کرنے کا حکم ہوا تو ہم اپنا پھٹا ہوا گریبان لے کر محبوب کے حضور پہنچے کہ یہی ہماری قربانیوں اور ہماری وفاداریوں کا واحد ثبوت تھا۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے بڑی قربانیاں دی ہیں اب ہمارے پاس کچھ بھی نہیں بچا۔

مماثل شعر:

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب!
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

شعر نمبر ۷:

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں   جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر فیض احمد فیض کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔ آپ کو ترقی پسندوں کا میرؔ کہا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

اس شعر فیض مقصد کے حصول کے لئے بڑی قربانیاں دینے کا دعوی کررہے ہیں۔

فنی خوبی:

مقطع، [غزل کا آخری شعر]

مشکل الفاظ:

کوئے یار: محبوب کی گلی

دار: پھانسی کا تختہ

تشریح:

مقصد کا حصول بڑی قربانیاں چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ زندگی کا نزرانہ بھی قبول کرلیتا ہے اور یہی عاشقی میں ہوتا ہے چنانچہ شاعر کہتا ہے کہ ہماری پسندیدہ جگہ کوچہ یار تھا اور ہمارے شایانِ شان بھی اس لئے باوجود تکلیف کے ہمیں اس مقام پر سکون و اطمینان نصیب تھا۔ اب ہمیں اس مقام سے ہٹا دیا گیا ہماری نظر میں اس کے علاوہ کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں ہم قیام کرسکیں گے اس لئے اب ہمارے رخ اسی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حصولِ مقصد کے لئے جان کا نزرانہ دینا پڑا ہے اسی میں ہمارے لئے سکون ہے۔

ناصر کاظمی

غزل(۱)

شعر نمبر۱:

دل میں ایک لہر سی اُٹھی ہے ابھی کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر ناصر کاظمی کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔

مرکزی خیال:

دل کی گھٹن اور تکلیف کا بیان۔

تشریح:

شاعر گردوپیش کے واقعات سے متاثر ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے محسوس کرتا ہے، بیان کردیتا ہے۔ لیکن جہاں بیان اور اظہار کی آزادی نہ ہو وہاں شاعر اپنے اندر ایک گھٹن محسوس کرتا ہے۔ اس کے دل میں اک کرب انگڑائیاں لیتا ہے۔ اس شعر میں بھی یہی کیفیت محسوس ہوتی ہے کہ اگر گرمی شدید ہو، ہوا رکی ہوئی ہو تو سارے کام معطل ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں ہوا کا کوئی جھونکا آجائے تو وہ گویا زندگی کا پیغام ہوتا ہے۔ امنگیں اور آرزوئیں انگڑائیاں لینے لگتی ہیں۔ یہی کیفیت اس وقت ہماری ہے۔ ہم جو عرصے سے خاموش ہیں، اظہار کی تمام قوتوں کو ہم نے جبراً خاموش کردیا ہے۔ اسی لئے ہم اپنے دل میں ایک گھٹن محسوس کرتے ہیں۔ اب حالات میں تغیر آتا نظر آرہا ہے۔ گویا ہوا کا تازہ تازہ جھونکا آیا ہے جس سے دل میں آرزوؤں اور امنگوں کی لہریں اٹھنے لگی ہیں۔ یعنی اب ہمیں اپنے احساسات اور خیالات کے اظہار کا پورا موقع ملے گا۔

مماثل شعر:

ہوائے دورِ مئے خوشگوار راہ میں ہے
خزاں چمن سے ہے جاتی بہار راہ میں ہے

شعر نمبر۲:

شور برپا ہے خانۂ دل میں کوئی دیوار سی گری ہے ابھی

حوالہ شاعر:

پیشِ نظر شعر ناصر کاظمی کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔

مرکزی خیال:

خواہشات کی عدم تکمیل پر دل کی حالت کا بیان۔

تشریح:

شاعر کہتے ہیں ہیں کہ دل مثل گھر کے ہے اور گھر دیواروں سے گھرے ہوئے حصے کو کہتے ہیں۔ ہماری دل میں زبر دست شور برپا ہے اور یہ شور اس سبب سے ہے کہ گھر کی کوئی دیوار گری ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسانی دل خواہشات اور آرزوؤں کا مرکز ہے۔ اب پھر ہماری کسی آرزو کا خون ہوا ہے۔ اب پھر ہماری کوئی خواہش دم توڑنے لگی ہے۔ اسی لئے دل میں نالہ و فریاد کی کیفیت پیدا ہوئی ہے جس کو شور برپا ہونے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

مماثل شعر:

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

JOIN FOR MORE!!!

شعر نمبر ۳:

بھری دنیا میں جی نہیں لگتا — جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی

حوالہ شاعر:

پیشِ نظر شعر ناصر کاظمی کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔

مرکزی خیال:

اگر دل اداس ہو تو ہر چیز اداس معلوم ہوتی ہے۔

تشریح:

تمام جذبوں کا تعلق دل سے ہے۔ غم والم کا، مسرت و خوشی کا، غرض ہر جذبہ دل کی کیفیت سے ابھرتا ہے۔ دل اگر شاداں و فرحاں ہے تو ہر شے میں مسرت وانبساط موجِ زن نظر آتی ہے۔ لیکن دل اگر اداس و غمگین ہو تو ہر شے اداس معلوم ہوتی ہے اور کسی چیز میں دل نہیں لگتا۔ شاعر اسی کیفیت کو اس شعر میں بیان کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ دنیا میں رونقیں اپنے عروج پر ہیں، ہر شے شگفتہ و شاداں ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس دنیا میں میرا جی نہیں لگتا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کس چیز کی کمی ہے۔ میرا دل محبوب کے فراق میں غم زدہ ہے۔ اسی لئے اداس و غمگین رہتا ہے۔

مماثل شعر:

ہمارے گھر کی دیواروں پر ناصرؔ
اُداسی بال کھولے سو رہی ہے

شعر نمبر ۴:

تو شریکِ سخن نہیں ہے تو کیا — ہم سخن تیری خامُشی ہے ابھی

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر ناصر کاظمی کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔

مرکزی خیال:

عاشق، محبوب کی خاموشی سے بھی ہم کلام ہوتا ہے۔

مشکل الفاظ:

سخن: کلام

خامُشی: خاموشی

فنی خوبی:

صنعت تضاد،[سخن، خامُشی]

تشریح:

چہرہ اندرونی کیفیات کا بہت بڑا عکاس ہوتا ہے اور جو واقف ہوتے ہیں وہ چہرے کی کیفیات کو دیکھ کر ہی دل کی کیفیات کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ شاعر نے یہی بات بڑے خوبصورت انداز میں اس شعر میں بیان کی ہے۔ کہتے ہیں کہ اے میرے محبوب! تو محفل میں موجود ہے لیکن خاموش، کسی سے بات نہیں کر رہا ہے مگر تو ہم سے ہم کلام ہے۔ اس طرح کہ تیری خاموشی کے سبب تیرے چہرے پر جو تاثرات ابھر رہے ہیں وہ ہم سے تیری کیفیت بیان کر رہے ہیں۔ گویا تیری خاموشی سے ہم باتیں کر رہے ہیں اور یہ اعزاز محفل میں ہمارے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔

مماثل شعر:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

شعر نمبر۵:

یاد کے بے نشاں جزیروں سے تیری آواز آ رہی ہے ابھی

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر ناصر کاظمی کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔

مرکزی خیال:

ماضی کے دریچوں سے جو تیری تصویر ابھرتی تھی وہ دھندلی ہو چلی ہے۔

تشریح:

شاعر کہتا ہے ہم نے قرارِ یار میں زندگی بتا دی۔ تیری یادوں کے حسین لمحات کے سہارے زندگی کا طویل سفر طے کر لیا۔ لیکن اب تیری یادوں کے عکس بھی دھندلانے لگے ہیں۔ ماضی کے دریچوں سے جو تیری تصویر ابھرتی تھی وہ دھندلی ہو چلی ہے۔ تیری یادیں جو سرمایۂ زندگی تھیں وہ اب خواب ہو چکی ہیں۔ البتہ جب کبھی ہم ماضی میں جھانکتے ہیں تو تیری یادوں کے ویرانوں میں تیری ہی آواز گونجتی محسوس ہوتی ہے۔ اس طرح تجھ سے تعلق اب بھی باقی ہے۔

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS BASIM
www.studypak.xyz

مماثل شعر:

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ مرا

شعر نمبر ٦:

شہر کی بے چراغ گلیوں میں زندگی تُجھ کو ڈھونڈتی ہے ابھی

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر ناصر کاظمی کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔

مرکزی خیال:

محبوب کے نہ ہونے سے تمام رونق ختم ہو جاتی ہے۔

تشریح:

شاعر کہتا ہے کہ محبوب کی غیر موجودگی سے دنیا کی تمام رونق ختم ہو جاتی ہے۔ ہر طرف اداسی مسلط ہو جاتی ہے۔ ہر شے ویران دکھائی دیتی ہے۔ کیونکہ دل اداس و غمگین ہوتا ہے۔ لیکن یہاں تو حالات اس کے برعکس ہیں۔ انقلاباتِ زمانہ کے سبب رونقیں ختم ہو چکی ہیں۔ دنیا کے تمام ہنگامے اور دلچسپیاں بے معنی ہو کر رہ گئی ہیں۔ ہر طرف اداسی ہے، ویرانہ ہے، ایسے میں تیری یادیں اور تڑپا رہی ہیں اور میں بے ساختہ شہر کی ویران گلیوں میں تجھے تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ ایک زمانے کے سبب میں مبتلائے غم ہوں اور دوسرے محبوب کی یاد مجھے تڑپا رہی ہے۔

مماثل شعر:

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

شعر نمبر ۷:

سو گئے لوگ اس حویلی کے ایک کھڑکی مگر کھلی ہے ابھی

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر ناصر کاظمی کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔

مرکزی خیال:

جتنی محبت عاشق کو اپنے محبوب سے ہے، اتنی ہی محبت محبوب بھی کرتا ہے۔

تشریح:

عشق ہر دل پر اثر کرتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ کوئی اس کا اظہار کر دیتا ہے اور کوئی خاموش رہتا ہے۔ ہم جسے محبوب کہتے ہیں سنگدل اور بے وفا گردانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اسے ہم سے محبت نہیں۔ یہ بات بنیادی طور پر غلط ہے۔ ہمیں اپنے محبوب سے جتنی محبت ہے، اتنی ہی ہمارے محبوب کو ہم سے ہے۔ ہم اگر محبوب کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے گلی گلی آوارہ پھرتے ہیں تو وہ سنگدل بھی ہمارے انتظار میں رات بھر اپنے گھر کی کھڑکی کھلی رکھتا ہے۔ اسے یقین ہے کہ ہم رات کے سناٹے اور تاریکی میں اس طرف ضرور آئیں گے۔

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS
www.studypak

اس شعر میں ایک بات یہ بھی ہے کہ محبوب یہ کام اس وقت کرتا ہے جب تمام لوگ سو چکے ہوں۔ کیونکہ اسے ڈر ہے کہ گھر کے مکین اس کی راہ میں رکاوٹ بنیں گے۔ اس لئے کہ اس کا تعلق اعلیٰ طبقے سے ہے اور ہمارا تعلق ادنیٰ طبقے سے ہے۔ شاعر نے "حویلی" کے الفاظ سے اس کی وضاحت کر دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم اگر محبوب کے فراق میں آوارہ پھرتے ہیں تو وہ بھی ہمارے انتظار میں رات کی تاریکی میں آنکھیں بچھائے رہتا ہے کہ زمانہ طبقاتی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔

مماثل شعر:

محبت دونوں عالم میں یہی جا کر پکار آئی
جسے خود یار نے چاہا اسی کو یادِ یار آئی

شعر نمبر ۸:

وقت اچھا بھی آئے گا ناصرؔ غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر ناصر کاظمی کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔

مرکزی خیال:

حالات بدلتے ہیں۔ ہر خزاں کے بعد بہار ضرور آتی ہے۔

تشریح:

زندگی بیم ورجاء کا نام ہے۔ کبھی تو آدمی زمانے کے حالات سے مایوس ہو کر انجانے خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے اور کبھی زمانے کے دکھوں اور تلخیوں سے جھانکتی ہوئی امید کی کرنیں نظر آتی ہیں جن کے سہارے آدمی آگے بڑھنے لگتا ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ وقت سدا ایک سا نہیں رہتا۔ شاعر اس شعر میں کہتا ہے کہ مانا زندگی دکھوں سے بھری ہوئی ہے، زمانے کی تلخیوں نے ہمیں ایک عجیب سی گھٹن اور حبس بے جا میں مبتلا کر رکھا ہے۔ مگر مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ زمانہ تغیر پذیر ہے۔ حالات بدلتے ہیں، ہر رات کے بعد دن ہے، ہر خزاں کے بعد بہار ہے۔ اس لئے یقین رکھو کہ حالات ضرور بہتر ہوں گے۔ یہ رات یہ گھنگھور اندھیرا ضرور اجالے میں تبدیل ہو جائے گا۔

مماثل شعر:

ہوائے دورِ مئے خوشگوار راہ میں ہے
خزاں چمن سے ہے جاتی بہار راہ میں ہے

غزل(۲)

شعر نمبر ۱:

سفرِ منزل شب یاد نہیں لوگ رخصت ہوئے کب، یاد نہیں

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر ناصر کاظمی کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS BASIM

مرکزی خیال:

زندگی کے آلام و مصائب کا بیان۔

فنی خوبی:

مطلع،[غزل کا پہلا شعر]

تشریح:

شاعر کا یہ شعر ان کے دکھوں کا آئینہ دار اور اضطراب و بے چینی کا مظہر ہے۔ وہ اپنی زندگی کو سیاہ رات سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمیں زندگی کے طویل سفر میں تکالیف و مصائب سے ہی سابقہ رہا ہے۔ کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا کہ چین نصیب ہوا ہو۔ گویا میری زندگی سفر کی ایک سیاہ رات کی مانند تھی کہ کہیں سے روشنی کی کوئی کرن نہیں نظر آئی۔ اس صورت حال نے مجھے ایسا بد حواس کیا کہ کچھ یاد نہیں رہا۔ یہاں تک کہ اب یہ بھی یاد نہیں کہ جو لوگ میرے شریکِ سفر تھے وہ کب میرا ساتھ چھوڑ گئے اور میں اس تاریک سفر میں تنہا رہ گیا۔

مماثل شعر:

کب جانے وہ دامن کو چھڑا کر رخصت ہوئے
اور دل ہے کہ ابھی حیرت سے دیکھ رہا ہے

شعر نمبر ۲:

دل میں ہر وقت چبھن رہتی ہے تھی تجھے کس کی طلب، یاد نہیں

حوالہ شاعر:

پیشِ نظر شعر ناصر کاظمی کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔

مرکزی خیال:

محبوب کے دل کا حال جاننے کی طلب ہر عاشق کو ہوتی ہے۔

تشریح:

محبوب تغافل پسند ہے۔ وہ کبھی محبت کا جواب محبت سے نہیں دیتا۔ اس لئے اس کے عشاق ہمیشہ اس خلش میں مبتلا رہتے ہیں کہ محبوب کس کو چاہتا ہے۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ محبوب خود اس سے محبت کرتا ہے تو اطمینان ہو جائے اور اگر اس کے برعکس وہ کسی اور سے محبت کرتا ہے تو بھی طبیعت کو اطمینان آجائے۔ شاعر یہی کہتا ہے کہ آج تک ہمارے دل میں یہ خلش ہے کہ ہمارا محبوب کس کو چاہتا ہے۔

(۲)۔۔ شعر کا دوسرا مطلب بھی ہو سکتا ہے اگر "تجھے" کا مشارالیہ دل کو قرار دے دیا جائے یعنی تجھے دل کی طرف اشارہ ہے تو شعر کا مفہوم یہ ہو گا کہ دل میں آج بھی ہر وقت چبھن رہتی ہے۔ کانٹے کی طرح کوئی چیز کھٹکتی رہتی ہے اور لمحے بھر کو بھی سکون میسر نہیں آتا۔ آخر اے دل! تجھے کس کی طلب تھی کہ آج تک اس کی یاد کانٹا بن کر دل میں پیوست ہے۔ کیا تجھے یاد نہیں؟ اتنا انجان نہ بن، یہ چبھن تو خود غمازی کر رہی ہے کہ محبوب کی یاد آج بھی تجھ میں کھٹکتی ہے۔

مماثل شعر:

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

شعر نمبر ۳:

بھولتے جاتے ہیں ماضی کے دیار یاد آئیں بھی تو سب یاد نہیں

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر ناصر کاظمی کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔

مرکزی خیال:

ماضی کا ہر لمحہ خواب و خیال بن کر رہ گیا ہے۔

تشریح:

وقت اور حالات زندگی کے دھارے کو بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے ایک زمانہ گزر گیا۔ زندگی کے نرم و گرم سب دیکھ لئے۔ ہر نشیب و فراز سے گزر گئے۔ اب اس مقام پر آ گئے ہیں جہاں ماضی کا ہر لمحہ خواب و خیال بن کر رہ گیا ہے۔ ماضی میں کن حالات سے گزرے، کیسے کیسے نشیب و فراز سے سابقہ رہا، کون کون ہمارا رفیق رہا، کیسے کیسے دوستوں سے ہم صحبت رہے سب ایک خیال بن کر رہ گیا ہے۔ ایک افسانہ ہے جو کبھی ہم نے پڑھا تھا اب یاد نہیں۔ اگر اب یاد کرنے کی کوشش کرتے ہیں یا یاد آئے تو چند ایک واقعات ابھرتے ہیں، سب نہیں، کیوں کہ انھیں گزرے کافی وقت گزر چکا۔ غرض وقت کے ہاتھوں سارا افسانہ تمام ہو چکا ہے۔

مماثل شعر:

رشتہ ءِ جاں تھا کبھی جن کا خیال
ان کی صورت بھی تو اب یاد نہیں

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS BASIM
www.studypak.xyz

شعر نمبر۴:

ایسا اُلجھا ہوں غمِ دنیا میں   ایک بھی خوابِ طرب یاد نہیں

حوالۂ شاعر:

پیشِ نظر شعر ناصر کاظمی کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔

مرکزی خیال:

وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا۔

تشریح:

شاعر کہتا ہے کہ ایک زمانہ وہ تھا جب امنگیں تھیں، آرزوئیں تھیں اور اُن کی تسکین کا سامان بھی مہیا تھا۔ زندگی کے لمحات حسین سے حسین تر تھے اور ہم ان میں کھوئے ہوئے تھے۔ لیکن ایک زمانہ اب یہ آیا ہے جب ہم زندگی کے مسائل میں گھرے ہوئے ہیں۔ روز نت نئے مسائل سے سابقہ ہے۔ گویا یہ زندگی مسلسل غموں میں گھری ہوئی ہے۔ پیہم مصائب کا شکار ہے اور ہم اس میں ایسے الجھے ہوئے ہیں کہ خوشی کا کوئی لمحہ ہمیں یاد نہیں بلکہ خوشی کا تصور بھی ذہن میں نہیں رہا۔

مماثل شعر:

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
اب مگر نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

شعر نمبر۵:

یہ حقیقت ہے کہ احباب کو ہم   یاد ہی کب تھے جو اب یاد نہیں

حوالہ شاعر:

پیشِ نظر شعر ناصر کاظمی کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔

مرکزی خیال:

دوستوں میں جب اچھے وقتوں میں ہمیں یاد نہیں رکھا تو ان خراب حالات میں کیا یاد رکھیں گے۔

تشریح:

زمانہ کا عام مزاج یہ ہے کہ لوگ چڑھتے سورج کی پوجا کرتے ہیں۔ جب حالات اچھے ہوتے ہیں تو لوگ دوستی کا دم بھرتے ہیں۔ قریب سے قریب تر ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن جونہی حالات پلٹا کھاتے ہیں لوگ دور ہوتے چلے جاتے ہیں، ان کی ساری دوستی ساری چاہتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن شاعر کہتا ہے کہ ہمارا معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ ہماری اس وقت جو حالت بگڑی ہوئی ہے اس کے سبب سے دوستوں نے ہم سے بے تعلقی اور بے مروتی کا مظاہرہ کیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ دور بڑا ہی نازک ہے۔ اس دور میں وفا کی امید رکھنا بے کار بات ہے۔ ہمیں کبھی ہمارے احباب نے التفات کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ ہماری دوستی تو صرف رسمی تھی جس میں محبت سے زیادہ وقت اور حالات کو دخل ہوتا ہے۔ اس لئے شکوہ کرنا فضول ہے۔ انھیں جب ہمارے حالات اچھے تھے اس وقت کب ہمارا خیال تھا، اس وقت کب ان کا رویہ ہمارے ساتھ اچھا تھا جواب ہو گا؟

مماثل شعر:

وابستہ میری ذات سے کچھ تلخیاں بھی تھیں
اچھا کیا جو مجھ کو فراموش کر دیا

شعر نمبر۶:

رشتہ ءجاں تھا کبھی جن کا خیال اُن کی صورت بھی تو اب یاد نہیں

حوالہ شاعر:

پیشِ نظر شعر ناصر کاظمی کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔

مرکزی خیال:

وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا۔

تشریح:

وقت بڑا ظالم ہے۔ اس کے ہاتھ میں حالات کا کوڑا ہوتا ہے۔ جس سے وہ دھکیلتا رہتا ہے اور آدمی کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے ایسا ہی کچھ ہمارے ساتھ ہوا ہے۔ ایک وقت وہ تھا جب ہم ہمہ وقت محبوب کے خیال میں مستغرق رہتے تھے۔ اس کے تصور و خیال سے ہی ہماری زندگی کی سانسوں کا رشتہ تھا۔ لیکن وقت کی کارگزاری دیکھئے کہ اب بھی ہم وہی ہیں مگر ہمیں اس محبوب کی صورت بھی یاد نہیں جس کا خیال کبھی ہماری زندگی ہوا کرتا تھا۔

مماثل شعر:

بھولتے جاتے ہیں ماضی کے دیار
یاد آئیں بھی تو سب یاد نہیں

شعر نمبر۷:

یاد ہے سیر چراغاں ناصرؔ دل کے بجھنے کا سبب یاد نہیں

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS BASIM www.studypak.xyz

حوالہ شاعر:

پیشِ نظر شعر ناصر کاظمی کی ایک غزل سے ماخوذ ہے۔

تشریح:

ناصر کاظمی خود کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ اے ناصر! ہم میلہ چراغاں دیکھنے گئے۔ یہاں مسرت و شادمانی کا ماحول ہوتا ہے۔ وہاں کسی اجنبی کے حسن کو دیکھ کر ہم دنگ رہ گئے اور اس کے آگے ہمارے دل کا چراغ گل ہو گیا۔ ساری شادمانی اور مسرت رخصت ہو گئی لیکن وہ اجنبی کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ کہاں گیا؟ کچھ یاد نہیں۔ لیکن ہمارا دل اس کی اک جھلک کو اب بھی یاد کرتا ہے اور آج تک اس کی یاد سے دل بجھا بجھا سا رہتا ہے۔

☆......☆......☆

JOIN
FOR
MORE!!!
M.HARIS BASIM
www.studypak.xyz

اقتباس کی تشریح

JOIN FOR MORE!!!

طریقۂ جواب سوال نمبر۳

سوال نمبر۲: اقتباس کی تشریح

۱۰ نمبر کا یہ سوال نثر پارے کی تشریح کا ہے۔ اسے جانچنے کے لیے جزوار نمبر کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے

☆ مصنف اور سبق کا نام: ۲ نمبر

☆ اقتباس کی تشریح: ۶ نمبر

حوالے کا مواد: حوالے کے ۲ نمبر ہیں۔ یہاں یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ حوالے میں کتنا مواد ہونا چاہیے۔ مثلاً

(سبق ”رسم ورواج کی پابندی کے نقصانات“)

۱) مصنف اور سبق کا نام: ۲ نمبر، تشریح طلب اقتباس مضمون ”رسم ورواج کی پابندی کے نقصانات“ سے منتخب کیا گیا ہے جس کے مصنف سر سید احمد خان ہیں۔ جنھیں جدید اردو ادب کا بانی کہا جاتا ہے۔

چونکہ یہ جواب سوال کے عین مطابق ہے، اِس لیے پورے دو نمبروں کا مستحق ہے۔ اضافی معلومات دینے والوں کو بھی دو نمبر دیے جائیں گے۔

۲) تشریح: ۶ نمبر، نثر پارے کی تشریح کا مواد چند بنیادی نکات پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر اُن نکات کے تشریح ربط و تسلسل سے کر دی جائے تو طالب علم زیادہ نمبروں کا مستحق ہو جاتا ہے۔

اقتباس کی تشریح میں تین پیراگراف ہونے چاہئیں۔ پہلے میں سبق کا بنیادی نکتہ بیان کیا جائے، دوسرے میں منتخب اقتباس کی وضاحت اور تیسرے پیراگراف میں خاتمہ اور اختتام ہونا چاہیے۔

JOIN FOR MORE!!!

M.HARIS BASIM

www.studypak.xyz

جوابی خاکہ

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

(ب) اقتباس کی تشریح:

کراچی بورڈ کے منتخب کردہ اسباق، جن سے سالانہ امتحان میں اقتباس

مضامین

ماخذ	مصنف	مضمون
مقالات سرسید (جلد پنجم)	سر سید احمد خان	رسم ورواج کی پابندی کے نقصانات
مقالات شبلی	علامہ شبلی نعمانی	مسلمانوں کا قدیم طرزِ تعلیم
مقدمہ شعر و شاعری	مولانا الطاف حسین حالیؔ	روز مرہ اور محاورہ
نیرنگِ خیال	مولانا محمد حسین آزاد	سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ
رسالہ ہمایوں	میاں بشیر احمد	تشکیل پاکستان
----	ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن صدیقی	جدید سائنس اور عصری تقاضے

سفر نامہ

ماخذ	مصنف	مضمون
آوارہ گرد کی ڈائری	ابن انشاء	ایک شام ماضی کی محرابوں میں
دھنک پر قدم	بیگم اختر ریاض الدین	میکسیکو سٹی اور میں

خطوط

ماخذ	مکتوب اِلیہ	خط نگار
اردوئے معلّیٰ	میر مہدی مجروح	مرزا اسد اللہ خان غالب
اردوئے معلّیٰ	یوسف مرزا	مرزا اسد اللہ خان غالب
----	سید افتخار حسین	اکبر الٰہ آبادی
----	حبیب الرحمٰن شیروانی	اکبر الٰہ آبادی
----	مولوی انشاء اللہ خان	علامہ محمد اقبال

JOIN FOR MORE!!!

اقتباس کی تشریح

رسم ورواج کی پابندی کے نقصانات

تعارفِ مصنف:

جدید اردو ادب کے بانی سر سیّد احمد خان کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ کا شمار اردو ادب کے نامور نثر نگاروں میں ہوتا ہے۔ سر سیّد کا دائرۂ ادب نہایت وسیع ہے۔ مقصدیت، منطقیت، سلاست، اضطراب اور بے ساختگی وہ چند خصوصیات ہیں جو سر سیّد کی تحریر کے مطالعے کے بعد قاری کے ذہن میں نقش ہو جاتی ہیں۔ اردو زبان کے لئے آپ کی اَن گِنت خدمات ہیں اور اردو کی لامتناہی ترقی آپ ہی کی مرہونِ منت ہے۔

بقول مولوی عبدالحق:

"یہ سر سیّد ہی کا کارنامہ تھا جس کی بدولت ایک صدی کے قلیل عرصے میں اردو ادب کہیں کا کہیں پہنچ گیا۔"

تعارفِ سبق:

یہ مضمون رسم ورواج کی کورانہ تقلید کے نقصانات کو اُجاگر کرتا ہے۔ اِس میں اندھی تقلید کے مضمرات واضح طور پر بیان کئے گئے ہیں اور نہایت مؤثر انداز میں قوموں کے عروج وزوال کی وجہ بتائی ہے۔ سر سیّد نے استدلال اور منطق سے کام لیتے ہوئے اس نکتے کو پیش کیا ہے کہ بے جا رسم ورواج کی پابندی سے انسان کی تخلیقی صلاحیتیں ماند پڑ جاتی ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ فنا ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ قوموں سے ان کی آزادی اور ترقی چھین لیتی ہے۔

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS www.studypak.xyz

اقتباس(۱):

"انسان کی زندگی کا منشاء یہ ہے کہ اُس کے تمام قویٰ اور جذبات نہایت روشن اور شگفتہ ہوں اور ان میں باہم نامناسبت اور تناقص واقع نہ ہو بلکہ سب کامل کر ایک کامل اور نہایت متناسب مجموعہ ہو۔ مگر جس قوم میں پرانی رسم ورواج کی پابندی ہوتی ہے۔ یعنی ان رسموں پر نہ چلنے والا حقیر اور مطعون سمجھا جاتا ہے وہاں زندگی کا منشاء معدوم ہو جاتا ہے۔"

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت "رسم ورواج کی پابندی کے نقصانات" سے لی گئی ہے جس کے مصنف سر سید احمد خان ہیں۔ یہ مضمون سر سیّد کی کتاب "مقالاتِ سر سیّد" سے لیا گیا ہے۔

(ب) تشریح:

پیشِ نظر عبارت میں سر سید احمد خان رسم ورواج کے ایک اور نقصان کی طرف نشاندہی کرتے ہیں اور اپنی بات مضبوط کرتے ہیں کہ رسومات کی اندھیر نگری میں گڑھوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ وہ انسانی فطرت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان کامیاب وکامران اُس وقت ہوتا ہے اور زندگی کا مقصد صرف اس وقت حاصل کرتا ہے جب اُس کی شخصیت میں استحکام آجائے۔ استحکام سے مراد یہ ہے کہ زندگی کی تمام سرگرمیاں، تمام افعال، عبادات، اخلاقیات اور سماجیات ایک پختہ سوچ پر انحصار کریں اور اسی سوچ کو بنیاد بنا کر جانبِ منزل قدم بڑھائیں۔ ذہنی طور پر منتشر افراد کبھی بھی اپنی توانائیاں اور اپنا وقت صحیح طور پر استعمال نہیں کرتے اور جسم وروح کے اعضاء کی حق تلفی کرتے ہیں۔ ایک

مکمل، مناسب اور پر سکون زندگی اور کردار کی تعمیر کے لئے ضروری ہے کہ ہر موضوعِ فکر میں مناسبت اختیار کی جائے اور اعتدال کا خاص خیال رکھا جائے۔ مصنف کہتے ہیں کہ میانہ روی کی راہ پر چلنا صرف اس وقت ممکن ہے جب کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کے غیر ضروری قوانین و رواجات سے انحراف کریں اور اپنی توانائیاں صحیح مقاصد کے لئے وقف کریں۔ ایسے معاشرے میں جہاں رسومات کو بلا ضرورت اہمیت دی جاتی ہے وہاں ایک مستحکم کردار کی تعمیر ممکن نہیں۔ سب سے بڑی رکاوٹ جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر ان اصولوں پر عمل نہ کیا جائے اور اپنی سہولیت سے مطابقت رکھتے ہوئے زندگی گزاری جائے تو ہر طرف سے مخالفت کی آواز بلند ہوتی ہے اور حقارت اور ذلالت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ان معاشروں میں عزت و معیار کا پیمانہ اس امر کو سمجھا جاتا ہے کہ کون کس حد تک ان رسومات کا پابند ہے۔ ایسے معاشرے میں زندگی کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اور تمام افراد زمانے کی گہری دُھند میں ہمیشہ کے لئے گم ہو جاتے ہیں۔

اقتباس(۲):

”بے سوچے اور بے سمجھے رُسومات کی پابندی کرنے سے گو وہ رسمیں اچھی ہی کیوں نہ ہوں، آدمی کی ان صفتوں کی ترقی اور شگفتگی نہیں ہوتی جو خدا تعالیٰ نے ہر آدمی کو جدا جدا عنایت کی ہیں۔“

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت ”رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات“ سے لی گئی ہے جس کے مصنف سر سید احمد خان ہیں۔ یہ مضمون سر سیّد کی کتاب ”مقالاتِ سر سیّد“ سے لیا گیا ہے۔

(ب) تشریح:

اس اقتباس میں سر سید احمد خان رسم و رواج کی پابندی کو سختی سے ممنوع قرار دے رہے ہیں۔ سر سید کہتے ہیں کہ رسمیں اگر خراب ہوں تب تو ان کی پابندی کرنا واضح طور پر غلط ہے لیکن اگر رسم بظاہر ٹھیک اور درست بھی ہو تب بھی اس کی پابندی میں کوئی اور نقصان ہو نہ ہو ایک نقصان ضرور ہے۔ وہ نقصان یہ ہے کہ اللہ بزرگ و برتر نے ہر انسان کو جدا جدا صلاحیتوں اور صفات سے نوازا ہے۔ ان صفات میں ترقی اسی وقت ممکن ہے جب ان کا استعمال کیا جائے۔ رسم کی پابندی کی صورت میں انسان اپنی ان مخصوص صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لاتا جس کی وجہ سے ان میں شگفتگی نہیں آتی۔

معلوم ہوا کہ جس رسم کی پابندی کی جا رہی ہے اس میں کوئی اور نقصان اور خرابی نہ ہو تب بھی یہ نقصان ضرور ہے کہ انسان کی ذاتی صلاحیتیں مردہ ہو جاتی ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہئے کہ اپنی صلاحیتوں کا استعمال کرے اور رسم کے پابندی نہ کرے۔

اقتباس نمبر(۳):

”اخلاقی اور عقلی قوتوں کی ترقی اس صورت میں حاصل ہوتی ہے جب کہ وہ استعمال میں لائی جاویں۔ ان قوتوں کو اوروں کی تقلید کرنے سے کسی بات کی مشق حاصل نہیں ہوتی بلکہ ایسے شخص کے لیے بجُز ایسی قوت تقلید کے جو بندر میں ہوتی ہے اور کسی قوت کی حاجت نہیں۔“

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت ”رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات“ سے لی گئی ہے جس کے مصنف سر سید احمد خان ہیں۔ یہ مضمون سر سیّد کی کتاب ”مقالاتِ سر سیّد“ سے لیا گیا ہے۔

(ب) تشریح:

اس اقتباس میں سر سید احمد خان عقل کی اہمیت اور اخلاق و کردار میں ترقی پانے کے طریقے سمجھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے میری قوم اگر تم ہر میدان میں ترقی حاصل کرنا چاہتے ہو تو اللہ تعالیٰ کی نعمت عقل کو استعمال کرو۔ عقل کے استعمال کرنے ہی سے تمہارے مسائل حل

ہوسکتے ہیں۔ جو شخص عقل کا استعمال نہیں کرتا ہے اس کا اخلاق و کردار بھی ستھرا نہیں ہو سکتا ہے۔ لہذا تم اخلاقی ترقی کرنا چاہتے ہو تو بھی عقل کا استعمال کرو۔ اس کے برعکس رسم و رواج اپنانے سے عقل و دانش، علم و عمل میں ترقی نہیں ہو سکتی ہے۔ عقل و دانش کا استعمال نہ کرنا، اپنے اخلاق و کردار کو نہ سنوارنا، علم و عمل میں ترقی نہ کرنا یہ صفات و عادات تو جانوروں میں ہوتی ہے۔ تم تو اشراف المخلوقات ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تمھیں انسان بنایا ہے۔ جانور اور انسان میں بنیادی فرق ہی عقل ہے۔ اے میری پس ماندہ قوم اپنی عقل کو کام میں لاؤ۔ ورنہ تم میں اور بندر میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ جانوروں میں بندر وہ جانور ہے جو نقل اتارنے میں ماہر ہوتا ہے۔ بندر کی حرکات و سکنات میں نقل ہی ہوتی ہے۔ مداری (یعنی بندر کا مالک) بندر کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اور بندر مداری کے مطابق ہی عمل کرتا ہے اور بے وقوف بنتا رہتا ہے۔ مگر اے میری قوم تم ایسا بالکل نہ کرنا۔

اقتباس(۴):

”جو امر کہ پسندیدہ اور تسلیم کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ لوگ اپنی عقل سے کام لیں اور رسم و رواج کی پابندی بھی ایک معقول طور پر رکھیں، یعنی جو عمدہ و مفید ہیں ان کو اختیار کریں، جو قابل اصلاح ہوں ان میں ترمیم کریں اور جو بری اور خراب ہوں ان کی پابندی چھوڑ دیں۔ نہ یہ کہ اندھوں کی طرح یا ایک کل کی مانند ہمیشہ اسی سے لپٹے رہیں۔“

JOIN FOR MORE!!!

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت ”رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات“ سے لی گئی ہے جس کے مصنف سر سید احمد خان ہیں۔ یہ مضمون سر سیّد کی کتاب ”مقالاتِ سر سیّد“ سے لیا گیا ہے۔

(ب) تشریح:

وضاحت طلب اقتباس کو سر سید احمد کی اس تحریر کا نچوڑ یا مرکزی خیال کہا جا سکتا ہے۔ اس اقتباس میں وہ ایسے لوگوں سے سمجھوتہ کرتے نظر آتے ہیں جو رسم و رواج کی پابندی کیے بنا رہ ہی نہیں سکتے۔ دراصل سر سید ایسے افراد کو رسم و رواج کی پابندی کرنے کا اصول اور ضابطہ سکھانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ سر سید وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رسم تین طرح کی ہوتی ہے:

۱) عمدہ و مفید...... انھیں اختیار کر لیا جائے۔

۲) قابل اصلاح (یعنی کسی قدر ٹھیک اور کسی قدر خراب)...... ان میں ترمیم یعنی تبدیلی کر کے انھیں اپنا لیا جائے۔

۳) بری اور خراب...... انھیں ترک کر دیا جائے۔

M.HARIS.BASIM www.classnotes.xyz

سر سید کہتے ہیں کہ پہلی قسم کی جو رسومات ہیں ان پر عمل پیرا ہونے میں کوئی مضایقہ نہیں، دوسری قسم کی رسومات پر عمل کرنے سے پہلے ان میں ترمیم کرنا ضروری ہے یعنی پہلے رسم کے قابل مذمت پہلو کو تبدیل کر کے درست بنایا جائے پھر اس پر عمل کیا جائے۔ اور تیسری قسم کی رسومات چونکہ بری اور خراب ہیں اس لئے ان کو ترک کر دیا جائے۔

مقصد یہ ہے کہ اندھوں کی طرح رسم کی پابندی نہ کی جائے، پہلے اپنی عقل و فہم سے اس کی جانچ پڑتال کی جائے پھر جو رسم قابل عمل معلوم ہو اس پر عمل کیا جائے اور جو رسم قابل عمل نہ ہو اس کو ترک کر دیا جائے۔

اقتباس(۵):

”یہ بات خیال کی جاتی ہے کہ رسومات کی پابندی نہ کرنے سے آدمی خراب کاموں اور بری باتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، مگر یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ انسان کی ذات میں جیسے کہ خراب کام کرنے کی قوتیں اور جذبے ہیں ویسے ہی ان کے روکنے کی بھی قوتیں اور جذبے ہیں۔ مثلاً ایمان یا نیکی جو ہر انسان کے دل میں ہے۔ پس خراب کام ہونے کا یہ باعث نہیں ہے کہ اس نے رسومات کی پابندی

نہیں کہ بلکہ یہ باعث ہے کہ اس نے ایک قسم کی قوتوں اور جذبوں کو شگفتہ اور شاداب اور قوی کیا ہے۔ اور دوسری قوم کی قوتوں اور جذبوں کو پژمردہ اور ضعیف۔"

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت "رسم ورواج کی پابندی کے نقصانات" سے لی گئی ہے جس کے مصنف سر سید احمد خان ہیں۔ یہ مضمون سر سیّد کی کتاب "مقالاتِ سر سیّد" سے لیا گیا ہے۔

(ب) تشریح:

سر سید احمد خان اپنے اس اصلاحی سبق میں رسم ورواج کی پابندی کے نقصانات بیان کر رہے ہیں۔ اس اقتباس میں وہ کہتے ہیں کہ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ رسم ورواج پر عمل نہ کیا جائے تو انسان خرابیوں اور برائیوں کو اپنانے لگتا ہے اور بے ایمان ہو جاتا ہے۔ سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ ایسا سمجھنا غلط ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو فطری طور پر نیکی اور بدی پر چلنے کی مساوی قوتیں اور صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ اب یہ انسان کے اوپر موقوف ہے کہ وہ نیکی کی قوتوں کو پروان چڑھاتا ہے یا بدی کی۔ وہ چاہے تو اپنی تمام تر صلاحیتیں نیکی پر لگا کر دنیا و آخرت کی کامیابی حاصل کر سکتا ہے اور اسی طرح اگر وہ چاہے تو اپنی قوتوں کے غلط استعمال سے بدی کے راستے پر چل سکتا ہے۔

لہٰذا انسان کے اچھے یا برے ہونے کا دار و مدار اس بات پر نہیں کہ اس نے رسم کی پابندی کی یا نہیں کی، بلکہ اس کا مدار اس بات پر ہے کہ اس نے اپنی خراب صلاحیتوں کا استعمال کیا یا بری صلاحیتوں کا سہارا لیا۔ انسان چاہے تو رسم کی پابندی کر کے بھی نیکی سے دور ہو سکتا ہے اور چاہے تو رسم کی پابندی کے بنا بھی نیکی حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص نیکی سے دور رہا تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس نے رسم کی پابندی چھوڑ دی بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنی بری صلاحیتوں کا استعمال کیا اور نیکی کی صلاحیتوں کو چھوڑ دیا۔

اقتباس(٦):

"رسومات جو مقرر ہوئیں ہیں غالباً اس زمانہ میں جبکہ وہ مقرر ہوئیں مفید تصور کی گئی ہوں مگر اس بات پر بھروسا کرنا کہ درحقیقت وہ ایسی ہی تھیں محض غلطی ہے۔ ممکن ہے کہ جن لوگوں نے ان کو مقرر کیا ان کی رائے میں غلطی ہو، اور ان کا تجربہ صحیح نہ ہو۔ ان کا تجربہ نہایت محدود اور صرف چند اشخاص سے متعلق ہو یا اس تجربہ کا حال صحیح بیان نہ ہوا ہو۔"

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت "رسم ورواج کی پابندی کے نقصانات" سے لی گئی ہے جس کے مصنف سر سید احمد خان ہیں۔ یہ مضمون سر سیّد کی کتاب "مقالاتِ سر سیّد" سے لیا گیا ہے۔

(ب) تشریح:

سر سید احمد خان اپنے اس اصلاحی سبق میں رسم ورواج کی پابندی کے نقصانات بیان کر رہے ہیں۔ رسم کی اندھی تقلید میں تین چار خرابیاں ممکن ہیں جن کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ رسم ورواج پرانے زمانے سے چلے آتے ہیں۔ اکثر یہ صدیوں سال پرانے ہوتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ اس پرانے زمانے کے لوگوں نے اس رسم کو اپنے لیے درست خیال کیا ہو اور یہ اس زمانے کے لحاظ سے درست بھی مگر آج کے دور کے مطابق نہ ہو۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ پہلے اس کی جانچ پڑتال کی جائے پھر مفید ہونے کی صورت میں اسے اپنایا جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ممکن ہے کہ قدیم دور کے لوگوں کا یہ عمل صحیح نہ ہو اور وہ اسے صحیح سمجھ رہے ہوں یعنی وہ اپنے خیال میں ٹھیک کر رہے ہوں لیکن حقیقتاً وہ غلط ہوں اور انھیں اپنی غلطی کا احساس نہ ہو یا ان میں اتنی سمجھ نہ ہو کہ وہ اپنی غلطی کا ادراک کر سکیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ ممکن ہے کہ قدیم دور میں معاشرت کا دار و مدار چند مخصوص افراد کی مرضی پر منحصر ہو اور ان گنتی کے افراد کا تجربہ ناقص اور نامکمل ہو۔ ان تمام وجوہات کی بنا پر اگر قدیم زمانے میں رسم ورواج اچھے اور فائدہ مند رہے بھی ہوں مگر موجودہ دور میں یہ مضر

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS

اور نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہیں لہٰذا ان پر بے سوچے سمجھے سختی سے قائم رہنا اور لوگوں کو زبردستی مجبور کرنا کسی بھی صورت درست نہیں۔ بلا غور و فکر کیے ایسے نقصان دہ رسم و رواج پر عمل کرنے سے انسان کی عقل و فہم پر زنگ لگ جاتا ہے اور تخلیقی رجحانات ختم ہونے لگتے ہیں۔

اقتباس(۷):

”رسم کی پابندی ہر جگہ انسان کی ترقی کی مانع و مزاحم ہے۔ چنانچہ وہ پابندی ایسی قوتِ طبعی کے جس کے ذریعے سے بہ نسبت معمولی باتوں کے کوئی بہتر بات کرنے کا قصد کیا جاوے، برابر مخالف رہتی ہے اور انسان کی تنزُّل حالت کا اصلی باعث ہوتی ہے۔“

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت ”رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات“ سے لی گئی ہے جس کے مصنف سر سید احمد خان ہیں۔ یہ مضمون سر سیّد کی کتاب ”مقالاتِ سر سیّد“ سے لیا گیا ہے۔

(ب) تشریح:

سر سید احمد خان اپنے اس اصلاحی سبق میں رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات بیان کر رہے ہیں۔ سر سید احمد خان نے رسم و رواج کی اندھی تقلید کو برا کہا ہے۔ اس اقتباس میں وہ بڑے مُدلّل انداز میں رسم کی پابندی کی مذمت کرتے ہوئے ایک قاعدہ کلّیہ بیان کر رہے ہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ

”جہاں رسم کی پابندی ہو گی وہاں ترقی نہیں ہو گی اور جہاں ترقی ہو گی وہاں رسم کی پابندی نہیں ہو گی“

یعنی جس معاشرے میں رسم کی پابندی ہوتی ہے وہ معاشرہ کبھی ترقی نہیں کر سکتا، اس لیے کہ ترقی اور رسم کی پابندی آپس میں ایک دوسرے کے متضاد ہیں کیونکہ رسم کی پابندی کا مطلب ہے نئی کوئی بات ایجاد نہ کی جائے صرف پرانی رسموں کو اپنایا جائے۔ جبکہ ترقی کا مطلب یہ ہے کہ نئی سے نئی باتیں ایجاد کی جائیں۔ ظاہر ہے کہ دونوں کا ایک ساتھ جمع ہونا محال ہے۔

سر سید احمد کے خیال میں جو قومیں ترقی یافتہ ہیں ان کی ترقی کا راز یہی ہے کہ انھوں نے رسم و رواج کو ترک کر دیا ہے اور اپنے ماحول اور ضرورتوں کے مطابق اپنے طریقے خود ایجاد کئے ہیں۔ اسی طرح پسماندہ قوموں کے زوال کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ رسم و رواج کے دائرے سے باہر نکل کر سوچنے کو تیار نہیں ہیں۔ انھوں نے وقت اور زمانے کے تقاضوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ وہ زوال کا شکار ہیں۔ کیونکہ رسم کی پابندی سے انسان کی صلاحیتیں اور خوبیاں دب جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے معاشرے میں فکری جمود طاری ہو جاتا ہے اور اس حالت میں مسلسل رہنے سے آخر کار نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسی قوم کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ مختصراً یہ کہ قوتِ فکر کی آزادی انسان کو ترقی کی طرف اور رسم و رواج کی غلامی اسے زوال کی طرف لے جاتی ہے۔

آدمی میں گر نہیں عقل و ہنر، علم و ادب   جانور سے بھی برا ہے ویسے انساں ہو تو کیا

اقتباس نمبر(۸):

”ان مشرقی یا ایشیائی قوموں میں بھی کسی زمانہ میں قوتِ عقل اور جودتِ طبع اور مادۂ ایجاد ضرور موجود ہو گا جس کی بدولت وہ باتیں ایجاد ہوئیں جو اب رسمیں ہیں اس لیے کہ ان کے بزرگ ماں کے پیٹ سے تربیت یافتہ اور حسن معاشرت کے فنون سے واقف پیدا نہیں ہوئے تھے۔“

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت ”رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات“ سے لی گئی ہے جس کے مصنف سر سید احمد خان ہیں۔ یہ مضمون سر سیّد کی کتاب ”مقالاتِ سر سیّد“ سے لیا گیا ہے۔

(ب) تشریح:

اس اقتباس میں سر سید احمد خان اپنی قوم کے معزز بزرگوں کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے میرے ہم وطنو! ذرا غور و فکر تو کرو،

اپنا ماضی تو دیکھو! آج تم جن رسموں پر عمل پیرا ہو کبھی تم نے غور بھی کیا یہ بھی تو کسی نے ایجاد کی ہوں گی۔ان رسموں ہی سے ہمیں معلوم ہو تا ہے کہ ہمارے بزرگ، معزز افراد اپنی عقل و دانش کو استعمال کرتے تھے۔ان میں تخلیقی صلاحیتیں موجود تھیں۔وہ نئی نئی فائدہ مند چیزیں اپنی قوم کے عام لوگوں کو عطا فرماتے تھے۔اس کے بعد سر سید عقلی دلیل سے سمجھاتے ہوئے کہتے ہیں ہمارے بزرگ اپنی ماں کے پیٹ سے سیکھ کر نہیں آئے تھے۔ پھر سر سید ترقی کے بنیادی نکات بتاتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ جہد مسلسل یعنی کوشش اور محنت، غور و فکر یعنی اپنی عقل کا استعمال کر کے نئی نئی مفید باتیں ایجاد کرنے ہی سے دنیا و آخرت میں ترقی حاصل کی جا سکتی ہے۔

آدمی میں گر نہ ہو عقل و ہنر علم و ادب
ہے وہ چوپائے سے بدتر گر بشر کہنے کو ہے

اقتباس(۹):

"تواریخ سے ثابت ہے کہ ایک قوم کسی قدر عرصے تک ترقی کی حالت پر رہتی ہے اور اس کے بعد ترقی مسدود ہو جاتی ہے۔ مگر یہ دیکھنا چاہئے کہ یہ ترقی کب مسدود ہوتی ہے۔یہ اس وقت مسدود ہوتی ہے جب کہ اس قوم میں سے وہ قوت اٹھ جاتی ہے جس کے سبب سے نئی نئی باتیں پیدا ہوتی ہیں۔"

JOIN FOR MORE!!!

(الف)مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت "رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات" سے لی گئی ہے جس کے مصنف سر سید احمد خان ہیں۔یہ مضمون سر سیّد کی کتاب "مقالاتِ سر سیّد" سے لیا گیا ہے۔

(ب) تشریح:

تشریح طلب عبارت میں مصنف منطق اور استدلال سے کام لیتے ہوئے امّتِ مسلمہ کی وجہ زوال کو بیان کر رہے ہیں۔ مصنف دنیا کی تواریخ کو ایک مضبوط دلیل کے طور پر استعمال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ گزرے ہوئے ادوار اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ جس قوم نے بھی ترقی کی، وہ اُس عرصے تک قائم رکھی ہے جب تک اُس نے ایک متمدن اور مہذب معاشرہ قائم رکھا ہے۔اس دور کے بعد اقوام آہستہ آہستہ پستی کے گڑھے میں گر جاتی ہیں اور اُن کی عوام سے نظم اور حکومت سے استحکام عار ہو جاتا ہے۔ مصنف تمام فہم و فراست اور عقل و دانش رکھنے والے اذہان کو مخاطب کرتے ہیں اور اُن کی سوچ اس جانب گامزن کرتے ہیں کہ کس وجہ سے یہ ترقی رکی؟ کیسے یہ رکاوٹیں کھڑی ہوئیں؟ اور کیوں کر اس قوم کا طریقہ کار تبدیل ہوا؟ وہ اپنے مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں اپنا نظریہ پیش کرتے ہیں کہ قوموں کی تنزلی کی ابتداء اس وقت شروع ہوتی ہے جب اِس قوم کے افراد رسم و رواج کی اندھی تقلید شروع کر دیتے ہیں اور بلا سوچے سمجھے ان اصول و ضوابط کو اپنی زندگیوں میں شامل کر لیتے ہیں۔ اخلاقی اقدار میں اِن قوانین کی شمولیت معاشرے پر بہت گہرے اثرات مرتب کرتی ہے اور ذہین سے ذہین سوچیں ان رسومات کی نظر ہو جاتی ہیں۔ آخر کار ان انسانوں میں سے وہ مادہ اٹھ جاتا ہے جس کی بدولت تفکر ان کے دائرے وسیع ہوتے ہیں، فکر کی موجیں ابھرتی ہیں اور شعور کی کرنیں پھیلتی ہیں اور یہ معاشرہ تیز رفتار دنیا کے ہمقدم ہونے کے بجائے رسم و رواج کے منجدھار میں ہمیشہ کے لئے پھنس جاتا ہے۔ سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ عہدِ حاضر میں ملّتِ اسلامیہ کا بالکل یہی حال ہے اور اُن کی شاہانہ حکومت کے زوال کی وجہ رسومات کی کورانہ پیروی ہے۔

جہانِ تازہ کی، افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

مسلمانوں کا قدیم طرزِ تعلیم

تعارفِ مصنف:

شبلی نعمانی عظیم شاعر، مذہبی اسکالر، محقق، تنقید نگار، سوانح نگار اور اعلی پائے کے انشاء پرداز ہیں۔ وہ اردو کے ارکانِ خمسہ میں سے سرسید کی قومی بھلائی کی تحریک کے پرجوش حامی اور عمدہ خطیب و بے باک صحافی تھے۔ مہدی افادی فرماتے ہیں:

میرا بس چلے تو میں شبلی کو ہندوستان سے باہر یورپ کے کسی بیت الحکماء میں بھیج دوں جہاں ان کو غیر معمولی قابلیت کی داد بڑے بڑے علمائے مستشرقین سے ملے گی جو بلحاظ ہمہ فنی ان کے یارانِ طریقت ہیں۔

اقتباس(۱):

"۱۴۵ھ تک یعنی جب تک تصنیف و تالیف نہیں شروع ہوئی تھی جو تعلم و تعلیم تھی وہ عرب کے سادہ اور نیچرل طرزِ زندگی کے لئے موزوں تھی۔ علوم وہ تھے جن کو حافظہ سے زیادہ تر تعلق تھا۔ بحث طلب مسائل معمولی فہم کی دسترس سے باہر نہ تھے اور طرزِ تعلیم تو بالکل وہی تھا (سند و روایت) جو قدیم زمانے سے ان میں رائج تھا۔"

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت "مسلمانوں کا قدیم طرزِ تعلیم" سے لی گئی ہے جس کے مصنف فلسفی مؤرّخ علامہ شبلی نعمانی ہیں۔ یہ مضمون علامہ شبلی کی کتاب "مقالاتِ شبلی" سے لیا گیا ہے۔

(ب) تشریح:

شبلی نعمانی کہتے ہیں کہ ۱۴۵ھ تک علم کو باقاعدہ کتابت و اشاعت اور ضابطہ تحریر میں لاکر محفوظ کر کے لوگوں تک منتقل کرنے کا رواج نہ ہو پایا تھا اس لئے علم کو ذہن در ذہن ہی منتقل کیا جاتا تھا۔ عرب خصوصاً مسلمانوں میں تعلیم و تدریس کا جو قاعدہ رائج تھا وہ فطری تھا۔ ماحول کی مناسبت سے سیدھا سادھا طریقہ تدریس قائم تھا جس میں حافظے کا مکمل عمل دخل تھا۔ یادداشت کی قوت کو بروئے کار لاکر علم ایک ذہن سے دوسرے ذہن منتقل کیا جاتا تھا۔ ہر بات پر گفتگو، بحث و مباحثہ، ہر پہلو پر غور و فکر اور روشن و تاریک پہلوؤں کو اجاگر کرنا ہر خاص و عام کی عادت تھی۔

غرض یہ کہ ۱۴۵ھ کے آخر تک طرزِ تعلیم اسی قدیم طرز و انداز کا حامل تھا جو گزشتہ زمانہ میں رائج تھا۔ جس میں ان حکماء، مفکرین اور اہلِ دانش کے اقوال و بیانات کو موضوع بنایا جاتا جو دلائل کے ساتھ قابلِ قبول رہے ہوں۔

اقتباس نمبر(۲):

"دیکھو ٹیگس سے دریائے سندھ کے کنارے تک اسلام حکومت کر رہا ہے۔ حجازی فتوحات کا سیلاب اب رک چلا ہے۔ مفتوحہ ممالک میں امن و انتظام کا عمل ہوتا جاتا ہے۔ سیکڑوں قبیلے ریگستانِ عرب سے نکل کر دور دراز ملکوں میں آباد ہوتے جاتے ہیں۔ بہت سی نئی قومیں دلی ذوق سے اسلام کے حلقے میں داخل ہو رہی ہیں۔"

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت "مسلمانوں کا قدیم طرزِ تعلیم" سے لی گئی ہے جس کے مصنف فلسفی مؤرّخ علامہ شبلی نعمانی ہیں۔ یہ مضمون علامہ شبلی کی کتاب "مقالاتِ شبلی" سے لیا گیا ہے۔

(ب) تشریح:

اس اقتباس میں مصنف شبلی نعمانی مسلمانوں کے دوسرے دور کا ذکر کرتے ہیں کہ اس دور پر نظر ڈالنے سے حیرت و تعجب ہوتا ہے کہ

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS

اسلام دنیامیں تیزی سے پھیل رہاہے۔ دریائے ٹیگس (یعنی اسپین) سے دریائے سندھ تک مسلمانوں کی افواج متعدد ممالک پر فتوحات کے بعد اب فتوحات اور کامیابیوں کا سلسلہ رک چکاہے۔ اسلامی قوانین امن وامان کا سبب بن جاتے ہیں۔ سرزمینِ عرب کے بے شمار قبیلے اپنے علاقوں سے نکل کر دور دراز فتح کیے ہوئے ممالک میں آباد ہوتے جاتے ہیں۔ تاکہ اسلام کا نور دنیا کے گوشے گوشے میں منور کیاجاسکے۔ کفروشرک میں مبتلا لوگوں کے دلوں کو توحید ورسالت کی روشنی سے جگمگانے کی کوشش کی جائے۔ اسی اصلاحی کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ شکست یافتہ قومیں اسلام کے اچھے اثرات قبول کرتے ہوئے دائرۂ اسلام میں خوشی خوشی اپنے دلی ذوق وشوق سے داخل ہونے لگی ہیں۔ شبلی نعمانی اس اقتباس میں اس غلط فہمی کو بھی دُور کرتے ہوئے بتارہے ہیں کہ اسلام بزورِ تلوار نہیں بلکہ مسلمانوں کے اچھے اخلاق کی بدولت پھیلاہے۔

اقتباس(۳):

"عام تعلیم کے لئے ہزاروں مکتب قائم ہیں جن میں سلطنت کا کچھ حصہ نہیں ہے اور جو آجکل کے تحصیلی مدارس سے زیادہ مفید اور فیاض ہیں' اوسط اور اعلیٰ تعلیم کے لئے مسجدوں کے صحن' خانقاہوں کے حجرے' علماء کے ذاتی مکانات ہیں۔ لیکن ان سادہ اور بے تکلف عمارتوں میں جس وسعت اور فیاضی کے ساتھ علم کی تربیت ہو رہی تھی' بڑے بڑے عالیشان قصر و ایوان میں بھی جو پانچویں صدی کے آغاز میں اس غرض سے تعمیر ہوئے' اس سے کچھ زیادہ نہ ہو سکی۔"

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت "مسلمانوں کا قدیم طرزِ تعلیم" سے لی گئی ہے جس کے مصنف فلسفی مؤرّخ علامہ شبلی نعمانی ہیں۔ یہ مضمون علامہ شبلی کی کتاب "مقالاتِ شبلی" سے لیا گیا ہے۔

(ب) تشریح:

پیشِ نظر سطور میں شبلی کہتے ہیں کہ سرکاری طور پر سرپرستی نہ ہونے کے باوجود مسلمانوں کی انفرادی کوششوں اور توجہ سے ہر اس جگہ علمی ترقی ہوئی جہاں مسلمان حکومتیں تھیں۔ شہر شہر' گاؤں گاؤں' گلی گلی' کوچہ کوچہ علم کا چرچا تھا۔ عوام و خاص علم کے فروغ اور حصول میں دلچسپی لیتے تھے۔ ہزاروں چھوٹے بڑے مدرسے اور درسگاہیں قائم تھیں۔ ان درسگاہوں کو حکومتی سطح پر امداد و اعانت اور سرپرستی حاصل نہ ہونے کے باوجود ان میں علم کو فروغ حاصل ہوا اور تحصیلِ علم کا موثر نظام قائم ہوا بے شمار لوگوں نے ان سے علمی پیاس بجھائی۔ ان سے علم حاصل کرنے والے' دورِ حاضر کے اداروں سے فارغ التحصیل طلبہ کے مقابلے میں زیادہ اہل اور بہتر عالم ٹھہرے جنہوں نے دنیا کے میدان میں اپنا لوہا منوایا۔ بڑی بڑی عالی شان عمارتوں کے بجائے اس دور میں علمی مساجد کے صحن، اولیاء کی خانقاہیں اور علماء کے سیدھے سادھے آرائش و زیبائش سے بے نیاز ذاتی مکانات تھے۔ لیکن ان سادہ اور بے تکلف مکینوں سے علم کے وسیع و عریض دریا جاری ہوئے جن سے متعدد لوگوں کو علمی سیرابی ہوئی۔ سچ ہے کہ پانچویں صدی کے آغاز میں اس مقصد کے حصول کیلئے تعمیر ہونے والی عالیشان اور بلند و بالا عمارات' محلات اور درسگاہوں نے کوئی قابلِ ذکر علمی کارنامہ انجام نہ دیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فروغِ علم کے لئے عمارت کا بلند و بالا ہونا ہی کافی نہیں بلکہ طریقہ تدریس کے مؤثر نظام کا بڑا دخل ہے۔

اقتباس(۴):

"اگرچہ متواتر انقلابات' تخت گاہوں کی بربادی' اسپین کی تباہی' تاتار کی عام غارت گری کے بعد ہمارے پاس جو کچھ رہ گیا ہے وہ ہزار میں ایک بھی نہیں ہے اور اس وجہ سے ہزاروں لاکھوں ناموروں کی صورتیں زمانے کی تاریخی نگاہ سے چھپ گئی ہیں۔ تاہم ہر عہد میں ہم سینکڑوں ماہرین و مجتہدینِ فن کا نشان دے سکتے ہیں۔"

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت "مسلمانوں کا قدیم طرزِ تعلیم" سے لی گئی ہے جس کے مصنف فلسفی مؤرّخ علامہ شبلی نعمانی ہیں۔ یہ مضمون علامہ شبلی

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS

کی کتاب "مقالاتِ شبلی" سے لیا گیا ہے۔

(ب) تشریح:

اس اقتباس میں علامہ شبلی نعمانی نے صنف تلمیح کا استعمال کرتے ہوئے مسلمانوں پر گذرنے والے چار عظیم المیوں کا ذکر کیا ہے:

(ا) متواتر انقلابات: یعنی اندرونی غداریاں جن کے ذریعے مسلمانوں کی حکومت کو مستحکم نہیں رہنے دیا گیا۔

(۲) تخت گاہوں کی بربادی: اندرونی انقلابات کے علاوہ بیرونی حملے بھی مسلمانوں کو تباہ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

(۳) اسپین کی تباہی: اسپین مسلمانوں کا بہت بڑا علمی مرکز تھا جسے سازش کے تحت تباہ کر دیا گیا۔

(۴) تاتار کی عام غارت گری: تاتار ایک وحشی قبیلہ جس نے مسلمانوں کو سفاکی سے قتل کیا۔

شبلی کہتے ہیں کہ ان چار المناک حادثوں کے باوجود مسلمانوں کا دوسرا دور علمی ترقی و اشاعت کا زریں دور تھا۔ حالانکہ اس دور کا کوئی ریکارڈ نہیں کیونکہ سب کچھ تاتار کے ہاتھوں یا انقلابِ زمانہ کی کرشمہ سازیوں کی نظر ہو گیا۔ جس کی وجہ سے کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے اور نہ ہی بتایا جاسکتا ہے کتنے فیصد لوگ علم سے بہرہ ور ہوئے اور کتنے فیصد لوگوں نے علمی کارنامے انجام دیے البتہ بے شمار تصانیف اور تواریخ کے حوالوں سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

بد قسمتی سے مسلمان حکومتیں گاہے بہ گاہے مختلف حملہ آوروں کی زد میں رہی ہیں؛ کبھی تاتاریوں کی تباہ کاریوں سے دوچار ہوئیں کبھی انھیں اپنوں کی ریشہ دوانیوں نے نقصان پہنچایا۔ کبھی بیرونی جارحیتوں نے ان سلطنتوں اور علمی مراکز کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور تمام ذخائرِ علمی کو تباہ وبرباد اور ملیامیٹ کر دیا۔ جس کی وجہ سے بے شمار علمی شخصیات کے نام اور کارنامے دنیا کی نظروں سے اوجھل ہوئے جو کچھ ہم تک پہنچ سکا وہ ہزارواں حصہ بھی نہ تھا۔ اس طرح ہم اپنے تہذیبی ورثہ سے بڑی حد تک محروم ہو گئے۔ لیکن پھر بھی مسلمانوں کے ہر عہد اور ہر دور میں سینکڑوں ماہرینِ فن اور مجتہدین کا نشان دیا جاسکتا ہے۔

اقتباس نمبر (۵):

"مشہور علماء کے تعلیمی حالات پڑھو۔ ایک ایک استاد کے حلقہ درس میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں طالب العلم مشغول درس نظر آئیں گے۔ علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ اس زمانے کے بعض حلقہ درس ایسے ہوتے تھے، جن میں دس ہزار سے زائد دواتیں رکھی جاتی تھیں اور لوگ احادیث نبوی ﷺ لکھتے تھے۔ اس بڑے مجمعے میں دو سو امام حاضر ہوتے تھے جو اجتہاد اور فتویٰ دینے کی پوری قابلیت رکھتے تھے۔"

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت "مسلمانوں کا قدیم طرزِ تعلیم" سے لی گئی ہے جس کے مصنف فلسفی مؤرخ علامہ شبلی نعمانی ہیں۔ یہ مضمون علامہ شبلی کی کتاب "مقالاتِ شبلی" سے لیا گیا ہے۔

(ب) تشریح:

اس اقتباس میں شبلی نعمانی اسلامی تاریخ کی ایک جھلک پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے مشہور و معروف علماء کرام کے حالات پڑھو تو تمھیں پتا چلے گا کہ ایک ایک عالم (استاد) کے حلقہ درس (یعنی کلاس) میں بے شمار طالب علم، علم حاصل کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ اس کے بعد شبلی نعمانی مشہور اسلامی مؤرخ علامہ ذہبی کی تحقیق سے ثابت کرتے ہیں کہ ان کے بقول اس زمانے کے بعض حلقہ درس (کلاس یا اجتماع) ایسے بھی ہوتے تھے کہ جن میں دس ہزار سے زیادہ تو صرف دواتیں (یعنی روشنائی یا Ink) رکھی جاتی تھیں۔ جن سے طالب علم احادیثِ مبارکہ تحریر فرماتے تھے۔ جب روشنائی یا انک کی تعداد کا یہ عالَم ہے تو شاگردوں کی تعداد کا کیا عالَم ہوتا ہوگا! ان اجتماعات میں سیکڑوں علماء کرام ایسے بھی ہوتے تھے جو خود اپنے علم و فن میں ماہر ہونے کے سبب "امام" ہوتے تھے۔ اور ان کی قابلیت کا یہ عالَم ہوتا تھا کہ وہ علماء اجتہاد

یعنی کوئی نیامسئلہ یاسوال ان کے سامنے پیش کیاجاتا تھاتو وہ سب اُس سوال یامسئلے کاجواب یا حل تلاش لیتے تھے۔اس کے علاوہ فتویٰ دینے کی صلاحیت تو بدرجہ اتم ان میں موجود تھی۔

اقتباس(٦):

"اعلیٰ تعلیم کیلئے دور دراز مسافتوں کا طے کرنا اور متعدد اہلِ کمال کی خدمت میں پہنچ کر فائدہ اٹھانا نہایت ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ مشہور اہلِ فن کی لائف چھان ڈالو۔اس زمانے میں ایک مشہور فاضل جو سفر کی زحمت اٹھائے بغیر اپنے فن میں نامور ہو، اس زمانے کے لوگ ہمیشہ اس کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔"

(الف)مصنف اور سبق کانام:

پیشِ نظر عبارت "مسلمانوں کا قدیم طرزِ تعلیم" سے لی گئی ہے جس کے مصنف فلسفی مؤرّخ علامہ شبلی نعمانی ہیں۔یہ مضمون علامہ شبلی کی کتاب "مقالاتِ شبلی" سے لیا گیا ہے۔

(ب) تشریح:

شبلی نعمانی کہتے ہیں کہ اس زمانے میں تعلیم حاصل کرنے کیلئے اور فنی مہارت حاصل کرنے کیلئے عام رواج تھا کہ لوگ دور دراز کا سفر کیا کرتے تھے اور اپنے ملک وشہر کے علماء سے تعلیم و تعلم کو کافی نہیں سمجھا جاتا تھا۔دوسرے ممالک کی مشہور شخصیات کے علم وفضل سے مستفید ہونا گویاضروری سمجھا جاتا تھا۔جب تک کوئی شخص دوسرے علاقوں کا سفر نہ کرے کسی فن میں اپنانام نہیں بنا سکتا تھا۔

اس زمانے کے کسی بھی مشہور عالم وفاضل کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات ضرور اس کے بارے میں سامنے آئے گی کہ اس نے متعدد اہلِ کمال سے استفادہ کیا ہے جن میں اس کے اپنے علاقے کے اساتذہ وعلماء بھی شامل ہیں اور دور دراز کے علماء بھی شامل ہیں۔

آخر میں شبلی کہتے ہیں کہ عام رواج تو یہی تھا کہ فن میں کمال کیلئے دور دراز کا سفر کیا جائے، لیکن اگر شاذونادر کوئی دور کا سفر کیے بغیر اپنے فن میں کمال حاصل کرلیتا تو اس زمانے کے لوگ اسے حیرت کی نظر سے دیکھتے تھے کہ دور دراز کی مسافت طے کیے بغیر فن میں کمال کیسے پیدا کرلیا۔

اقتباس(٧):

"دوسری چیز جو اعلیٰ تعلیم کیلئے گویالازمی تھی مناظرہ کی مجلسوں میں شریک ہونا تھا۔مشہور شہروں میں بحث ومناظرے کے لیے خاص وقت اور مقام مقرر تھے، بعض امراءاس قسم کی مجلسیں اپنے مکانوں پر منعقد کرتے تھے۔"

(الف)مصنف اور سبق کانام:

پیشِ نظر عبارت "مسلمانوں کا قدیم طرزِ تعلیم" سے لی گئی ہے جس کے مصنف فلسفی مؤرّخ علامہ شبلی نعمانی ہیں۔یہ مضمون علامہ شبلی کی کتاب "مقالاتِ شبلی" سے لیا گیا ہے۔

(ب) تشریح:

علامہ شبلی نعمانی اپنی اس تحریر میں مسلمان معاشرے میں علم حاصل کرنے کے ذرائع کا جائزہ لے رہے ہیں۔اس عبارت میں جس طریقۂ تعلیم پر روشنی ڈالی گئی ہے وہ "مناظرہ کی مجلسیں" تھیں۔مناظرہ کا مطلب ہے کسی علمی موضوع پر اہل کمال کا بحث ومباحثہ کرنا۔قدیم زمانے میں علم حاصل کرنے کا ایک اور مشہور اور ضروری سمجھی جاتی تھی وہ مناظرہ کی مجالس میں شریک ہونا تھا۔ہر فن کے طالب علم مشہور اہلِ کمال علماء کے مناظروں میں شریک ہوتے تھے اور ان کے علوم سے مستفید ہوتے تھے۔اس طریقہ تعلیم میں اُمراء کے شریک ہونے سے اس کی شہرت اور پھیل گئی تھی۔امراء اپنے بڑے بڑے مکانوں میں اس کا اہتمام کرلیا کرتے تھے۔چند گھنٹوں کے مناظرے میں سینکڑوں کتابوں کا حوالہ آجاتا تھا۔مناظرہ کی کسی مجلس میں شریک ہونا معمولی نصابِ تعلیم ختم کرنے کی بہ نسبت بہت زیادہ مفید اور پر اثر ہوتا تھا کیونکہ کسی نصاب

کو پڑھنے سے محدود استفادہ کیا جاسکتا ہے جبکہ اہلِ فن علماء کے مناظرے میں بحث کے دوران مختلف کتابوں کے حوالے سے گفتگو ہوتی تھی اور مناظرے میں شریک تمام شرکاء حیرت انگیز طور پر مختصر وقت میں اہلِ کمال علماء کی زبانی ان تمام کتابوں کے علم سے مستفید ہوتے تھے۔

اقتباس(۸):

"اب خیال کرو کہ ایک قوم جس میں اسلام کا جوش ابھی تازہ ہے۔ جس کی رگوں میں ہنوز عرب کا لہو ہے۔ جس کی ہمتیں بلند، ارادے مستقل، حوصلے وسیع ہیں اور پیہم ملکی کامیابیوں نے اس کے جوش کو زیادہ تیز کر دیا ہے۔ جب کسی کام پر پوری توجہ سے مائل ہو گی تو اسے کس حد تک پہنچا کر رہے گی۔"

(الف)مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت "مسلمانوں کا قدیم طرزِ تعلیم" سے لی گئی ہے جس کے مصنف فلسفی مؤرخ علامہ شبلی نعمانی ہیں۔ یہ مضمون علامہ شبلی کی کتاب "مقالاتِ شبلی" سے لیا گیا ہے۔

(ب) تشریح:

مولانا شبلی نعمانی تعلیم کی وسعت کے اسباب بیان کرتے ہیں۔ وہ پہلا سبب مذہب کو گردانتے ہیں یعنی مذہب کی وجہ سے تعلیم میں بطور خاص وسعت پیدا ہوئی کیونکہ دینی تعلیم مذہب کا جزو تھی۔ قرآن وحدیث کا جاننا ہر مسلمان پر لازم تھا یعنی مذہب کے زیر اثر تعلیم کو فروغ ہوا۔ اس زمانے میں مذہب کا جوش بہت زیادہ تھا اور مسلمانوں کی پے در پے فتوحات سے اس میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جب کسی قوم میں مذہبی جوش بہت زیادہ ہو، اس کی ہمتیں بلند اور حوصلے جوان ہوں۔ پیہم فتوحات سے اس کے جوش اور ولولے میں مزید اضافہ ہو گیا ہو۔ اس کی رگوں میں صحراء کی وسعت اور مشقت سمائی ہوئی ہو۔ وہ اگر کسی کام میں ہاتھ ڈالے گی تو اس کو کتنی بلندی تک لے جائے گی۔ یہی تعلیم کے ساتھ ہوا کہ مسلمانوں نے اپنے جوش اور ولولے اور بلند ہمتی سے کام لے کر تعلیم کو بہت وسعت دی اور نئے نئے علوم حاصل کئے۔

اقتباس نمبر(۹) :

"تعلیم مسجدوں اور علماء کی خاص درس گاہوں میں مقید نہ تھی۔ وزراء حکام، فوجی افسر، اہلِ منصب ہر طبقے کے لوگ پڑھتے پڑھاتے رہتے تھے۔ وزارت کے کثیر الاشغال وقت میں بھی بو علی سینا کی خدمت میں مستعد طلبہ کا ایک گروہ حاضر رہتا تھا۔"

(الف)مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت "مسلمانوں کا قدیم طرزِ تعلیم" سے لی گئی ہے جس کے مصنف فلسفی مؤرخ علامہ شبلی نعمانی ہیں۔ یہ مضمون علامہ شبلی کی کتاب "مقالاتِ شبلی" سے لیا گیا ہے۔

(ب) تشریح:

یہ اقتباس مضمون کے اس حصے سے لیا گیا ہے جس میں شبلی نعمانی نے مسلمانوں میں وسعتِ علم کے چار اسباب بیان کیے ہیں۔ ان اسباب میں سے دوسرا سبب بیان کرتے ہوئے شبلی نعمانی کہتے ہیں کہ تعلیم صرف مسجدوں اور علماء کے مدارس، خانقاہوں اور خواص تک محدود نہ تھی بلکہ حکومت کے وزیر، فوج کے افسر، بڑے بڑے حکومت کے افسران بھی پڑھتے پڑھاتے تھے۔ اس وجہ سے مسلمان علمی میدان میں دنیا سے سب سے آگے تھے۔ اس کے بعد شبلی نعمانی مشہور مسلمان ماہرِ طب کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ بیک وقت کئی تحقیقی معاملات میں مصروف ہوتا تھا۔ ایک طرف بو علی سینا سائنسی تجربات کرتا دوسری طرف اپنی زندگی کے معاملات اس پر مزید براں حکومتِ وقت کے عتاب میں رہنے کے باوجود، طالب علموں کو ہر وقت اپنے علم سے فیضیاب کرتا رہتا تھا۔ اور مسلمان طالب علم بھی بو علی سینا ایسے ماہر استاد سے اپنے علم کی پیاس بجھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے۔

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS BASIM www.studyhallpk

مصنف شبلی نعمانی کی بات کا دوسرا پہلو یہ بھی نکل سکتا ہے کہ حکومت کے کارندے اپنے معاملات میں، اپنی ذمہ داریوں میں مشغول ہونے کے باوجود بھی علمی اجتماعات میں شرکت فرماتے تھے۔ نہ صرف خود بلکہ اپنے بچوں کو بھی ایسے اجتماعات میں بھیجتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مشہور مسلمان ماہرِ طب بو علی سینا کی علمی محفل میں ہر وقت طالب علم حاصل کرتے رہتے تھے۔

روز مرہ اور محاورہ

تعارف مصنف:

خواجہ الطاف حسین اردو ادب و سخن میں ایک ایسا نام ہے جس کے احسانات کی بدولت جدید اردو عالمی معیار کے سفر پر گامزن ہو گئی۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جس نے ادب و سخن دونوں میں بھرپور خامہ فرسائی کی اور اہلِ دنیا سے داد و تحسین وصول کی۔ اسی کی کاوشوں کی بدولت برصغیر پاک و ہند میں علم و عمل کے چراغ روشن ہوئے اور بصیرتوں کو زندگی کا سراغ ملا۔ اردو علم و ادب کا ہر شعبہ اس کا ممنوع احسان ہے۔ شاعری ہو یا نثر، تنقید ہو یا تحقیق، سوانح ہو یا قومی شاعری، ہر پہلو میں حالی ہی کو معیار سمجھا جاتا ہے۔

JOIN FOR MORE!!!

اقتباس نمبر(۱):

”الغرض نظم ہو یا نثر، دونوں میں روز مرہ کی پابندی، جہاں تک ممکن ہو، نہایت ضروری ہے۔ مگر محاورے کا ایسا حال نہیں ہے۔ محاورہ اگر عمدہ طور سے باندھا جائے، تو بلاشبہ پست شعر کو بلند اور بلند کو بلند تر کر دیتا ہے، لیکن ہر شعر میں محاورہ باندھنا ضروری نہیں۔ بلکہ ممکن ہے کہ شعر بغیر محاورے کے بھی فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ درجے پر واقع ہو اور ممکن ہے کہ ایک پست اور ادنیٰ درجے کے شعر میں بے تمیزی سے کوئی لطیف و پاکیزہ محاورہ رکھ دیا گیا ہو۔“

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت ”روز مرہ اور محاورہ“ سے لی گئی ہے جس کے مصنف اردو کے پہلے تنقید نگار مولانا الطاف حسین حالی ہیں۔ یہ مضمون الطاف حسین حالی کی کتاب ”مقدمہ شعر و شاعری“ سے لیا گیا ہے۔

(ب) تشریح:

اس اقتباس میں مولانا حالی نے روز مرہ اور محاورے کے استعمال کے اصول بتاتے ہوئے کہا ہے کہ روز مرہ یعنی زبان کی پابندی نظم اور نثر دونوں میں بہت ضروری ہے۔ یعنی جہاں تک ممکن ہو سکے نثر اور نظم دونوں میں روز مرہ کی پابندی کرنی چاہیے۔ آگے چل کر مولانا حالی محاورے کے بارے میں بتاتے ہیں کہ اسے عمدہ طریقے سے استعمال کیا جائے تو شعر کی شان بڑھ جاتی ہے ہر شعر میں محاورے کا استعمال ضروری نہیں لیکن اگر مناسب طریقے سے استعمال کیا جائے تو ایک عام شعر کو بلند کر دیتا ہے اور بلند شعر کو بلند تر کر دیتا ہے۔ شعر بغیر محاورے کے بھی عمدہ ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی شعر بغیر محاورے کے بھی اعلیٰ معنوں کا اظہار کر دے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی معمولی شعر میں بہت اچھا محاورہ شامل کر دیا جائے۔ بہر حال یہ بات بہت اہم ہے کہ نثر اور نظم دونوں میں روز مرہ اور محاورے کی پابندی کی جانی چاہیے اور زبان کے اصولوں کی پابندی سے ہی زبان ترقی کرتی ہے۔ دنیا کی ہر زبان کی کچھ قواعد ہوتے ہیں جن کی پابندی بہت ضروری ہے ورنہ تحریر غیر معیاری ہو جائے گی۔

سچ اور جھوٹ کا رَزم نامہ

تعارفِ مصنف:

محمد حسین آزاد ایک صاحب طرز انشاء پرداز، زبان دان، نقاد اور شاعر ہیں۔ اردو کے عناصر خمسہ میں اپنی رنگین بیانی کے لحاظ سے آپ کو ایک منفرد حیثیت حاصل ہے۔ آپ کی تحریروں میں فکر کے موتی، علم کے چراغ، ظرافت کے پھول، فن کی روشنی اور تحقیق کی چاندی سب ہی کچھ شامل ہے۔ محمد حسین آزاد کے منفرد اندازِ بیان کی بناء پر صاحبِ علم طبقے نے آپ کو "آقائے سخن" کے لقب سے نوازا ہے۔

تعارفِ سبق:

دنیا جب سے معرضِ وجود میں آئی ہے اُس میں سچ اور جھوٹ اور حق و باطل کی جنگ جاری ہے۔ انسان کو انسان بنانے کے لئے خیر کی قوتیں ہزاروں برس سے لگی ہوئی ہیں اور شر کی کھوکھلی طاقتیں اُس کو حیوان بنانے میں سرگرمِ عمل ہیں۔ جھوٹ ہزاروں بھیس بدل کر سچائی کے راستے کی رکاوٹ بنتا ہے مگر سچائی اُسے قدموں تلے روند کر اپنی منزل کی طرف گامزن ہو جاتی ہے۔ اِس لافانی حقیقت کو مولانا آزاد نے تمثیلی انداز میں سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ کے عنوان سے پیش کیا ہے۔

تمثیلی کردار:

سچ	جھوٹ
☆... ملکہ صداقت زمانی (سچ)	☆... دروغ دیوزاد (جھوٹ)
☆... سلطانِ آسمانی (اللہ تعالیٰ) [باپ]	☆... حُمقِ تیرہ دماغ (جہالت و بیوقوفی) [باپ]
☆... ملکہ دانش خاتون (عقلمندی) [ماں]	☆... ہوسِ ہوا پرست (لالچ) [ماں]

اس تمثیلی سبق میں مولانا محمد حسین آزاد نے سچ اور جھوٹ کی تجسیم کی ہے اور تخیلاتی طور پر ان کو دو انسانوں کے روپ دیے ہیں۔ سچ کو ملکہ کا روپ ملا ہے جس سے اس کی شان ظاہر کی گئی ہے۔ سچ کا باپ سلطانِ آسمانی یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کی ماں ملکہ دانش یعنی عقلمندی کو بنایا گیا ہے جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ سچ بولا جائے۔

دوسری طرف جھوٹ کا باپ حمقِ تیرہ دماغ یعنی جہالت و بیوقوفی اور اس کی ماں ہوسِ ہوا پرست یعنی لالچ کو بنایا گیا ہے جس میں اشارہ ہے کہ جھوٹ کے پیچھے جو عوامل کارفرما ہوتے ہیں وہ جہالت اور لالچ ہی ہیں۔

اقتباس(۱):

"اسے نیکی اور نیک ذاتی کے ساتھ خوبیوں اور محبوبیوں کے زیور سے آراستہ دیکھ کر سب نے صدقِ دل سے تعریف کی عزتِ دوام کا تاجِ مرصع سر پر رکھا گیا حکم ہوا کہ جاؤ، اولادِ آدم میں اپنا نور پھیلاؤ۔"

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت "سچ اور جھوٹ کا رَزم نامہ" سے لی گئی ہے جس کے مصنف بے مثل تمثیل نگار مولانا محمد حسین آزاد ہیں۔ یہ تمثیلی مضمون محمد حسین آزاد کی کتاب "نیرنگ خیال" سے لیا گیا ہے۔

(ب) تشریح:

پیشِ نظر سطور مضمون کا ابتدائی حصہ ہے جس میں انھوں نے صداقت کی سچائی اور صداقت کے خاندان سے آگاہ کرتے ہوئے اس کی خوبیوں کو بیان کیا ہے۔ مولانا آزاد کہتے ہیں کہ صداقت یا سچائی نے ملکہ دانش یعنی فہم و فراست کی گود سے جنم لیا اور وہ سلطانِ آسمانی کی شفقت میں پروان چڑھی جس کو بلحاظِ تعلیم و تربیت قدرت نے شاہکار اور بے مثل بنایا تھا۔ جوان ہونے پر اپنے باپ جو آسمان کے روپ میں ساری دنیا کا احاطہ کیے ہوئے ہے کہ روبرو حاضر ہوئی تاکہ دنیا میں اپنے کردار کی ادائیگی کے لئے اجازت حاصل کر سکے۔

مولانا کہتے ہیں کہ سلطانِ آسمانی نے صداقت زمانی کو نیکی' بھلائی اور دیگر پسندیدہ اوصاف کا مالک پایا۔ اہلِ دربار نے بھی اس کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی تعریف کی باپ نے اسکے سر پر ہمیشہ قائم رہنے والے وقار کا سجا ہوا تاج رکھا۔ اسے دعائیں دیں کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو، اس کی حکمرانی ہمیشہ ہمیشہ قائم و دائم رہے اور حکم دیا کہ دنیا میں جا کر لوگوں میں اپنی روشنی پھیلاؤ' ان کی رہنمائی کرو تا کہ اولادِ آدم (انسان)، انسان کے شر سے محفوظ رہ سکے کیونکہ یہ شیطانی قوتیں مختلف روپ دھار کر گمراہ کرتی رہتی ہیں۔ تمہارے وجود سے ان میں حق و باطل کی تمیز پیدا ہو گی اور وہ تمہارے طفیل بدی کی قوتوں کو شکست دے کر اپنے مقصدِ تخلیق سے نہ بھٹک جائیں۔

اقتباس(۲):

''عالمِ سفلی میں دروغِ دیوزاد ایک سفلئہ نابکار تھا کہ حمق تیزہ دماغ اس کا باپ تھا اور ہوس ہوا پرست اس کی ماں تھی' اگرچہ اسے دربار میں آنے کی اجازت نہ تھی' مگر جب کبھی کسی تفریح کی صحبت میں تمسخر اور ظرافت کے بھانڈ آیا کرتے تھے تو ان کی سنگت میں وہ آجاتا تھا۔ اتفاقاً اس دن بھی وہ آیا ہوا تھا اور بادشاہوں کو ایسا خوش کیا ہوا تھا کہ اسے ملبوسِ خاص کا خلعت مل گیا۔ یہ منافق دل میں سلطانی آسمانی سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ ملکہ کی قدر و منزلت دیکھ کر اسے حسد کی آگ نے بھڑکایا۔ چنانچہ وہاں سے چپ چپاتے نکلا اور ملکہ کے عمل میں خلل ڈالنے کو ساتھ ساتھ روانہ ہوا۔''

JOIN FOR MORE!!!

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت ''سچ اور جھوٹ کا رَزم نامہ'' سے لی گئی ہے جس کے مصنف بے مثل تمثیل نگار مولانا محمد حسین آزاد ہیں۔ یہ تمثیلی مضمون محمد حسین آزاد کی کتاب ''نیرنگِ خیال'' سے لیا گیا ہے۔

(ب) تشریح:

پیشِ نظر سطور میں مولانا لکھتے ہیں کہ دنیا میں صداقت زمانی جیسی عظیم قوت جو نیکی اور سچائی کی ضمانت ہے اسکے مدِ مقابل دوسری دیو ہیکل شیطانی قوت دروغ یعنی جھوٹ تھا جس کا باپ تاریک الدماغ' منفی سوچ کا حامل' بے ہودہ اور قابلِ نفرت اوصاف کا حامل احمق تھا اور ماں نفسانی خواہشات کی پجارن ہوس تھی۔

ویسے تو اس شیطان صفت دروغ کو ناپسندیدہ اور نامعقول سمجھتے ہوئے سلطانی آسمانی نے اپنی مجلس میں آنے کی اجازت نہ دی مگر پھر بھی وہ موقع ملتے تفریح یا ہنسی مذاق کی محفلوں میں یا جشن کی محفلوں میں مراثیوں کے حلئے میں چھپ کر آجاتا جو سوانگ بھر کر اور روپ بدل بدل کر اہلِ مجلس کے دلوں کو لبھانے اور جھوٹی مسرتوں سے ان کے قلوب کو بہلانے کی خاطر آیا کرتے تھے۔ ان کے توسط سے دربار میں پہنچ کر وہ اپنی کرشمہ سازیوں اور فتنہ سازیوں کے جادو جگایا کرتا تھا۔ یہ شیطانی فرزند دروغ' سلطانی آسمانی اور اس کی لاڈلی بیٹی صداقت زمانی سے حد درجہ نفرت اور دل میں نفاق رکھتا تھا۔ جب اس نے دربار میں صداقت زمانی کا یہ وقار دیکھا اور اس کے باپ سلطانِ آسمانی کا اسکو دنیا میں بھیجنے کا سندیسہ سنا تو پیچ و تاب کھاتا ہوا دربار سے کھسک کر اس کے خلاف برسرِ پیکار ہونے کی خاطر دنیا میں پہنچا تا کہ انسانوں کے دلوں پر اپنی حکمرانی قائم کر سکے۔

اقتباس(۳):

''جب یہ دود عویدار نئے ملک اور نئی رعیت کے تسخیر کرنے کو اٹھے' تو چوں کہ بزرگانِ آسمانی کو ان کی دشمنی کی بنیاد ابتدا سے معلوم تھی' سب کی آنکھیں ادھر لگ گئیں کہ دیکھیں ان کی لڑائی کا انجام کیا ہو؟''

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت ''سچ اور جھوٹ کا رَزم نامہ'' سے لی گئی ہے جس کے مصنف بے مثل تمثیل نگار مولانا محمد حسین آزاد ہیں۔ یہ تمثیلی مضمون محمد حسین آزاد کی کتاب ''نیرنگِ خیال'' سے لیا گیا ہے۔

(ب) تشریح:

پیشِ نظر سطور میں آزاد کہتے ہیں کہ جیسی ہی سچ اور جھوٹ کی قوتوں نے دنیا میں اپنا اپنا ڈیرہ جمایا اور ایک دوسرے کے صف آراء ہوگئے تو ان میں سے ہر ایک کی یہ کوشش تھی کہ انسانوں پر اپنی بالادستی قائم کرے اور دوسرے کے اثرات کو مرتب نہ ہونے دے۔ چنانچہ دونوں اپنے اپنے مشن کی کامیابی کے لئے پوری توانائیوں کے ساتھ متحرک ہوگئے۔ جھوٹ کی پوری کوشش ہوتی کہ اولادِ آدم اس کے جال میں گرفتار ہو کر بدی کی عاشق ہوجائے اور نیکی ترک کردے۔ جب کہ سچائی کی بھرپور کوشش تھی کہ انسان دروغ کے جال میں پھنس کر راہِ حق اور بھلائی کے راستے سے نہ بھٹکیں۔ وہ انسانوں کو دروغ کے فریب اور شیطانی صفات سے آگاہ کرتی رہتی غرض کہ دونوں اسی تگ و دو میں مصروف رہتے اور مقابلہ جاری رہتا۔

آسمانی مخلوق فرشتے دنیا پر نگاہیں جمائے ان دونوں کی معرکہ آرائی دیکھتے رہتے اور اس کے نتائج جاننے کے لئے مسلسل اسی طرف متوجہ رہتے تاکہ انھیں معلوم کہ کون دروغ کا پرستار، جھوٹ کا دلدادہ ہے اور کون سچ کا مطیع، نیکی کا امین اور حق و صداقت کا طرفدار ہے غرض وہ اس معرکہ آرائی میں فاتح اور شکست خوردہ کردار سے آگاہ ہونا چاہتے تھے۔

اقتباس(۴):

”ملکہ کی شان شاہانہ تھی اور دبدبہ خسروانہ تھا۔ اگرچہ آہستہ آہستہ آتی تھی مگر استقبال رکاب پکڑے تھا اور جو قدم اٹھتا تھا دس قدم آگے پڑتا نظر آتا تھا۔ ساتھ اس کے جب ایک دفعہ جم جاتا تھا تو انسان کیا فرشتے بھی نہیں ہٹا سکتے تھے۔“

JOIN FOR MORE!!!

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت ”سچ اور جھوٹ کا رَزم نامہ“ سے لی گئی ہے جس کے مصنف بے مثل تمثیل نگار مولانا محمد حسین آزاد ہیں۔ یہ تمثیلی مضمون محمد حسین آزاد کی کتاب ”نیرنگِ خیال“ سے لیا گیا ہے۔

(ب) تشریح:

مندرجہ بالا اقتباس میں مصنف نے سچائی کی ملکہ، ملکہ صداقت زمانی کی میدانِ جنگ میں آمد کا ذکر کیا ہے اور اُس کی شان و شوکت بیان کی ہے۔ مصنف کہتے ہیں کہ سچائی و صداقت کی اِس ملکہ کا مرتبہ نہایت ہی بلند ہے اور اِس کی شان و شوکت آنکھوں کو خیرہ کردیتی ہے۔ اِس شخصیت کے پُرنور چہرے سے حق گوئی کا عکس نظر آتا۔ یہ نہایت آہستگی پر مستقل مزاجی سے اپنے قدم بڑھاتی ہے۔ اِس کا منزل کی جانب ہر بڑھتا قدم اس بات کی بشارت دیتا کہ منزل دور نہیں ہے اور ایسا لگتا ہے مقصد حاصل ہوگیا ہے۔ یہ ملکہ اگر ایک مرتبہ کسی جگہ پر اپنا پُرزور قدم جمادے تو اِس قدر مستقیم ہوتا ہے کہ اِس کو ہٹانا کسی انسان کے بس میں نہیں رہتا۔ اِس مضبوط قدم کو فرشتے جیسی مخلوق بھی نہیں ہلا سکتی۔

اِس عبارت میں مصنف نے ایک نہایت ہی قابلِ غور بات پیش کی ہے۔ مصنف کہتے ہیں کہ سچائی و صداقت ایک ایسی اٹل اور خوبصورت حقیقت ہے کہ ہر جگہ اِس کا زور ہوتا ہے۔ سچ کے اندر استقلال و پائیداری ہوتی ہے اور سچ کو ایک نہایت اہم مرتبہ حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سچ کی ابتداء ہوتی ہے تو ہزاروں گواہیاں اِس کے حق میں آتی ہیں۔ سچائی کا زور آہستہ آہستہ بلند ہوتا ہے اور بلند ہونے کے ساتھ ساتھ پوری طرح معاشرے میں سرایت کرجاتا ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرے میں امن و سکون اور چین پھیل جاتا ہے اور تمام انسانوں کو اُن کے مقصد کے حصول میں آسانی ہوجاتی ہے۔ صداقت کی مہک اگر ایک مرتبہ پھیل جائے تو پورے گلشن کو دل نشین بنادیتی ہے اور اس خوشبو کو کوئی بھی نہیں مٹا سکتا۔ یہ خوشبو ہر نئے آنے والے کے لئے حصولِ منزل کی راہ ہموار کرتی ہے اور اِس کی بدولت بندہ مومن اطمینان و سکون کے ساتھ اپنا منشاء حاصل کرلیتا ہے۔

اقتباس(۵):

”دروغِ دیوزاد بہروپ بدلنے میں طاق تھا، ملکہ کی ہر بات کی نقل کرتا تھا اور نئے نئے سوانگ بھرتا تھا، تو بھی وضع اس کی گھبرائی ہوئی

معلوم ہوتی تھی۔ دنیا کی ہوا وہوس، ہزاروں رسالے اور پلٹنیں اس کے ساتھ لئے تھیں اور کیونکہ یہ ان کی مدد کا محتاج تھا، اسی لئے لالچ کا مارا کمزور تابعداروں کی طرح ان کے حکم اٹھاتا تھا۔"

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت "سچ اور جھوٹ کا رَزم نامہ" سے لی گئی ہے جس کے مصنف بے مثل تمثیل نگار مولانا محمد حسین آزاد ہیں۔ یہ تمثیلی مضمون محمد حسین آزاد کی کتاب "نیرنگِ خیال" سے لیا گیا ہے۔

(ب) تشریح:

پیشِ نظر اقتباس میں آزاد سچ اور جھوٹ کے جاہمی مقابلے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ قوی' دیو ہیکل اور شیطانی صفات کا حامل دروغ ایک بہروپیا تھا۔ وہ روپ بدل بدل کر وار کرنے میں مہارت رکھتا تھا۔ کبھی وہ سچ کا فرضی روپ دھار کر انسانوں کو بہکاتا کہ وہ ہی اصل نیکی ہے لیکن جب وہ اپنے اس فریب کا جال بچھاتا تو جھوٹ کے پیر نہیں ہوتے کے مصداق ہر لمحے اس پر بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ طاری رہتی۔ دوسروں کو فریب دینے میں بے شمار قوتیں اسکی مددگار اور معاون ہوتیں' اس موقع پر وہ ہوس' لالچ' بے غیرتی' بے حیائی' دغا اور طراری جیسی قوتوں کو حملہ آور ہونے کا حکم دیتا۔ یہ قوتیں انسانوں کے دلوں میں دروغ کی اہمیت اور صداقت کی کمتری کا احساس کر کے باور کراتی ہیں کہ فتح و سربلندی جھوٹ کے سر ہے جو جتنا جھوٹ بول سکتا ہے وہ اتنا ہی کامیاب ہے۔ دغا و فریب جو دروغ کے چہیتے تھے' انسانوں کو دروغ کے جال میں پھنسانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

اقتباس(٦):

"ملکہ کے ہاتھ میں اگرچہ باپ کی کڑک بجلی کی تلوار نہ تھی مگر تو بھی چہرہ ہیبت ناک تھا اور رعبِ خداداد کا خَود سر پر دھرا تھا جب معرکہ مار کر ملکہ فتحیاب ہوتی تھی تو یہ شکست نصیب اپنے تیروں کا ترکش پھینک' بے حیائی کی ڈھال منہ پر لے' ہوا و ہوس کی بھیڑ میں جا کر چھپ جاتا تھا۔ نشانِ لشکر گر پڑتا تھا اور لوگ پھریرا پکڑے زمین پر گھسیٹتے پھرتے تھے۔"

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت "سچ اور جھوٹ کا رَزم نامہ" سے لی گئی ہے جس کے مصنف بے مثل تمثیل نگار مولانا محمد حسین آزاد ہیں۔ یہ تمثیلی مضمون محمد حسین آزاد کی کتاب "نیرنگِ خیال" سے لیا گیا ہے۔

(ب) تشریح:

پیشِ نظر سطور میں آزاد لکھتے ہیں کہ دروغ اور صداقت کی معرکہ آرائی میں سچائی اپنی روحانی اور باطنی قوتوں پر بھروسہ کرتی اس کے ہاتھ میں اپنے باپ سلطانِ آسمانی کی تیز دھار تلوار بھی نہ ہوتی جسے چلا کر شیطانی قوتوں کی صفوں کو تہہ وبالا کر دیتی وہ اسی تلوار کو اپنے اس لئے کام میں نہ لاتی کہ اسکی خواہش تھی کہ وہ دلوں پر حکومت کرے اس کی نظر میں خون خرابہ مسائل کا حل نہ تھا۔ جب جھوٹ کے مدِ مقابل آتی تو اس کے چہرے پر خاص رعب و جلال اور اس کے سر پر اللہ کی رحمتوں کا تاج ہوتا اس لئے وہ جنگ جیت جاتی اور دروغ کو شکستِ فاش ہو جاتی۔ وہ میدان میں سارے تیر و کمان پھینک کر فرار ہو جاتا اور دنیاوی خواہشات و طمع اور لالچ و ہوس کے دامن میں پناہ لے لیتا۔ اس وقت اسکے چہرے پر بے غیرتی کی نقاب رہ جاتی اور ملکہ صداقت زمانی یہ سوچ کر آگے بڑھ جاتی کہ اب دروغ شرم' ذلت اور رسوائی کی وجہ سے آمادۂ فساد نہ ہو گا۔ لیکن وہ بے غیرت ابتدائی حقارت و ذلت کے باوجود اپنی حرکتوں سے باز نہ آتا۔

اقتباس(٧):

"ملکہ صداقت زمانی کبھی زخمی بھی ہوتی، مگر سانچ کو آنچ نہیں، زخم جلد بھر آتے تھے اور وہ جھوٹا نابکار جب زخم کھاتا تو ایسے سڑتے کہ اوروں میں بھی وبا پھیلا دیتے تھے۔ مگر ذرا انگور بندھے اور پھر میدان میں آ کودا۔"

JOIN FOR MORE!!!

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت "سچ اور جھوٹ کا رَزم نامہ" سے لی گئی ہے جس کے مصنف بے مثل تمثیل نگار مولانا محمد حسین آزاد ہیں۔ یہ تمثیلی مضمون محمد حسین آزاد کی کتاب "نیرنگِ خیال" سے لیا گیا ہے۔

(ب) تشریح:

پیشِ نظر سطور میں مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ دورانِ جنگ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سچائی وقتی پر زخمی ہو جاتی ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جھوٹ میں بڑی طاقت ہے اور بدی بھی پر زور ہے لیکن ان کا یہ قیاس کچھ ہی عرصے میں کافور ہو جاتا ہے کچھ ہی وقفے کے بعد سچائی صحت یاب ہو کر لوگوں کے دلوں کو مسخر کرتی ہے اور ان پر واضح کر دیتی ہے کہ سچائی پھر سچائی ہوتی ہے اور جھوٹ کے پیر نہیں ہوتے ہیں۔ سچائی ہی ہمیشہ رہنے والی صفت ہے اسی میں دائمی غلبے کی خوبی پائی جاتی ہے اور اسے مستقل شکست نہیں دی جاسکتی۔

البتہ دروغ جب زخمی ہوتا تو اپنے زخموں کے جراثیم اوروں میں بھی پھیلاتا اور بے غیرت اور بے حیا بن کر زخم بھرتے ہی اپنی خباستوں کو وام کرنے کے لئے سچائی کے خلاف پھر صف آراء ہو جاتا ہے بہر حال ہر بار شکست کھاتا اور سچائی سرخرو ہوتی واقعی حق ہی باطل پر غلب آنے کے لئے ہے۔

JOIN FOR MORE!!!

تشکیلِ پاکستان

تعارفِ مصنف:

میاں بشیر احمد سچے مسلمان اور اسلام کے شیدائی تھے۔ ساری عمر اسلام کے فروغ اور مسلمانوں کی فلاح کی خاطر قلمی، علمی اور عملی جہاد میں مصروف رہے۔ نظریہ پاکستان سے انھیں والہانہ لگاؤ تھا ان کی تحریریں اسلامی اقرار و تعلیمات کی اشاعت اور نظریہ پاکستان کی وکالت کرتی نظر آتی ہیں۔ ان کی تحریرین سادہ زبان اور بیان کی روانی کے ساتھ ساتھ زورِ اثر کی حامل ہیں۔ خلوص و دیانت' بے باکی اور دوٹوک بات کہنا ان کی عادت ہے۔

اقتباس(۱):

"اس ناگفتہ بہ حالت میں ایک دور اندیش ہمدردِ ملت اٹھا جس نے اپنی مایوس' پسماندہ قوم کو امید' محنت اور ترقی کا زندگی بخش پیغام دیا۔ یہ مردِ خدا سر سید احمد خان تھے۔ یہ انھیں کی جدوجہد کا نتیجہ تھا کہ گو ملک ہاتھوں سے گیا ملت کی آنکھیں کھل گئیں۔"

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت "تشکیل پاکستان" سے لی گئی ہے جس کے مصنف تحریک پاکستان کے سرگرم کارکن میاں بشیر احمد ہیں۔ یہ مضمون میاں بشیر کے ادبی رسالے "ہمایوں" سے لیا گیا ہے۔

(ب) تشریح:

پیشِ نظر سطور میں مصنف کہتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی کے بعد مسلمانِ ہند انگریزی دباؤ اور ہندوؤں کی بے رخی کا شکار ہوئے اور ان میں یاسیت اور محرومی کا احساس بڑھنے لگا۔ مسلمانوں کی خستہ حالی' مردہ دلی اور احساس محرومی کے نتائج پر مسلمانوں کے رہنماؤں اور اہل دانش نے بھی اپنی بے چینی کا اظہار کیا۔ انکی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس گرداب سے کیسے نکلا جائے۔

چنانچہ اسی دل برداشتہ ماحول میں مسلمانوں کو غلامی سے چھٹکارا دلانے' ان میں سے ناامیدی کا احساس ختم کرنے کے لئے اور کامیابی و آزادی کی راہیں سمجھانے کی خاطر ایک شخص جس کا نام سرسید احمد خان تھا' اٹھا جو ہمدردی کے احساس سے معمور دل اور ترقی و قومی خدمت کے جذبے سے لبریز ذہن کا حامل تھا۔ خدا نے اسے سوجھ بوجھ' تدبیر و تفکر' دور بینی اور دوراندیشی کی دولت سے مالامال کیا تھا۔ یہ عظیم ہمت و

استقامت اسکی فطرت میں شامل تھی اس نے اپنی دور اندیشی سے مسلمانوں کی ٹوٹی ہوئی کشتی کو جوڑنے اور گرداب میں پھنسی ہوئی نیا کو کنارے لگانے کی منصوبہ بندی کی اور انھیں ناامیدی اور سستی و کاہلی کی بجائے محنت و مشقت کی طرف مائل کرنے کی بھرپور کوشش کی جو بالآخر کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور مسلمانانِ ہند خوابِ گراں سے جاگ گئے۔

غرضیکہ مسلمان کچھ عرصے دوسروں کی غلامی میں تو رہے لیکن اس سے انھیں غلامی اور آزادی کا فرق پتہ چل گیا۔ انھوں نے محسوس کر لیا کہ غلامی سے بہتر موت ہے بالآخر وہ بیدار ہو گئے اور سر سید کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر آزادی کی منزل کی جانب گامزن ہو گئے۔

اقتباس(۲):

"ان مساعی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب سے بے گانگی بہت حد تک کم ہوگئی اور مغرب کی ذہنی غلامی سے نجات ملی۔ لیکن ساتھ ہی ایک ایسی فضا بھی پیدا ہوگئی جس میں اپنی ہر چیز اچھی اور دوسروں کی ہر چیز بری لگنے لگی۔ اس کی اصلاح ضروری ہوگئی۔"

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت "تشکیل پاکستان" سے لی گئی ہے جس کے مصنف تحریک پاکستان کے سرگرم کارکن میاں بشیر احمد ہیں۔ یہ مضمون میاں بشیر کے ادبی رسالے "ہمایوں" سے لیا گیا ہے۔

(ب) تشریح:

JOIN FOR MORE!!!

پیشِ نظر سطر میں مصنف لکھتے ہیں کہ علی گڑھ نے ہندوستان کے مسلمان نوجوانوں کو جدید تعلیم سے آشنا کیا مگر اس جدید تعلیم کے ساتھ مغربیت کی ایک عام فضا بھی بننا شروع ہو گئی۔ اپنی تہذیب اور مذہب دوسرے درجے میں شمار کیے جانے لگے۔ اس عمومی ماحول کو ختم کرنے اور مسلمانوں کو اپنی تہذیب سے جڑے رکھنے اسلامی علوم کے دو بڑے ادارے وجود میں آئے:

(۱) لکھنؤ میں...... ندوۃ العلماء　　(۲) دیوبند میں...... دارالعلوم

میاں بشیر احمد کے بقول دیوبند اور ندوہ جیسے افراد اور اداروں کی کوشش کے نتیجے میں مسلمانوں کے دلوں سے مذہب سے دوری کا کافی حد تک خاتمہ ہو گیا اور وہ دین کی اتباع میں اپنی نجات سمجھنے لگے۔

انگریزوں کی غلامی اور سیاسی بالادستی کے نتیجے میں مسلمانوں کے ذہن میں مغربی طرزِ زندگی اور اقدار و روایات کی جو عظمت اور اپنی مذہبی تعلیمات کی کمتری کا جو احساس پیدا ہو گیا تھا وہ ختم ہو گیا۔ اس طرح مسلمانوں کو یورپ کی غلامی سے چھٹکارا مل گیا۔

ایک طرف جہاں مذہبی رہنماؤں اور اداروں کی بالادستی سے مغربی اقدار و روایات کی بالادستی کا احساس کمزور پڑا وہاں ایک خرابی نے بھی جنم لیا یعنی ان لوگوں کے دلوں میں اس چیز سے نفرت پیدا ہونے لگی کہ جو اسلامی اقدار' مذہبی روایات اور مشرقی ماحول سے مطابقت نہ رکھتی تھی خواہ وہ بہتر ہو یا فائدہ مند۔ اسی احساس کے پیشِ نظر سر سید اور ان کے رفقاء نے بھرپور چوٹ لگائی اور مسلمانوں کے دلوں کو ہر اچھی چیز اپنانے کی طرف راغب کیا خواہ اس کا تعلق کسی بھی قوم یا مذہب سے ہو۔ انھوں نے جدید علوم اور انگریزوں کی اچھی اقدار و روایات کو اپنانے کی تلقین کی۔

اقتباس(۳):

"اقبال کا خیال ہے کہ انسان اطاعت' ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہی کی تین منزلیں طے کرتا ہوا خودی کی انتہائی منزل پر پہنچ سکتا ہے۔ اس ارتقاء میں اسے مذہب کی رہنمائی درکار ہے۔ اقبال نے چار چیزوں پر زور دیا۔ اول توحید جس پر پورا ایمان عملاً انسان کو خوف و مایوسی سے آزاد کر دیتا ہے نیز توحیدِ الٰہی' توحید انسانی میں پر تو فگن ہوتی ہے۔ دوم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور ان کی مکمل تقلید۔ سوم' قرآن کا مطالعہ اور اس کی تعلیمات کی پیروی۔ چہارم' رجائیت یعنی مایوسی اور غم پسندی کو ترک کر کے امید' ہمت اور جرات کی راہ اختیار کرنا۔"

(الف)مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت "تشکیل پاکستان" سے لی گئی ہے جس کے مصنف تحریک پاکستان کے سرگرم کارکن میاں بشیر احمد ہیں۔ یہ مضمون میاں بشیر کے ادبی رسالے "ہمایوں" سے لیا گیا ہے۔

(ب) تشریح:

پیشِ نظر سطور میں مصنف لکھتے ہیں کہ سرسید اور ان کی رفقاء کا مسلمانوں میں بیداری کا جذبہ پیدا کرنے میں بڑا ہاتھ تھا اسکے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں جذبہ ایمانی اور دو قومی نظریہ کے ارتقاء و اشاعت میں علامہ اقبال کا بھی بڑا دخل تھا۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے قوم کو بیدار کیا انھیں خوابِ غفلت سے جگایا' عمل کی طرف راغب کیا اور ان میں ایسے اوصاف پیدا کرنے کی کوشش کی جو انھیں زندہ اور ترقی یافتہ قوموں کی صف میں لا کھڑا کریں۔

انھوں نے بتایا کہ انسان اس وقت ہی بشریت کی عظیم مرتبے پر فائز ہو سکتا ہے جب کہ وہ خود کو مکمل طور پر اللہ کی بندگی میں دے دے' اپنی خواہشات نفسانی کو قابو میں رکھے اور انھیں مرضیِ خداوندی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرے۔

مصنف اقبال کے نظریہ خودی اور فلسفۂ حیات کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ انسانوں کی مکمل انفرادی نشو نما کے لئے ان چار عناصر کی موجودگی کو لازمی قرار دیا ہے۔

۱۔وحدانیت ۔یعنی وہ اللہ کی وحدانیت کا قائل ہو اور اس کا اقرار دونوں سے ظاہر ہو' اس کے دل میں سوائے اللہ کے کسی کا خوف نہ ہو۔

۲۔رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ۔اس کا دل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے لبریز ہو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسے ہر چیز سے زیادہ عزیز ہوں اور ان کی پیروی کرنا اس کی زندگی کا مقصد ہو۔

۳۔قرآن سے دلی لگاؤ ۔وہ قرآن کریم کو ہدایت اور رہنمائی کا سرچشمہ سمجھے اور اس کے احکامات کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی گزارے۔

۴۔رجائیت ۔یعنی اور غم پسندی کی بجائے روشن مستقبل پر اسے یقین ہو۔ وہ کوشش و کاوش کے ذریعے اپنی زندگی کو سنوارے اور اچھے نتائج کی امید کے ساتھ فیصلہ خدا پر چھوڑ دے۔

ایسا شخص جس میں مندرجہ بالا چار خوبیاں ہونگی وہی مومن ہو گا اور اللہ کا محبوب بندہ کہلائے گا۔

اقتباس نمبر(۴):

"سرسید نے علی گڑھ میں مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لیے قدم اٹھایا لیکن بالعموم ان کی قومی سیاست یہی تھی کہ مسلمان ملکی سیاست سے الگ تھلک رہیں اور پہلے مغربی علوم کے حصول سے اپنی قوم کی حالت کو درست اور مضبوط کر لیں۔"

(الف)مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت "تشکیل پاکستان" سے لی گئی ہے جس کے مصنف تحریک پاکستان کے سرگرم کارکن میاں بشیر احمد ہیں۔ یہ مضمون میاں بشیر کے ادبی رسالے "ہمایوں" سے لیا گیا ہے۔

(ب) تشریح:

اس نثرپارے میں مصنف میاں بشیر احمد کہتے ہیں کہ سرسید احمد خان نے ہندوستان کے مقام "علی گڑھ" میں ۱۸۷۵ء میں مسلم اینگلو انڈین کالج قائم کیا۔ تاکہ مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت ہو جائے۔ مگر سرسید نے مسلمانانِ ہند کو عملی سیاست میں حصہ لینے سے منع کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانانِ ہند تعلیمی میدان میں بہت پیچھے تھے۔ دوسری طرف مسلمانوں کی آبادی بھی دیگر مخالف قوموں کے مقابلے بہت کم تھی۔ اسی لیے سرسید نے کہا کہ مسلمان ابھی اس قابل نہیں کہ وہ ملکی سیاست میں حصہ لے سکیں اس لیے بہتر ہو گا کہ وہ ملکی

سیاست سے دور رہیں۔ پہلے مغربی علوم اور فن میں کمال حاصل کر لیں۔ اس کے بعد ان کی حالت بہتر ہو جائے گی اور وہ مخالفین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکیں گے۔

اقتباس(۵):

''مسلمانوں کا نصب العین اسلام ہے۔ وہ اسلام نہیں جس کا ڈنکا مطلق العنان بادشاہوں اور خود غرض امراء نے بجایا بلکہ وہ اسلام جس کا حامل قرآن ہے جس نے صرف ان دیکھے خدا کے آگے سر جھکانا سکھایا' وہ اسلام جس کا نمونہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد میں مسلمانوں کی زندگی میں نظر آتا ہے۔ وہ سچائی' وہ دلیری' وہ خود اعتمادی' وہ انکسار و امن پسندی' وہ محنت و مساوات' وہ صبر و تقویٰ' وہ مسلم و غیر مسلم' سب کی خدمت' سب کے حقوق کا تحفظ' سب سے رواداری اور محبت! یہ ہے پاکستان کے مسلمانوں کا نصب العین۔''

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت ''تشکیل پاکستان'' سے لی گئی ہے جس کے مصنف تحریک پاکستان کے سرگرم کارکن میاں بشیر احمد ہیں۔ یہ مضمون میاں بشیر کے ادبی رسالے ''ہمایوں'' سے لیا گیا ہے۔

(ب) تشریح:

پیشِ نظر سطور سبق کا آخری حصہ ہے جس میں مصنف نے اسلامی نظریات اور مسلمانوں کے نصب العین کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اسلام کے بارے میں یہ تصور غلط ہے کہ یہ امراء اور بادشاہوں کا مذہب ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام ایک ضابطہ حیات ہے جو کہ قرآن پر مبنی ہے اور جاہلوں' ظالموں' مفاد پرستوں اور امراء کے اذہان کی پیداوار نہیں۔ اسلام ایک الہامی دین ہے جس میں انسانیت کی بھلائی کا ذکر مضمر ہے اس کا مخاطب ہر انسان ہے۔ اسلام تمام جھوٹے دنیاوی خداؤں سے منہ موڑ کر اللہ کی وحدانیت کو تسلیم کرنے' اسے کائنات کا حاکم مطلق جاننے' قرآنِ مجید کو انسانی ضابطہ حیات سمجھنے' رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے محبت و الفت رکھنے اور انکی مکمل پیروی کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے   اسلام ترا دیس ہے تُو مصطفوی ہے

مسلمان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صفات کا امین ہوتا ہے۔ خود اعتمادی یعنی اپنی ذات پر بھروسہ اسکا جوہر' انکساری' عاجزی اور امن پسندی اسکا شیوہ' جہد و عمل اور سعی اسکی عادت' صبر و تقویٰ اور پرہیزگاری' اس کا سب سی مساوی سلوک' اس کا نعرہ' رواداری' حسنِ سلوک اور خدمتِ خلق اس کی فطرت، ہر ایک سے محبت اور ہر ایک کے حقوق کا تحفظ اس کا ایمان ہے۔ یہی لوازماتِ مومن ہیں جو پاکستان کے مسلمانوں کا نصب العین اور شعار ہے۔

جدید سائنس اور عصری تقاضے

اقتباس نمبر(۱):

''پیغام رسانی کی اِن سب ایجادات کی وجہ سے دنیا سمٹ کر اتنی چھوٹی ہو گئی کہ دنیا کے دور دراز خطے میں بیٹھے ہوئے شخص سے اور اپنے اہل خانہ سے ایک ہی وقت میں اپنے کمرے میں بیٹھ کر گفتگو کرنا ممکن ہو گیا۔ کمپیوٹر کی ایجاد نے حساب کے پیچیدہ مسئلوں کو بازیچۂ اطفال بنا دیا ہے۔''

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت سائنسی مضمون ''جدید سائنس اور عصری تقاضے'' سے لی گئی ہے۔ جس کے مصنف مشہور سائنس دان ڈاکٹر حفیظ

الرحمٰن صدیقی ہیں۔

(ب) تشریح:

پیغام ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کے لیے جدید سے جدید چیزیں ایجاد ہو رہی ہیں۔ سب سے پہلے ریڈیو، پھر ٹیلی وژن، ٹیلی فون، ٹیلی پرنٹر، وائرلیس، فیکس، انٹرنیٹ، موبائل کی ایجادات نے پوری دنیا کو ایک کمرے کی مانند بنادیا ہے۔ ایک شخص دنیا کے دور دراز علاقے میں بیٹھنے کے باوجود اپنے اہلِ خانہ دوست واحباب، رشتہ داروں یا دنیا کے کسی بھی علاقے میں باآسانی دوسرے شخص سے گفتگو کر سکتا ہے بلکہ دوسرے شخص کو دیکھ بھی سکتا ہے۔ فیکس کے ذریعے پوری دنیا میں ایک خط یا لیٹر کو فوٹو اسٹیٹ کی طرح لمحوں میں وصول کیا جاسکتا ہے۔ انٹرنیٹ اور موبائل کا استعمال بچہ بچہ جانتا ہے۔ کمپیوٹر کی ایجاد نے ریاضی کے مشکل سے مشکل مسئلے کو حل کرنا اتنا آسان کر دیا ہے، جیسے بچوں کا کھیل کھیلنا۔

اقتباس نمبر (۲):

"سائنس کی تمام ایجادات اور کامیابیوں میں سے اس کی دو ایجادات سب سے اہم اور سب سے زیادہ ہمہ جہت ہیں۔ کیونکہ ان ہی پر سائنس کی تمام ترقیوں کا دارومدار ہے۔ اس میں سے ایک ایجاد پہیے کی ہے اور دوسری بجلی کی۔ ان دونوں ایجادات کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اگر یہ دونوں، چشمِ تصور میں، واپس لے لی جائیں تو سائنس کی تمام ترقیاں یکلخت رک جائیں اور انسانی معاشرہ صدیوں پیچھے چلا جائے۔"

JOIN FOR MORE!!!

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت سائنسی مضمون "جدید سائنس اور عصری تقاضے" سے لی گئی ہے۔ جس کے مصنف مشہور سائنس دان ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن صدیقی ہیں۔

(ب) تشریح:

آج جو ہم سائنس کی بے شمار ایجادات دیکھ رہے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھا رہے ہیں ان سب میں سب سے اہم دو چیزیں ہیں جن کے بغیر کسی بھی ایجاد کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہر ایجاد میں ان دو چیزوں کا استعمال ضرور ہوتا ہے۔ یہ دو ایجادات پہیہ اور بجلی ہیں۔ سائنس کی ترقی کا انحصار انھی دو چیزوں پر ہے۔ اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ بجلی ناپید ہو گئی ہے اور پہیے کا وجود بھی ختم ہو گیا ہے تو ہم دیکھیں گے کہ معاشرہ کئی سو سال پیچھے چلا گیا ہے اور پتھر کا زمانہ واپس آگیا ہے۔ پہیے کو دنیا کی سب سے پہلی ایجاد بھی کہا جاتا ہے۔ اس سے مراد گاڑیوں میں لگے ہوئے پہیے نہیں بلکہ مختلف مشینوں میں استعمال ہونے والی گراریاں بھی ہیں جن کے بغیر کوئی مشین حرکت نہیں کر سکتی۔ موجودہ دور میں ہر مشین بجلی کی مدد سے چلائی جاتی ہے اور خود بجلی بھی پہیے ہی کی مدد سے بنتی ہے۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کی تمام ٹیکنالوجی مع کمپیوٹر، بجلی اور پہیے کی وجہ سے ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا بالکل بجا ہے کہ ان دونوں چیزوں کا نعم البدل کوئی بھی نہیں ہے اور ان کے بغیر ہم جہالت اور تاریکی کے دور میں پہنچ جائیں گے۔

اِقتباس نمبر (۳):

"اس نے انسان کے لیے زندگی آرام دہ اور فرحت بخش بنادی ہے۔ بیماروں کے لئے آبِ شفاء ہے کسانوں کے لیے خوشحالی کی کلید ہے۔ اہلِ صنعت کے لیے یہ جادو کی چھڑی ہے۔ کاروبارِ حیات کی گاڑی کو رواں دواں رکھنے کے لیے یہ قوت و توانائی کا سب سے بڑا منبع ہے اور دنیا میں انسانوں کی روز افزوں آبادی کی کفالت کی ضمانت ہے۔"

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت سائنسی مضمون "جدید سائنس اور عصری تقاضے" سے لی گئی ہے۔ جس کے مصنف مشہور سائنس دان ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن صدیقی ہیں۔

(ب) تشریح:

مندرجہ بالا اقتباس میں مصنف سائنس کے فوائد وثمرات کے بارے میں واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سائنس پہلے شوقیہ علم ہوا کرتی تھی اب انسان کی اہم ضرورت بن گئی ہے۔اس نے انسان کے لئے زندگی آرام دہ اور فرحت بخش بنادی ہے۔زندگی کے ہر شعبے میں اس کی کارفرمائیاں نظر آرہی ہیں۔بیماروں کے لئے اس نے دواؤں کے حصول کو آسان بنادیا ہے بیماری کی تشخیص کے لئے ہر قسم کی مشینری موجود ہے لہٰذا بیماریوں کا علاج ممکن ہوا۔کسانوں کے لئے یہ اس طرح خوشحالی کی کلید ثابت ہوئی ہے کہ زیادہ سے زیادہ فصل حاصل کرنے کے مشینری اور کیمیائی کھادوں کی فراہمی اس کی وجہ سے ممکن ہوئی۔اب کسان سال میں دو کے بجائے چار فصلیں حاصل کر رہے ہیں۔صنعتوں کے فروغ کے لئے طرح طرح کی مشینری کا حصول اسکی وجہ سے ممکن ہوا۔زندگی کو تیز رفتار بنانے کے لئے اس نے جدید اور طرح طرح کے تیز رفتار ذرائع آمدورفت فراہم کئے۔انسانوں کی روز بروز بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات کو پورا کرنے میں اس کا کردار انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔انسان چاند تک پہنچ چکا ہے مگر ابھی بھی ہم سائنس کی ترقی کی آخری حد قرار نہیں دے سکتے وہ بہت آگے ہے جس کو انسان ابھی اپنے تصور میں بھی نہیں لا سکتا۔

اِقتباس نمبر(۴):

”ہمیں یہ بات بھی جان لینی چاہئے کہ سائنس کی تعلیم سے اعتقادی فائدے بھی حاصل ہوتے ہیں۔اس لیے بھی مسلمان کو سائنس ضرور پڑھنی چاہئے۔اس سے ایمان کو تازگی اور تقویت حاصل ہوتی ہے۔“

JOIN FOR MORE!!!

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت سائنسی مضمون ”جدید سائنس اور عصری تقاضے“ سے لی گئی ہے۔ جس کے مصنف مشہور سائنس دان ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن صدیقی ہیں۔

(ب) تشریح:

مندرجہ بالا اقتباس میں مصنف ایک اور پہلو سے سائنس کی اہمیت بیان کررہے ہیں۔ مصنف کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو سائنس ضرور پڑھنی چاہئے کیوں کہ سائنس کو پڑھنے سے مسلمانوں کا اللہ تعالیٰ پر اس کے احکامات پر اعتقاد اور بھی مضبوط ہوگا۔ سائنس وہ تمام باتیں دریافت کررہی ہے جو آج سے چودہ سو سال پہلے قرآن نے بتائی تھیں۔جب ایک مسلمان قرآن کی بتائی ہوئی کسی چیز کے ساتھ سائنس کی مطابقت دیکھتا ہے تو اس کا ایمان تازہ ہوجاتا ہے۔ بلکہ صرف مسلمان ہی نہیں، غیر مسلم بھی سائنس کی دریافت کو قرآنی تعلیمات کے مطابق دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتے۔ بہت سے سائنس دان اللہ کے وجود اور اس کی وحدانیت کے قائل ہوتے جارہے ہیں۔خود مصنف نے اگلی سطور میں فرانس کے مشہور ڈاکٹر مورس بوکائے (Maurice Bucaille) کا ذکر کیا ہے جو ماں کے پیٹ نشوونما پانے والے بچے کی دریافت کو دیکھ کر مسلمان ہوگیا کیوں کہ سائنس نے بچے کی جن جن حالتوں کا ذکر کیا ہے وہ بالکل اسی طرح قرآن پاک میں پہلے سے موجود ہیں۔

ایک شام ماضی کی محرابوں میں

تعارفِ مصنف:

ابن انشاء شیر محمد خان دورِ حاضر کے مشہور و معروف سفر نامہ نگار، مزاح نگار اور کالم نگار ہیں۔ان کے سفر نامے ان کے نثری اسلوب کے آئینہ دار ہیں۔ان کی تحریریں سادہ ' رواں ' برجستہ اور پرمزاح ہوتی ہیں۔ان کے سفر ناموں کے مطالعے کے دوران ایسا محسوس ہوتا ہے گویا قاری ان کے ساتھ موجود ہے اور ان کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا ہے۔ کسی بھی موڑ پر قاری کو اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔بقول ابراہیم جلیس:

”ابنِ انشاء عہدِ حاضر کا منفرد مزاح نگار ہے جس کے کالم اور سفرنامے اس کی پرمزاح نثر نگاری کے عکاس ہیں۔“

سفر نامہ کا تعارف:

اپنے اس سفر نامے میں ابنِ انشاء دمشق کے حوالے سے مختلف مقامات کی سیر کا حال بیان کر رہے ہیں۔ جن میں بازار، مقبرے، مساجد اور تاریخی مقامات وغیرہ شامل ہیں۔ اس سفرنامے کے ذریعے انھوں نے قارئین کو بتانا چاہا ہے کہ ان کا ماضی کیا تھا، کتنا عظیم تھا، کس قدر جاہ وحشم سے بھرا ہوا تھا اور کس قدر بہادری اور شجاعت کے کارناموں سے پر تھا۔ انھوں نے اس طرف بھی نشاندہی کی ہے کہ اس وقت میں اور اب میں کتنا فرق ہو گیا ہے اور مسلمان کس قدر پستی میں گر گئے ہیں۔

اقتباس(ا):

"سامنے اس فاتح کی آرام گاہ تھی جس کے پرچم کے آگے مشرق اور مغرب سرنگوں تھے۔ جس نے یورپ کے متحدہ لشکروں کا سامنا کیا اور اپنی فتوحات اور حسنِ اخلاق کی داستانیں چھوڑ گیا۔ آج جب کہ سرزمینِ شام کے ایک کونے اور بیتِ المقدس کو غاصبوں نے دبا رکھا تھا اور فلسطین کے مہاجر صحراؤں میں دربدر پھر رہے تھے یہ فاتح لمبی تانے سو رہا تھا۔ ہم نے کہا اے غازی! اٹھ کہ تو اب نہیں اٹھے گا تو کب اٹھے گا۔ کیا خوب قیامت کا بھی ہو گا کوئی دن اور؟"

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت "ایک شام ماضی کی محرابوں میں" سے لی گئی ہے جس کے مصنف اردو کے مایہ ناز سفر نامہ نگار ہیں ابن انشاء ہیں۔ یہ مضمون ابن انشاء کے سفر نامے "آوارہ گرد کی ڈائری" سے لیا گیا ہے۔

JOIN FOR MORE!!!

(ب) تشریح:

مندرجہ بالا اقتباس میں مصنف اس وقت کا ذکر کر رہے ہیں جب وہ سلطان صلاح الدین کے مزار میں داخل ہوئے۔ مصنف کہتے ہیں کہ جب وہ چھوٹے دروازے سے اندر داخل ہوئے تو سامنے مسلمانوں کے عظیم فاتح سلطان صلاح الدین کی قبر تھی۔ جس میں وہ آرام فرما رہے تھے۔ انشاء جی کہتے ہیں کہ یہ وہ عظیم، بے باک اور مخلص مجاہدِ دین ہے جس کی بہادری و سرفروشی کی داستانیں دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہیں اور جس کی عظمت کا اعتراف ہر قوم اور ہر دور کے لوگوں نے کیا ہے۔ یہی وہ مردِ مجاہد ہے جو اس سلطانی امت کا سربراہ رہا ہے اور جس کے دور میں مسلمانوں نے کفار و مشرکین کے بڑے بڑے لشکروں کو شکستِ فاش عطا کی۔ اس باہمت رہنما کی بدولت ہی مسلمان اس کرۂ ارض کے کونے کونے میں پھیل گئے اور دشمنانِ دین پر اسلام کی دھاک اور اسلام کا رعب و دبدبہ بیٹھ گیا۔

بیت المقدس، مسلمانوں کا قبلہ اول عیسائیوں کے قبضے سے پہلی بار حضرت عمر فاروق نے آزاد کرایا تھا لیکن وہ پھر عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے اسے اپنی جدوجہد کے ذریعے دوبارہ حاصل کر لیا لیکن ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں اس پر یہودیوں کا قبضہ ہو گیا جو آج تک برقرار ہے۔ فلسطین پر قبضے کے بعد اس ملک کے باشندے دربدَر بھٹک رہے ہیں۔

مصنف یہ عظیم الشان تاریخ بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ دورِ حاضر میں بھی امتِ مسلمہ کو ایسے ہی مومن کی ضرورت ہے جو دنیا کے بے گھر اور پستی میں گھرے ہوئے مسلمانوں کو دوبارہ عظمتِ رفتہ کی طرف لوٹا دے اور یہ ملت ایک بار پھر دنیا کی امامت کا منصب سنبھال لے۔ فلسطین میں جس طرح مسلمانوں کو بے دردی سے بے گھر کیا گیا اور بیت المقدس پر یہودیوں نے جس ہٹ دھرمی سے قبضہ کیا وہ مسلمانوں کو للکار للکار کر کہہ رہا ہے کہ ہے کوئی غازی جو اٹھے اور اپنی مدد کرے۔ اس قوم کو ذہنی و جسمانی غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرائے۔

مصنف کے ذہن میں یہ تمام واقعات بالکل واضح طور پر سامنے آجاتے ہیں اور وہ جوش و جذبات میں بے اختیار اس عظیم رہنما سے مخاطب ہو جاتے ہیں کہ اے فاتح! مسلمانوں کا اب بہت برا حال ہے۔ دنیا بھر میں جگہ جگہ اللہ کے بندے تیرے منتظر ہیں۔ اتنے ظلم و ستم ہیں گویا قیامت کے مناظر ہمارے سامنے گھوم رہے ہیں۔ قیامت کے روز تو سب کو دوبارہ اٹھایا جائے گا، تو کب اٹھے گا کہ قیامت بھی آپہنچی ہے۔

بقول غالب

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا بھی ہو گا کوئی دن اور

میکسیکو سٹی اور میں

اقتباس نمبر(ا):

”ہسپانوی عہد ہی میں اٹلی، فرانس اور اسپین سے مشہور معمار بلائے گئے۔ جنھوں نے اس شہر کو تین صدیوں تک بلند کاخ و کلیسا سے آراستہ کیا۔ انیسویں صدی میں کچھ عرصے کے لیے فرانسیسی بادشاہ میکسی ملین بھی انگلی کٹوا کر شہیدوں میں شامل ہو گیا۔ اس کی جامہ زیب ملکہ کو اپنے خاوند سے عشق تھا اس لیے اس نے میکسیکو کی مشہور شاہراہ ”ریفارما“ بنوائی جو سیدھی محل پر جا کر ختم ہوتی ہے تا کہ وہ اپنے مجازی خدا کو دور ہی سے آتا جاتا دیکھ سکے۔“

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت ”میکسیکو سٹی اور میں“ سے لی گئی ہے جس کی مصنفہ بیگم اختر ریاض الدین ہیں۔ یہ مضمون بیگم اختر ریاض کے سفر نامے ”دھنک پر قدم“ سے لیا گیا ہے۔

(ب) تشریح:

میکسیکو سٹی کے دورے کے دوران مصنفہ اس شہر کی تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ یہ ایک قدیم اور تاریخی شہر ہے۔ جس زمانے میں یہ علاقہ اسپین کے قبضے میں تھا اس زمانے میں اٹلی، فرانس اور اسپین سے اپنے کام میں مہارت رکھنے والے کاری گر اور معمار بلوائے گئے۔ ان کاری گروں نے تین سو سالوں تک اس شہر کی تعمیر میں حصہ لیا اور آج جو ہمیں بڑے بڑے محل اور شاندار گرجا نظر آ رہے ہیں یہ سب ان کی محنت کا نتیجہ ہے۔ اس کے بعد انیسویں صدی میں کچھ عرصے تک یہ علاقہ فرانس کے بادشاہ میکس ملین کے قبضے میں بھی رہا۔ یہاں کی عالی تعمیرات کو دیکھ کر اسکے دل میں بھی خواہش پیدا ہوئی کہ وہ بھی کچھ عمارتیں بنوائے تا کہ تاریخ میں اس کا نام بھی شامل ہو جائے۔ اسنے اپنی اس خواہش پر عمل کیا اور چند عمارات تعمیر کروئیں اس کی اسی بات کو مصنفہ نے لکھا ہے کہ وہ بھی انگلی کٹوا کر شہیدوں میں شامل ہو گیا۔ اسی بادشاہ کی ملکہ جو ہمیشہ اچھے لباس پہنتی تھی، اس نے اس شہر کی مشہور شاہراہ ”ریفارما“ بنوائی جو سیدھی اس کے محل پر جا کر ختم ہوتی تھی۔ اس سے اس کا مقصد عوام کو فائدہ پہنچانا نہیں تھا بلکہ وہ چاہتی تھی کہ وہ اپنے شوہر کو آتا ہوا دُور سے دیکھ لے اور اسی طرح جب وہ محل سے جائے تو اسے دیر تک دیکھتی رہے۔ یہ بات اس کی شوہر سے محبت کی دلیل ہے۔

یہاں مصنفہ نے اس بات کا تذکرہ کر کے بادشاہ اور ملکہ کے ازواجی تعلقات کے خوشگوار ہونے کی اطلاع دی ہے۔ یہی تحریر کی خوبی ہے کہ معلومات کے ساتھ ساتھ ایسی باتیں بھی لکھی جائیں جس سے معاشرے میں لوگوں کے درمیان میل محبت میں اضافہ ہو۔

خطوط غالب

خط(ا)

نامہ نگار: مرزا اسد اللہ خان غالب مکتوب الیہ: میر مہدی مجروح

تعارفِ نامہ نگار:

مرزا غالب عظیم شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ مخصوص، منفرد اور جدید خطوط نگاری کے موجد تھے۔ خطوط میں بے تکلفی، سادگی، اختصار و جامعیت، جزئیات نگاری، نکتہ نگاری اور مزاح و ظرافت کو اپنانے، مختلف اسالیبِ بیان مہارت سے کھپانے اور انھیں اپنی سوانح حیات اور

اپنے زمانے کی تاریخ بتانے والے وہ منفرد دانش ور ہیں جن کے خطوط اردو نثر میں نیا تجربہ اور نقشِ اول ثابت ہوئے۔ انھوں نے اپنے اس موقف کو سچ کر دکھایا کہ ان کی خطوط نگاری شاعری کی طرح ان کے دعویٰ کی سچائی پیش کرتی ہے کہ

صدائے عام ہیں یارانِ نکتہ داں کے لئے اادائے خاص سے غالب ہوا نکتہ سرا

تعارفِ مکتوب الیہ:

میر مہدی مجروح، میر حسن فگار کے بیٹے اور غالب کے عزیز ترین شاگردوں میں سے تھے۔ غدرِ دہلی میں، دلی چھوڑ کر پانی پت چلے گئے، پھر بسلسلہ ملازمت الور منتقل ہوگئے۔ آخری زمانے میں نواب حامد علی خان والی رام پور نے سرپرستی کی۔ آپ ایک عمدہ مرثیہ گو تھے۔ غالب کے خطوط کے مجموعے "عودِ ہندی" اور "اردوئے معلّٰی" میں ان کے نام غالب کے بہت سے خطوط ہیں۔ یہ خط بھی ان میں شامل ہے۔

اقتباس(۱):

"تمہارے خط کے آنے سے وہ خوشی ہوئی، جو کسی دوست کے دیکھنے سے ہو۔ لیکن زمانہ وہ آیا ہے کہ ہماری قسمت میں خوشی ہے ہی نہیں۔ خط سے معلوم ہوا تو کیا معلوم ہوا کہ ڈھائی سو دیے۔ ان دنوں میں ڈھائی روپے بھی بھاری ہیں۔ ڈھائی سو کیسے ہیں، سبحان اللہ۔ باوجود اس تہی دستی کے پھر بھی کہنا پڑتا ہے کہ روپے گئے بلا سے آبرو بچی۔"

JOIN FOR MORE!!!

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت اسد اللہ خان غالب کے خط سے لی گئی ہے۔ یہ خط غالب نے اپنے شاگرد میر مہدی مجروح کے نام تحریر کیا ہے۔

(ب) تشریح:

پیشِ نظر سطور میں غالب میر مہدی مجروح سے مخاطب ہیں۔ غالب خوشی کا اظہار انتہائی جذباتی انداز میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ خط ملنے سے ایسی مسرت ہوئی جیسے کسی دوست سے ملنے میں ہوئی ہے۔

یہ احساسات غالب کے میر مہدی سے قلبی تعلق اور گہری محبت و الفت کی دلیل ہیں۔ غالب اظہارِ مسرت کے ساتھ یک دم اظہارِ افسوس کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ ہماری قسمت میں خوشی کہاں؟ غم اور مصیبت و پریشانی جن سے ہمارا پرانا یارانہ ہے کو یہ گوارا نہیں کہ ہم خوش رہ سکیں۔ کیونکہ گرد و پیش کا ماحول غم آلود ہے۔ قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے، شہر کے حالات بہت مخدوش اور دکھی ہیں کیونکہ غدر کی ناکامی کے باعث ہر طرف خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے۔ انگریز ظلم و ستم ڈھانے پر تلا ہوا ہے۔

ان حالات نے دل کو رنجیدہ اور ملول کر دیا ہے۔ ہر خوشی کافور ہو گئی ہے۔ بد قسمتی نے آگھیرا ہے۔ خدا کسی قوم کو عروج کے بعد زوال یا حکمرانی کے بعد محکومی سے ہمکنار نہ کرے۔ آپ کے خط سے پتہ چلا کہ سرفراز حسین کو ڈھائی سو روپے جرمانہ کی ادائیگی کے بعد انگریزوں کے ظلم و ستم سے چھٹکارا مل گیا ہے۔ اس پر آشوب دور میں جب کہ لوگ بھوکوں مر رہے ہیں، ڈھائی سو روپے کی رقم معمولی نہیں۔ غربت اور مالی پریشانی میں اس رقم کی ادائیگی کا سن کر کانوں پہ ہاتھ رکھنے کو دل چاہتا ہے۔ لیکن یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لیتے ہیں کہ پیسہ ہاتھ کا میل ہے، دولت جان کا صدقہ اور آبرو کی ڈھال ہوتی ہے۔ روپے گئے تو گئے کم از کم آبرو تو بچ گئی، یہی کافی ہے۔ اللہ کا شکر ہے جس نے بے آبروئی سے بچایا اور یہ راستہ پیدا کیا۔

اقتباس(۲):

"میاں، کیا باتیں کرتے ہو؟ میں کتابیں کہاں سے چھپواتا؟ روٹی کو نہیں، جاڑے آتے ہیں، لحاف توشک کی فکر ہے، کتابیں کیا چھپواؤں گا؟"

ربطِ ماقبل:

غالب نے اپنے شاگرد میر مہدی مجروح کے خط کے جواب میں انھیں خط لکھا اور ان کا خط ملنے پر دلی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے خط کو بالمشافہ ملاقات کے مترادف قرار دیا اور غدرِ دہلی کے بعد اہلِ دہلی پر نازل ہونے والی مصیبتوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ میر مہدی مجروح کے بھائی میر سرفراز حسین کو نوکری کے حصول کے لئے الور جانے کی تلقین کی ہے۔

(الف)مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت اسد اللہ خان غالب کے خط سے لی گئی ہے۔ یہ خط غالب نے اپنے شاگرد میر مہدی مجروح کے نام تحریر کیا ہے۔

(ب) تشریح:

ان سطور میں مراسلہ نگاری میں ان کی مکالمہ نگاری کی خصوصیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان کے اس دعویٰ کا ہلکا سا ثبوت ملتا ہے کہ ”میں نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا“۔ یہ اقتباس ظاہر کرتا ہے کہ میر مہدی نے جب غالب سے ان کی کتاب کی اشاعت کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ مرزا غالب کی یہ مذکورہ کتاب فارسی زبان میں تھی اور ۱۸۵۷ء کے غدر کے حالات کے بارے میں تھی۔ اس کتاب کا نام دستنبو تھا۔ اس میں انھوں نے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے ۲۱ جولائی ۱۸۵۸ء تک کے حالات قلمبند کئے تھے۔ غالبؔ میر مہدی سے مخاطب ہیں کہ میاں تم کتاب کی اشاعت کے بارے میں پوچھتے ہو کہ کیوں نہیں چھپواتا؟ عدم اشاعت کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میں کتاب کیسے چھپوا سکتا ہوں۔ سوچو! جس کے پاس بنیادی ضروریات یعنی روٹی، کپڑا اور مکان کی تکمیل کا سامان نہ ہو، زندگی گزارنے کی سکت نہ ہو وہ کتابیں کیسے شائع کر سکتا ہے۔

میاں! یہاں تو کھانے کو روٹی میسر نہیں، اوڑھنے بچھونے کے سامان لحاف وغیرہ کا انتظام نہیں۔ یعنی اس قدر رقم نہیں کہ زندگی کے بنیادی تقاضے پورے کیے جا سکیں تو کتابوں کی اشاعت کے لئے رقم کہاں سے آئے گی۔ غرض یہ کہ ان سطور میں غالب جیسے عظیم اور بے نظیر شاعر و دانشور کی معاشی بدحالی اور غربت کا اظہار ہوتا ہے۔ جو اپنی زندگی پر سکوں نہیں گزار سکتا تھا۔ غالب کہتے ہیں مانا کہ جب کتابیں چھپ کر آئیں گی تو ان کی آمدنی سے میری مالی حالت بہتر ہوگی، لیکن کتابیں چھپوانے میں جو خرچہ ہو گا وہ میں کہاں سے لاؤں؟ میں تو بنیادی ضروریات پوری کرنے کو پریشان ہوں۔

اقتباس(۳):

”اہلِ خطہ کا حال ازروئے تفصیل مجھ کو کیوں معلوم ہو؟ سنتا ہوں کہ دعویٰ خون پیش کیا چاہتے ہیں۔ سودا ہو گیا۔ مسودہ ہو رہا ہے۔ ایک صاحب کے جے پور میں ٹکڑے اڑ گئے۔ گورنر مدعی نہ ہوئے، قصاص نہ لیا۔ اب ہندوستانی کے خون کا قصاص کون لے گا؟ خیر جو ہونا ہے ہو رہے گا۔ بعدِ وقوع ہم بھی سن لیں گے۔ تم اتنا کیوں دل جلا رہے ہو؟“

(الف)مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت اسد اللہ خان غالب کے خط سے لی گئی ہے۔ یہ خط غالب نے اپنے شاگرد میر مہدی مجروح کے نام تحریر کیا ہے۔

(ب) تشریح:

پیشِ نظر سطور میں غالبؔ نے میر مہدی کو ان کے استفسار پر جنگِ آزادی کے بعد ہندوستان پر اس کے اثرات سے آگاہ کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کو معاشی، سماجی سیاسی اور تہذیبی طور پر تباہ کن اثرات اور حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ اور گلی گلی کوچے کوچے کیسی قتل وغارت گری مچی۔

غالبؔ کہتے ہیں کہ میرے محلے میں جو قتل وغارت گری مچی اسکی تفصیل تو مجھے معلوم نہیں البتہ اتنا معلوم ہوا ہے کہ جو لوگ مارے گئے ان کے ورثاء سرکار سے بدل کے مطالبے کی تیاری کر رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کا مطالبہ حکومت نے مان لیا ہے اور خون بدل کے طور پر رقم دینے پر راضی ہو گئی ہے۔ معاہدے کی دستاویز بھی تیار ہو گئی ہے۔

ایک اطلاع کے مطابق جے پور میں ہندوستانیوں نے ایک انگریز (بلیک صاحب) کو بے دردی سے قتل کر دیا ہے اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ جے پور کے گورنر نے اس قتل پر شدید ردِ عمل کا مظاہرہ نہیں کیا، نہ ہی اس نے اس انگریز کے خون بدل کے طور پر قاتلوں سے کوئی معاوضہ طلب کیا۔ سوچنے کی بات ہے کہ جب انگریز کی حکومت میں انگریز کے قتل ہونے کی یہ صورت ہے جو متوقع نہیں تھی، تو پھر کبھی مسلمان یا ہندو کے قتل ہونے پر انگریز حکومت سے قصاص یا خون کے بدل کا دعویٰ کرنے کی کون ہمت کر سکتا ہے۔

اس نثر پارے کے جملے "اب ہندوستانی کے خون کا قصاص کون لے گا؟" سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنگِ آزادی کے بعد کس قدر نفسا نفسی اور قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ ہندوستانی و انگریز دونوں کی جانیں غیر محفوظ تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ غالب کا یہ خط ان حالات کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ خط ہی تاریخی دستاویز ہے۔

خط(۲)

نامہ نگار: مرزا اسد اللہ خان غالب مکتوب الیہ: یوسف مرزا

تعارفِ نامہ نگار:

مرزا غالب عظیم شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ مخصوص، منفرد اور جدید خطوط نگاری کے موجد تھے۔ خطوط میں بے تکلفی، سادگی، اختصار و جامعیت، جزئیات نگاری، نکتہ نگاری اور مزاح و ظرافت کو اپنانے، مختلف اسالیب بیان مہارت سے کھپانے اور انھیں اپنی سوانح حیات اور اپنے زمانے کی تاریخ بنانے والے وہ منفرد دانش ور ہیں جن کے خطوط اردو نثر میں نیا تجربہ اور نقشِ اول ثابت ہوئے۔ انھوں نے اپنے اس موقف کو سچ کر دکھایا کہ ان کی خطوط نگاری شاعری کی طرح ان کے دعویٰ کی سچائی پیش کرتی ہے کہ

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صدائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

تعارفِ مکتوب الیہ:

یوسف مرزا کا اصل نام ناصر الدین حیدر خاں تھا اور نواب سید محمد نصیر خاں کے فرزند تھے جو لکھنؤ میں رہتے تھے۔ ان کی والدہ قدسیہ سلطان، مرزا غالب کے دوست حسین مرزا کی بہن تھیں۔ انھوں نے زندگی کا زیادہ تر حصہ دہلی میں گزارا۔ غالب، حسین مرزا کے بیٹوں سجاد مرزا اور اکبر مرزا اور بھانجے یوسف مرزا کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ یہ خط انہیں کے نام ہے جو دراصل یوسف مرزا کے باپ کے انتقال پر غالب کی طرف سے تعزیتی مکتوب ہے۔

اقتباس(ا):

"کیوں کر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا اور اگر تجھ کو لکھوں تو پھر آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو، مگر صبر؟ یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار کا ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہین کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا اور لوگ اسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیوں کر نہ تڑپے گا۔ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں' دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا، پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سرو پا کس کو کہتے ہیں تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو۔"

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت اسد اللہ خان غالب کے خط سے لی گئی ہے۔ یہ خط غالب نے اپنے بھانجے یوسف مرزا کے نام تحریر کیا ہے۔

(ب) تشریح:

پیشِ نظر سطور مرزا غالب کے خط یوسف مرزا کی ابتدائی سطور ہیں جن میں غالب نے مرزا یوسف سے ان کے باپ کے انتقال پر اظہارِ افسوس یا تعزیت کی ہے۔ مرزا یوسف کے باپ جو انگریز دشمنی کے الزام میں چودہ سال قید میں رہے۔ زنداں میں بیمار ہو گئے انگریز نے ان کی

JOIN FOR MORE!!!

رہائی کا حکم دیا لیکن اس سے قبل ہی وہ دنیا سے رحلت فرما گئے۔ جب غالب کو ان کی وفات کا بذریعہ خط علم ہوا تو جواباً مرزا سے یوں تعزیت کر رہے ہیں۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ میں تمھارے باپ کی موت کا اپنی زبان سے ذکر کروں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح اظہارِ افسوس کروں اور تمھیں تسلی دوں۔ زمانے یا دنیا کا یہ دستور ہے کہ لوگ لواحقین کو صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ سوچو! بھلا یہ کیسا دستور و طریقہ ہے کہ کسی شخص کا عزیز اس سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائے وہ اس کی جدائی پر رنجیدہ اور ملول ہو اور لوگ کہیں کہ اس نقصان پر صبر کرو، آہ و زاری نہ کرو۔ حالانکہ عزیز کی جدائی پر مضطرب اور بے چین ہونا فطری امر ہے، اس پر اسے کہا جائے میاں صبر کرو۔ بھلا کیسے ممکن ہے کہ اسے صبر آ جائے۔ میرے نزدیک تو ایسے ماحول میں صبر کی تلقین کرنا تسلی دینا فضول معلوم دیتا ہے۔ اس لئے کہ چند الفاظ اس کی بے چینی اور تڑپ کو کم نہیں کر سکتے سچ ہے اس دکھ اور غم کا ازالہ نہ تو دعا سے ہو سکتا ہے نہ دوا سے۔ یعنی عزیز کی موت یا فرقت کا داغ آسانی سے نہیں مٹ سکتا جیسا کہ عموماً تصور کیا جاتا ہے۔

مرزا یوسف تمہارا دل یقیناً بہت زخمی اور گھائل ہے۔ تمھیں پہلے ہی بیٹے کی جدائی کا گھاؤ لگا ہوا ہے۔ اب باپ کی جدائی کا بھی غم لاحق ہو گیا ہے۔ سچ ہے جس کے سینے پر ایسے گہرے گھاؤ ہوں، جس کا جگر داغ دار ہو اس سے کہا جائے گریہ و زاری نہ کرو، آنسو نہ بہاؤ، آہ و بکاہ نہ کرو کسی طرح مناسب نہیں۔ آخر باپ کی موت پر اظہارِ غم سے روکنے کا فائدہ کیا ہے۔ کیوں نہ اسے آزاد چھوڑ دیا جائے تا کہ وہ رو رو کر دل کی بھڑاس نکال دے۔

JOIN FOR MORE!!!

آخری جملے میں غالب نے اپنی بلاغت اور شوخی و ظرافت کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ بے سروپا کس کو کہتے ہیں یعنی بے سہارا کسے کہا جاتا ہے تو میرے نزدیک اس کی مثال یوسف مرزا ہے۔ کیونکہ باپ کا سایہ ہمیشہ کے لئے سر سے اٹھ گیا، دورِ مستقبل کا سہارا بیٹا بھی جدا ہو گیا۔ گویا اب یوسف مرزا کا نہ سر ہے اور نہ ہی پیر، اب یوسف بے یار و مددگار رہ گیا ہے۔

اقتباس (۲):

"تمہاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا، یہ بات سچ ہے؟ اگر سچ ہے تو جوانمرد ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا۔ نہ قیدِ حیات رہی، نہ قیدِ فرنگ۔ ہاں صاحب وہ لکھتی ہیں کہ پنشن کا روپیہ مل گیا ہے، وہ تجہیز و تکفین کے کام آیا۔ یہ کیا بات ہے؟ جو مجرم ہو کر چودہ برس کو مقید ہوا ہو، اس کا پنشن کیوں کر ملے گا اور کس کی درخواست سے ملے گا؟ رسید کس سے لی جائے گی؟"

ربطِ ما قبل:

ان سطور سے قبل غالب، یوسف مرزا کے نام ان کے باپ میر نصیر کی وفات پر تعزیت کرتے ہوئے اپنے مخصوص طرزِ بیان میں دستورِ زمانہ کے مطابق تعزیت کرنے کی مخالفت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس شخص کا عزیز اس سے ہمیشہ سے جدا ہو جائے، جس کا دل غم سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے زمانے کے دستور کے مطابق اسے صبر کی تلقین کرنا اور آہ و زاری نہ کرنے کا کہنا عجیب لگتا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے اس کے سوا چارہ بھی نہیں۔

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت اسد اللہ خان غالب کے خط سے لی گئی ہے۔ یہ خط غالب نے اپنے بھانجے یوسف مرزا کے نام تحریر کیا ہے۔

(ب) تشریح:

پیشِ نظر سطور میں غالب مرزا یوسف کو لکھتے ہیں کہ تمھاری دادی کے خط سے معلوم ہوا کہ انتقال سے قبل تمھارے باپ کو انگریزوں کی قید سے چھٹکارے کا حکم ہو گیا تھا۔ اگر یہ بات درست بھی ہے تو کیا فائدہ۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس جواں ہمت، نڈر اور بہادر شخص کو بیک وقت زندگی کے مصائب، تکالیف اور پریشانیوں سے بھی نجات مل گئی اور انگریز کی قید سے بھی۔ سانحہ تو یقیناً عظیم ہے لیکن جو کچھ ہوا ان کے حق میں

اچھا ہوا۔ تمام الجھنوں سے آزادی مل گئی۔ دنیا ایک قید خانہ ہے جہاں انسان کی خواہشات کا خون ہوتا ہے اور وہ اپنی مرضی کے بجائے جبر کی زندگی گزارتا ہے۔ بقول حسرتؔ

مر مٹے ہم تو مٹ گئے سب رنج

یہ بھی اچھا ہوا برا نہ ہوا

تمہاری دادی کے خط سے بھی معلوم ہوا کہ انگریزوں نے جو پنشن دی وہ ان کی تکفین و تدفین میں خرچ ہو گئی۔ بھلا بتائیے اس کے مرنے کے بعد اس کی کیا ضرورت تھی۔ جس شخص کو حق کی حمایت اور انگریز کی مخالفت کی پاداش میں چودہ سال کی قید ہوئی ہو اور پھر وہ دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔ اس کو پنشن ملنا نہ ملنا فضول ہے۔ اب اس کی وصولیابی کی رسید پر کون دستخط کرے گا۔ آہ! وہ پنشن کا مستحق تو دکھ جھیلتے اور حاکم کے ظلم سہتے سہتے اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اب اسے پنشن کا مستحق سمجھنا اور ورثاء کو نوازنا عجب بات ہے۔

اقتباس(۳):

"مصطفی خان کی رہائی کا حکم ہوا۔ مگر پنشن ضبط۔ ہر چند اس پرستش سے کچھ حاصل نہیں۔ لیکن بہت عجیب بات ہے، تمھارے خیال میں جو کچھ آئے گا وہ مجھ کو لکھو۔ دوسرا امر یعنی تبدیلِ مذہب، عیاذاً باللہ! علی کا غلام کبھی مرتد نہ ہو گا۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ حضرت چالاک اور سخن ساز اور ظریف تھے۔ سوچے ہوں گے میں اپنا کام نکالو اور رہا ہو جاؤ۔ عقیدہ کب بدلتا ہے اگر یہ بھی تھا تو ان کا گمان غلط تھا۔ اس طرح رہائی ممکن نہیں۔"

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت اسد اللہ خان غالب کے خط سے لی گئی ہے۔ یہ خط غالب نے اپنے بھانجے یوسف مرزا کے نام تحریر کیا ہے۔

(ب) تشریح:

نواب مصطفی علی خان شیفتہ، مومن خان مومن کے شاگرد تھے۔ مومن کی وفات کے بعد انھوں نے غالب کی شاگردی اختیار کی۔

نواب مصطفیٰ علی خان کی انگریزوں کی قید سے رہائی کے سلسلے میں یہ بات عام طور پر سنی جا رہی تھی کہ وہ آزادی کی خاطر اسلام کو خیر باد کہنے یعنی مذہب قبول کرنے کو تیار تھے۔ ان کا مقصد تھا کہ انگریز خوش ہو جائیں اور انھیں آزاد کر دے۔ غالب کہتے ہیں یہ خبر درست معلوم نہیں ہوتی۔ اللہ سے توبہ اور پناہ مانگتا ہوں بھلا جو شخص دل و جان سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پیرو اور ماننے والا ہو وہ بھلا اسلام کو چھوڑ کر کفر کیسے اختیار کر سکتا ہے۔ ہر گز ہر گز نہیں۔ البتہ مصطفی خان بڑے سمجھدار، باتونی اور ظریفانہ مزاج کے حامل تھے۔ انھوں نے سوچا ہو گا کہ اس وقت انگریز کو دھوکا دے کر چھٹکارا حاصل کر لیا جائے۔ مذاق کا مذاق رہے گا اور اور انگریز دام میں آ گیا تو آزادی بھی مل جائے گی۔

غالب کہتے ہیں کہ جب مذہبی عقائد انسان کے دل میں راسخ اور پختہ ہو جاتے ہیں تو وہ انھیں ترک نہیں کر سکتا اور اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ مصطفی خان اپنے طور پر سمجھ بیٹھے ہیں کہ وہ مذہبِ اسلام کو ترک کر چکے ہیں تو یہ ان کی خام خیالی ہے۔ اس طرح نہ انگریز کو یقین آ سکتا ہے کہ وہ سچ بول رہے ہیں اور نہ خود ان کا اپنا ضمیر اس معاملے میں ان کا ساتھی بن سکتا تھا۔

خطِ اقبال

تعارفِ نامہ نگار:

علامہ اقبال وہ صاحب پیغام مفکّر ہیں جنہوں نے آفاقی شاعری کی بنیاد رکھی اور سازِ سخن کو وسیلہ بنا کر اسلامی انقلاب کے لئے راہ ہموار کی۔ ایک انقلاب آفریں شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ آپ خطوط نگار کی حیثیت سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔ خطوطِ اقبال میں جو لب و لہجہ پایا جاتا ہے اُس میں ایک حکیمانہ وقار، داعیانہ جوش و جلال اور درد مندانہ تڑپ ہے۔

JOIN FOR MORE!!!

تعارفِ خط:

یہ خط اقبال نے اُس وقت تحریر کیا جب وہ بحری جہاز پر دہلی سے انگلستان کا سفر طے کر رہے تھے۔ خطوط نگار کا مقصد انگلستان میں اعلیٰ تعلیم کا حصول تھا جس کا ذکر انھوں نے اپنے خط میں بھی کیا ہے۔ اِس خط میں اقبال نے دہلی اور بمبئی کے واقعات و مناظر کے علاوہ عرب سرزمین کے دیدار پر اپنے
تاثرات بھی بیان کئے ہیں۔ اِس خط سے اُن میں پائی جانے والے عشق کا اظہار ہوتا ہے اور اُن کی شخصیت کا جوش جھلکتا ہے۔

اقتباس نمبر(۱):

”جہاز کے سفر میں دل پر سب سے زیادہ اثر ڈالنے والی چیز سمندر کا نظارہ ہے۔ باری تعالیٰ کی قوت لامتناہی کا جو اثر سمندر دیکھ کر ہوتا ہے شاید ہی کسی اور چیز سے ہوتا ہو۔ حج بیت اللہ میں جو تمدنی اور روحانی فوائد ہیں، ان سے قطع نظر کر کے ایک بڑا اخلاقی فائدہ سمندر کی ہیبت ناک موجوں اور اس کی خوفناک وسعت کا دیکھنا ہے جس سے مغرور انسان کو اپنے ہیچ محض ہونے کا پورا پورا یقین ہو جاتا ہے۔“

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت علامہ اقبال کے خط سے لی گئی ہے۔ علامہ اقبال نے یہ خط اپنے دوست مولوی انشاء اللہ خان کے نام تحریر کیا ہے۔

(ب) تشریح:

علامہ اقبال لکھتے ہیں کہ بحری جہاز کے سفر میں سب سے زیادہ متاثر کرنے والی چیز سمندر کا نظارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی لازوال قوت کا احساس سمندر کے علاوہ شاید ہی کسی چیز سے ہو سکتا ہو۔ سمندر کو دیکھ کر انسان کے دل میں ارادہ قوت پکڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر صفات لامحدود ہیں۔ علامہ اقبال اس خط میں سمندر کی مثال سے اہل ایمان کو ایمان میں پختگی کی اور اہل کفر کو سمندر کے ذریعہ ایمان کی دعوت دے رہے ہیں۔ مزید کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لیے حج کرنے کے یوں تو بہت سے روحانی، جسمانی، معاشی اور معاشرتی فائدے ہیں۔ اس کے علاوہ قوتِ ایمانی کے لیے یا کفر اور جہالت کی دوری کے لیے سمندر کی ہیبت ناک لہروں کا منظر، انسان کے سارے غرور اور تکبر کو دور کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ انسانی آنکھ سمندر کو دیکھ کر اس بات کا یقین کر لیتی ہے کہ وہ فانی، کمزور، لاچار ہے۔ انسان کو اس بات کا پختہ یقین ہو جاتا ہے کہ وہ کسی ہستی کے آگے مجبور ہے۔ وہ ذات اللہ تعالیٰ کی ہے۔

اقتباس(۲):

”اے عرب کی مقدس سرزمین! تجھ کو مبارک ہو۔ تو ایک پتھر تھی جسے دنیا کے معماروں نے رد کر دیا مگر ایک یتیم بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا افسوں کیا کہ موجودہ دنیا کی تہذیب و تمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی۔ تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس نقشِ قدم دیکھے ہیں اور تیری کھجوروں کے سائے نے ہزاروں ولیوں اور سلیمانوں کو تمازتِ آفتاب سے محفوظ رکھا۔“

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت علامہ اقبال کے خط سے لی گئی ہے۔ علامہ اقبال نے یہ خط اپنے دوست مولوی انشاء اللہ خان کے نام تحریر کیا ہے۔

(ب) تشریح:

پیش نظر عبارت اُس وقت کی تحریر ہے جب اقبال عرب کی معتبر زمین یعنی عدن کے ساحل کے نزدیک ہو رہے تھے۔ اُن پر ایک والہانہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور اُن کا قلم جذبات کی رو میں بہہ کر سچے عشق و لگاؤ کی آئینہ داری کرتا ہے۔

اقبال کہتے ہیں کے عرب جغرافیائی اعتبار سے ایسے چٹیل، بیابان اور بے وقعت صحراؤں کا مجموعہ ہے جو انسانی فکر کے پیمانوں سے نہایت بے کراں اور بے حیثیت ثابت ہوا ہے اور جہاں رہنے والے مشکل و پریشانی میں اپنی زندگیاں بسر کرتے ہیں۔ لیکن اِس جہت کی کیا شان ہے کہ یہاں سے حضورِ اقدس، سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنم لیا۔ اس سرزمین کا کیا کہنا جہاں آسمانوں کے آقا صلی اللہ

علیہ وسلم کا بچپن گزرا، جہاں اِس انسان نے علم و معرفت کا بیج بو کر ایک صحرا سے سرسبز و تناور درخت اُگایا۔ عرب کے چٹیل میدان وہ میدان ہیں جہاں ایک ایسی تہذیب و تمدن ترتیب پائی جو پوری دنیا نے اپنائی ہوئی ہے، جہاں اللہ کے وہ برگزیدہ بندے سانس لیتے تھے جنھیں جنت الفردوس کی بشارتیں تھیں اور جہاں وہ شخصیتیں بستی تھیں جن کی پیروی کرتے ہوئے ہم اپنی جانیں قربان کر دیتے ہیں۔

کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا خود نہ تھے جو راہ پر، اوروں کے ہادی بن گئے

یہ خط تحریر کرتے وقت اقبال کا چشم تصور وہ مناظر تخلیق کرتا ہے گویا بندگانِ خدا کا دور واپس آ گیا ہو اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کھجوروں کے درختوں کے نیچے سورج کی تپش سے بچنے کے لئے آرام فرما رہے ہوں۔

اِن عبارات کو رقم کرتے وقت اقبال دینِ خداوندی کے ایک ایسے سمندر میں غوطہ زن نظر آتے ہیں جس کا پانی اگر ساری انسانیت کی پیاس بجھانے کے لئے بھی صرف کر دیا جائے تو بھی اس میں کمی واقع نہ ہو۔

اقتباس(۳):

”کاش میرے بد کردار جسم کی خاک تیرے ریت کے ذروں میں مل کر تیرے بیابانوں میں اڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری زندگی کے تاریک دنوں کا کفارہ ہو۔ کاش میں تیرے صحراؤں میں لُٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پروانہ کرتا ہوا اس پاک سرزمین میں جا پہنچوں جہاں کی گلیوں میں اذانِ بلال کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی۔“

(الف) مصنف اور سبق کا نام:

پیشِ نظر عبارت علامہ اقبال کے خط سے لی گئی ہے۔ علامہ اقبال نے یہ خط اپنے دوست مولوی انشاء اللہ خان کے نام تحریر کیا ہے۔

(ب) تشریح:

وضاحت طلب اقتباس علامہ اقبال کے خط کا آخری حصہ ہے۔ اس حصے میں انھوں نے نہایت جذباتی انداز میں سرزمین عرب کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ رسول اکرم ﷺ سے محبت کے سبب وہ سرزمینِ عرب کو بھی محبت و عقیدت سے دیکھتے ہیں۔ محبت کے اس اظہار کے بعد وہ تمنا کرتے ہیں کہ کاش عرب کی مقدس سرزمین، وہ زمین جہاں حضور اکرم ﷺ کے قدم مبارک پڑے، میں انھیں موت آجائے۔ مرنے کے بعد ان کی خاک عرب کی مٹی میں مل کر اس کے صحراؤں میں دربدر ہو جائے۔ وہ اسے اپنے لئے اعزاز قرار دیتے ہیں۔ اور یہ بات تو مرنے کے بعد کی ہے، زندگی میں بھی ان کی خواہش ہے کہ کسی طرح وہ اس زمینِ مقدس میں جا پہنچیں۔ دنیا کی ہر الجھن سے آزاد ہو کر اور بڑی سے بڑی مشقت کو بھی برداشت کرتے ہوئے ان کی تمنا ہے کہ وہ مدینہ منورہ کی پاک گلیوں میں پہنچ جائیں۔ ان پاکیزہ گلی کوچوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے محبت کی ایک علامت کو بھی استعمال کیا ہے۔ یہ علامت حضرت بلالؓ ہیں جن کی دنیاوی حیثیت کچھ نہ تھی لیکن محبت نے انھیں ایک قابل احترام شخصیت بنا دیا۔

☆.....☆.....☆

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS

بند کی تشریحات

اور

نظموں کے

مرکزی خیال

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS BASIM
www.studypak.xyz

طریقۂ جواب سوال نمبر ۴

سوال نمبر ۴: گیارھویں جماعت کے پرچے میں اس سوال میں طلبہ کو نظم کے بند کی تشریح یا مرکزی خیال میں سے کسی بھی ایک جز کے جواب دینے کا اختیار دیا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ طلبہ کی پسند پر منحصر ہے کہ وہ نظم کے بند کی تشریح کریں یا نظم کا مرکزی خیال تحریر کریں۔

نظم کے جز کی تشریح:

سالِ اوّل میں جزوار نمبر: کُل نمبر: ۸

الف) نظم اور شاعر کا نام۔ ۲ نمبر

ب) بند کی تشریح۔ ۶ نمبر

مرکزی خیال:

اس سوال کا جواب کثرتِ تعبیر کر دیا ہے۔ اگرچہ نظم کا مرکزی خیال فقط دو ایک سطروں میں تحریر کرنا چاہیے، لیکن طلبہ اس کا جواب پھیلا کر لکھتے ہیں۔ اساتذہ کے نوٹس میں 'مرکزی خیال' بہ طرزِ خلاصہ تحریر ہوتا ہے۔ ممتحن بھی اسی کے عادی ہیں اور اتنے ہی مواد پر نمبر دیتے ہیں۔ اساتذہ کی ایک خاص تعداد حقیقی مرکزی خیال لکھتے لکھاتے ہوئے ڈرتی ہے کہ کہیں ان کے طلبہ کے نمبر کٹ نہ جائیں، اس لیے ضروری ہے کہ مرکزی خیال کے کم سے کم مواد پر اتّفاق کر لیا جائے اور کسی بھی صورت مرکزی خیال کی طوالت ۸ یا ۹ سطور سے زائد نہ ہو۔ بصورتِ دیگر نمبر منہا کر لیے جاتے ہیں۔

سالِ اوّل (گیارہویں) میں نمبروں کی تقسیم اس طرح ہے:

الف) شاعر کا مختصر تعارف۔ ۲ نمبر

ب) مرکزی خیال۔ ۲ نمبر

جوابی خاکہ

(الف) تعارفِ شاعر:

(ب) مرکزی خیال:

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS BASIM
www.studypak.xyz

بند کی تشریحات

حمد باری تعالیٰ

بند نمبرا

الٰہی تُو فیاض ہے اور کریم الٰہی تُو غفار ہے اور رحیم
مقدس، معلی، منزہ، عظیم نہ تیرا شریک اور نہ تیرا سہیم
تِری ذاتِ والا ہے یکتا قدیم

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند ہماری کتاب میں موجود نظم حمد سے لیا گیا ہے۔ یہ نظم اردو کے مشہور شاعر نظیر اکبر آبادی کی تحریر کردہ ہے جنھیں عوامی و جمہوری شاعر کہا جاتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس بند میں اردو کے پہلے عوامی اور ترقی پسند شاعر نظیر اکبر آبادی اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے اللہ تو بہت عطا فرمانے والا، بہت زیادہ کرم کرنے والا ہے۔ اے میرے رب تو بڑے بڑے گناہ گاروں کا بخشنے والا اور سب لوگوں پر بہت رحم کرنے والا ہے۔ اے اللہ تیری ذات پاک، بہت اعلیٰ، بے عیب اور بہت بڑی ہے۔ اے اللہ تیری تمام صفات لا محدود اور لامتناہی ہیں۔ اے اللہ تُو واحد، اکیلا اور یکتا ہے تیرا کوئی شریک نہیں، تُو وحدہ' لاشریک ہے۔ اے اللہ تو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ ہی رہے گا۔ تُو ازلی اور ابدی ہے۔ باقی تمام مخلوق فانی ہے۔

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS

بند نمبر۲

ترے حُسنِ قدرت نے یا کردگار! کیے ہیں جہاں میں وہ نقش و نگار
پہنچتی نہیں عقل انھیں ذرّہ وار تحیر میں ہیں دیکھ کر بار بار
ہیں جتنے جہاں میں ذہین و فہیم

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند ہماری کتاب میں موجود نظم حمد سے لیا گیا ہے۔ یہ نظم اردو کے مشہور شاعر نظیر اکبر آبادی کی تحریر کردہ ہے جنھیں عوامی و جمہوری شاعر کہا جاتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس بند میں اردو کے پہلے عوامی اور ترقی پسند شاعر نظیر اکبر آبادی اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے میرے خالقِ حقیقی یہ تیری ہی قدرت کے کرشمے ہیں کہ تُو نے یہ کائنات اتنی حسین و جمیل اور خوب صورت بنائی ہے۔ جس میں کوئی عیب بھی نہیں اور ہم اس کے حسن کو دیکھ کر حیرت میں رہ جاتے ہیں۔ اے اللہ تُو نے جو کائنات میں نعمتیں تخلیق کیں ہیں ہم اُن سب کو دیکھ سکتے نہ سب کو گن سکتے ہیں، نہ

ہم سب کی حکمتیں سمجھ سکتے ہیں۔اے اللہ تُونے اس کائنات کو اس طرح بنایا اور سجایا ہے کہ ہم انسان حیران رہ جاتے ہیں۔بڑے بڑے عقل مند، دانا، حکیم، دانشور تیری تخلیقات اور نقش نگار دیکھ کر فرطِ حیرت سے کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ سب اللہ تُو ہی کر سکتا ہے۔

بند نمبر۳

زمیں پر سمٰوٰت گرداں کیے نجوم ان میں کیا کیا درخشاں کیے
نباتات بے حد نمایاں کیے عیاں بحر سے دڑ و مرجاں کیے
حجر سے جواہر بھی اور زر و سیم

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند ہماری کتاب میں موجود نظم حمد سے لیا گیا ہے۔یہ نظم اردو کے مشہور شاعر نظیر اکبر آبادی کی تحریر کردہ ہے جنھیں عوامی و جمہوری شاعر کہا جاتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس بند میں اردو کے پہلے عوامی اور ترقی پسند شاعر نظیر اکبر آبادی اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے میرے اللہ تُونے نے زمین اور آسمان بنائے ہیں۔ آسمان کو زمین پر بغیر سہارے ، بغیر ستون کے ٹھہرایا۔ آسمان میں ایسے روشن ستارے بنائے جو اندھیری رات میں آسمان کو حسین سے حسین تر کر دیتے ہیں۔اے اللہ تو نے پھل ، پھول سبزیاں ، اناج ہمیں کھانے کے لیے عطا فرمایا۔سمندر میں بھی موجود تیری نعمتوں کو ہم شمار نہیں کر سکتے۔ سمندر میں قیمتی موتی جیسے مرجان وغیرہ تو نے ہی بنائے ہیں۔پہاڑوں میں قیمتی پتھر تو نے ہی پیدا کیے۔ بعض پہاڑوں میں سونا، چاندی اور قیمتی سے قیمتی پتھر انسان حاصل کرتا ہے۔اے اللہ یہ سب تیرا ہی کرم و عنایت ہے۔اے اللہ ہم تیری عطاؤں پر جتنا بھی شکر ادا کریں وہ کم ہے۔

بند نمبر۴

شگفتہ کیے گل، بہ فصلِ بہار عنادِل بھی اور قمری و کبک و سار
بر و برگ و نخل و شجر، شاخ سار طراوت سے، خوش بو سے ہنگامِ کار
رواں کی صبا ہر طرف اور نسیم

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند ہماری کتاب میں موجود نظم حمد سے لیا گیا ہے۔یہ نظم اردو کے مشہور شاعر نظیر اکبر آبادی کی تحریر کردہ ہے جنھیں عوامی و جمہوری شاعر کہا جاتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس بند میں نظیر اکبر آبادی کہتے ہیں کہ اے اللہ تو نے ہی بہار کو حسین و دل کش اور خوش گوار موسم بنایا ہے۔جس میں ہر طرف سبزہ ہی سبزہ دِکھائی دیتا ہے۔ہر طرف تازہ پھول نظر آتے ہیں۔اے اللہ تیری ہی عطا سے پرندوں کی میٹھی میٹھی آوازیں ہمیں سنائی دیتی ہیں۔بلبل، فاختہ، مینا، چکور جیسے خوب صورت پرندوں کو ہم دیکھتے ہیں تو ہم عش عش کر اٹھتے ہیں۔اے اللہ تو نے ہی پھول، پودے، گھنے، شاخوں والے درخت پیدا کیے ہیں۔ جن کی تازگی اور خوش بوؤں سے ہماری زندگی میں خوش گوار ہنگامہ مچ جاتا ہے۔اے اللہ تیرے ہی حکم سے صبح کی تازہ ہوا چلتی ہے۔ بہار کی ہوا، صبح کی ہوا ہماری زندگی میں تازگی اور فرحت پہنچاتی ہے۔یہ سب نعمتیں اے میرے رب تیری ہی عطا سے ہیں۔

بند نمبر۵

عطا کی انھیں دولتِ معرفت عبادت، اطاعت، نکو منزلت

حیا، حُسن، الفت، ادب، مصلحت تمیزِ سخن، خلقِ خوش، مکرمت

فراواں دیے اور نازو نعیم

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند ہماری کتاب میں موجود نظم حمد سے لیا گیا ہے۔ یہ نظم اردو کے مشہور شاعر نظیر اکبر آبادی کی تحریر کردہ ہے جنھیں عوامی و جمہوری شاعر کہا جاتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس بند میں شاعر نظیر اکبر آبادی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو طرح طرح کی نعمتوں سے نوازتا ہے۔ انھیں ایسی سوجھ بوجھ عنایت فرماتا ہے کہ جس سے وہ اپنے حقیقی رب تعالیٰ کو پہچان سکتے ہیں۔ وہ خدا کی عبادت اور اطاعت کر کے انسانیت کے بلند مقام پر فائز ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے ایسے بندوں میں شرم و حیا، فکر و عمل، خوب صورتی، ادب و احترام، لوگوں کے ساتھ خوش خلقی، بزرگی جیسی اعلیٰ خوبیاں اور نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ جبکہ ان تمام خوبیوں اور نعمتوں میں سب سے اعلیٰ نعمت گفتگو کرنے سلیقہ ہے جو انسان کو باقی تمام مخلوقات پر ممتاز بنا دیتا ہے۔ اللہ کے ایسے بندے خیر الناس من ینفع الناس کی تفسیر ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو راحتیں، آسائشیں اور قلبِ سکون بکثرت عطا فرماتا ہے۔

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS BASIM

بند نمبر۶

ترا شکر احساں ہو کس سے ادا ہمیں مہر سے تُونے پیدا کیا

کیے اور الطاف بے انتہا نظیرؔ اس سِوا کیا کہے سر جھُکا

یہ سب تیرے اکرام ہیں یا کریم

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند ہماری کتاب میں موجود نظم حمد سے لیا گیا ہے۔ یہ نظم اردو کے مشہور شاعر نظیر اکبر آبادی کی تحریر کردہ ہے جنھیں عوامی و جمہوری شاعر کہا جاتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس بند میں شاعر اللہ تعالیٰ کے تمام احسانوں کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہا ہے۔ اس کے بعد اقرار کر رہا ہے کہ اے اللہ جس محبت سے تو نے ہمیں پیدا کیا اور جو بے شمار احسانات ہم پر کیے ان کو دیکھتے ہوئے ماننا پڑتا ہے کہ ہم میں سے کوئی تیرے احسانات کا بدلہ بالکل بھی نہیں ادا کر سکتا۔ بلکہ ہم ناقدرے انسان تو تیرا کماحقہ شکر بھی ادا نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ اے میرے ربِ کریم یہ سب تیرا اکرم ہے۔ ہم تیرے کس کس لطف و کرم کا ذکر کریں۔ مختصر یہ کہ اے اللہ! ہمارے پاس تیری تعریف اور بڑائی کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ بند کے آخری حصہ میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتے ہوئے یہی کہہ رہے ہیں کہ مجھ میں وہ صلاحیت ہی نہیں کہ تیرے احسانات کا شکریہ ادا کر سکوں بس اس لیے اپنے سر کو جھکائے اتنا عرض کر رہا ہوں کہ اے ربِ کریم یہ سب تیرے ہی احسانات ہیں۔

نعت رسولِ مقبول ﷺ

شعر نمبر۱

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمھی تو ہو ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمھی تو ہو

(الف)شاعر اور نظم کا نام:

یہ شعر ہماری کتاب میں موجود نظم نعت سے لیا گیا ہے۔اس نظم کے شاعر مولانا ظفر علی خاں صاحب ہیں جنھیں نعت گو شاعر کہا جاتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ ہمارے دلوں میں اپنے نبی ﷺ کی محبت ہی سب سے بڑی دولت اور متاع ہے۔ہم جو زندگی گزار رہے ہیں اس میں سب سے بڑی وجہ اے نبی ﷺ آپ ہی ہیں۔ ہمارے دلوں میں حرکت آپ ﷺ ہی کے سبب ہے۔ ہماری زندگی کا مرکز اور محور اے اللہ کے رسول ﷺ آپ ہی ہیں۔ بہ الفاظ دیگر اے اللہ کے رسول ﷺ اگر آپ کی محبت ہمارے دلوں میں نہ تو ہم گوشت پوست کے بے جان لوتھڑے بن کر رہ جائیں گے۔ایسی زندگی توحید سے بھی خالی ہو گی۔

جو نہ ہو عشقِ مصطفیٰ تو زندگی فضول ہے　　غلامی رسول میں موت بھی قبول ہے

شعر نمبر۲

پھوٹا جو سینہ شبِ تارِ الست سے　　اس نُورِ اولیں کا اُجالا تمھی تو ہو

(الف)شاعر اور نظم کا نام:

یہ شعر ہماری کتاب میں موجود نظم نعت سے لیا گیا ہے۔اس نظم کے شاعر مولانا ظفر علی خاں صاحب ہیں جنھیں نعت گو شاعر کہا جاتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس شعر میں شاعر نے قرآنی آیت "الست بربکم" کی طرف اشارہ کیا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ "الست" والی تاریک اور اندھیری رات کو جو پہلی روشنی نکلی اس کا اجالا آپ ﷺ کی ذات ہے۔جب اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات پیدا فرمانے کا ارادہ کیا تو گویا یہ اندھیرے کو اجالے میں بدلنے کا فیصلہ تھا۔مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو نہیں پیدا فرماتا تو کوئی چیز بھی پیدا نہ فرماتا۔شاعر یہی کہہ رہا ہے کہ آپ ﷺ کی پیدائش کے نور ہی سے ہر طرف تخلیق کا اجالا پھیلا ہے۔جیسا کہ روایت ہے۔لو لاک لما خلقت الافلاک۔

شعر نمبر۳

سب کچھ تمھارے واسطے پیدا کیا گیا　　سب غایتوں کی غایتِ اُولیٰ تمھی تو ہو

(الف)شاعر اور نظم کا نام:

یہ شعر ہماری کتاب میں موجود نظم نعت سے لیا گیا ہے۔اس نظم کے شاعر مولانا ظفر علی خاں صاحب ہیں جنھیں نعت گو شاعر کہا جاتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس شعر میں شاعر اس روایت لو لاک لما خلقت الافلاک جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے محبوب اگر میں تمہیں نہ پیدا فرماتا تو یہ کائنات بھی نہ بناتا۔ مطلب یہ ہے کہ اے نبی ﷺ اللہ تعالیٰ نے پوری کائنات اور جو کچھ اس میں ہے سب آپ ﷺ ہی کے لیے، آپ ﷺ ہی کی وجہ سے تخلیق کیا گیا ہے۔ یہ کائنات صرف اور صرف آپ ﷺ کے لیے ہی وجود میں آئی ہے۔اے اللہ کے رسول ﷺ آپ کائنات کے اس گلشن کے سب سے حسین پھول ہیں۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

شعر نمبر۴

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS

گرتے ہوؤں کو تھام لیا جس کے ہاتھ نے
اے تاجِ دارِ یثرب و بطحا تمھی تو ہو

(الف)شاعر اور نظم کا نام:

یہ شعر ہماری کتاب میں موجود نظم نعت سے لیا گیا ہے۔اس نظم کے شاعر مولانا ظفر علی خاں صاحب ہیں جنھیں نعت گو شاعر کہا جاتا ہے۔

(ب)تشریح:

اس شعر میں شاعر حضورِ انور ﷺ کی شان اور حکمت بیان کر رہا ہے۔ کہ آپ ﷺ نے عرب کی جاہل قوم کو کس طرح سنبھالا دیا۔ عرب کے لوگ بتوں کو پوجتے تھے۔ دنیا کی تمام برائیاں اُن میں موجود تھیں۔بلکہ ان میں ایسی بھی برائیاں تھیں جو کسی قوم میں نہیں تھیں۔لیکن آپ ﷺ کی صداقت، امانت، حکمت، دانشوری اور سب سے بڑھ کر نبوت ورسالت کی برکت سے اس قوم کو پوری دنیا کی سلطنت حاصل ہوئی۔اے مدینے اور مکے کے بادشاہ اور تاجدار! یہ سب کچھ عرب قوم کو آپ ﷺ ہی نے عطا کیا۔اُن بے عمل لوگوں کو تقویٰ کے اعلیٰ درجے پر فائز کر دیا۔ حضور ﷺ کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر ایک جاہل قوم دنیا کے ہر میدان میں آگے نکل گئی۔

شعر نمبر ۵

JOIN FOR MORE!!!

جلتے ہیں جبریل کے پر جس مقام پر
اس کی حقیقتوں کے شناسا تمھی تو ہو

(الف)شاعر اور نظم کا نام:

یہ شعر ہماری کتاب میں موجود نظم نعت سے لیا گیا ہے۔اس نظم کے شاعر مولانا ظفر علی خاں صاحب ہیں جنھیں نعت گو شاعر کہا جاتا ہے۔

(ب)تشریح:

اس شعر میں شاعر واقعہ معراج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اے لوگو ہمارے نبی ﷺ کی یہ شان ہے کہ فرشتوں کے سردار کے جہاں "پر (بازو)" جلتے ہیں ہمارے نبی ﷺ تو اس مقام سے بھی آگے تشریف لے گئے۔جب کہ جبرائیل علیہ السلام سدرۃ المنتہی پر جا کر ٹھہر گئے اور فرمایا میں آگے نہیں جا سکتا۔جبرائیل نے حضور ﷺ سے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اگر میں اس مقام سے ذرہ برابر بھی آگے گیا تو میرے سارے پر جل جائیں گے کیوں کہ سدرۃ المنتہی کے بعد اللہ تعالیٰ کے خاص جلوے ہیں جنھیں میں برداشت نہیں کر سکتا۔شاعر نے اس شعر میں صنعتِ تلمیح استعمال کی ہے۔اس کے علاوہ صنعت تجنیس بھی واضح ہے۔اس شعر میں ایک لفظ "پر" آیا ہے۔ جس میں ایک "پر" کا مطلب ہے جبریل علیہ السلام کے بازو جب کہ دوسرا "پر" بطور حرف جر(Preposition)استعمال ہوا۔صنعتِ تجنیس کا مطلب ہے شعر میں ایک لفظ کم از کم دو مرتبہ اس طرح استعمال ہو کہ اُس لفظ کا تلفظ یا املا تو ایک ہی ہو مگر اُس لفظ کا مطلب الگ الگ ہو۔

برسات کی بہاریں

بند نمبر ۱

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں
سبزوں کی لہلہاہٹ باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھمجھاوٹ قطرات کی بہاریں
ہر بات کے تماشے، ہر گھات کی بہاریں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند ہماری کتاب میں موجود نظم "برسات کی بہاریں" سے لیا گیا ہے۔ یہ نظم اردو کے مشہور شاعر نظیر اکبر آبادی کی تحریر کردہ ہے جنھیں عوامی و جمہوری شاعر کہا جاتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس بند میں شاعر برسات کے موسم کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ برسات کے موسم میں ہوا کا انداز ہی بدل جاتا ہے ہر طرف سبزہ ہی سبزہ دکھائی دیتا ہے۔ باغات میں بہار کی آمد ہے۔ بوندوں کے گرنے کی آواز کانوں کو بھلی لگتی ہے۔ ہر جگہ منظر نہایت دل کش اور خوب صورت نظر آتا ہے۔ گویا برسات کا موسم اپنے ساتھ بہت سے رنگ لے کر آتا ہے۔ اس بند میں ہوا سے مراد موسم ہے۔ یعنی موسم برسات کی بدولت ہر طرف رونق اور خوشی کا سماں پیدا ہو گیا ہے۔ ایک طرف سبزہ لہلہا رہا ہوتا ہے۔ باغوں کے درختوں پر تازگی اور مستی کا عالم ہوتا ہے۔ دوسری طرف بارش کی بوندوں کا لگاتار گرنا اور قطرات کی صورت میں ٹپکنا حسین منظر پیش کرتا ہے۔ الغرض ہر طرف اور ہر چیز میں برسات کی کیفیت کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔ اے لوگو! میرے دوستو! دیکھو بارش نے کیا کیا رنگ دکھائے ہیں۔

بند نمبر۲

بادل ہوا کے اوپر بد مست چھا رہے ہیں — جھڑیوں کی مستیوں سے دھومیں مچا رہے ہیں
پڑتے ہیں پانی ہر جا، جھل تھل بنا رہے ہیں — گل زار بھیگتے ہیں، سبزے نہا رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند ہماری کتاب میں موجود نظم "برسات کی بہاریں" سے لیا گیا ہے۔ یہ نظم اردو کے مشہور شاعر نظیر اکبر آبادی کی تحریر کردہ ہے جنھیں عوامی و جمہوری شاعر کہا جاتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس بند میں شاعر کہتا ہے کہ ہوائیں بادلوں کو اُڑا رہی ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ بادل آسمان پر مستی کے عالم میں اُڑ رہے ہیں۔ مسلسل بارشوں نے ان کی مستی میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ اور یوں لگتا ہے جیسے وہ بڑے زور و شور سے خوشی کا جشن منا رہے ہوں۔ ہر جگہ بارش ہی بارش ہو رہی ہے اور ان بارشوں نے زمین پر جل تھل یعنی پانی ہی پانی کر دیا ہے۔ ان بارشوں میں باغات اور کھیت بھیگ رہے ہیں۔ اور سرسبز میدان بھی بارشوں میں نہا رہے ہیں۔ اور ان کا رنگ بارش کے سبب تازگی اور شگفتگی دکھا رہا ہے۔ برسات کے ہونے کی وجہ سے ہر طرف سبزہ ہی سبزہ ہو گیا ہے۔ اے لوگو! میرے دوستو! دیکھو بارش نے کیا کیا رنگ دکھائے ہیں۔

بند نمبر۳

جنگل سب اپنے تن پر، ہریالی سج رہے ہیں — گل، پھول، جھاڑ، بوٹے، کر اپنی دھج رہے ہیں
بجلی چمک رہی ہے، بادل گرج رہے ہیں — اللہ کے نقارے، نوبت کے بج رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند ہماری کتاب میں موجود نظم "برسات کی بہاریں" سے لیا گیا ہے۔ یہ نظم اردو کے مشہور شاعر نظیر اکبر آبادی کی تحریر کردہ ہے جنھیں عوامی و جمہوری شاعر کہا جاتا ہے۔

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS BASIM www.studyfair.xyz

(ب) تشریح:

اس بند میں شاعر کہتا ہے کہ جنگل کے تمام درختوں پر برسات کی وجہ سے دل کش سبزہ ہی سبزہ سج رہا ہے۔ پھول، بوٹے اور درخت بھی اپنے آپ کو حسین بنا رہے ہیں شاخ دار اور گھنے درخت نہایت خوب صورت منظر پیش کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بجلی کے چمکنے اور بادل کے گرجنے کا منظر بھی لطف کو دوبالا کر رہا ہے۔ یوں محسوس ہو رہا ہے کہ اللہ واحد و قہار اپنی حکمرانی اور طاقت کا اظہار کر رہا ہے۔ جس طرح سربراہِ مملکت اپنے حاضر ہونے کی اطلاع باجے اور نقاروں سے کرتا ہے اسی طرح ایسا لگ رہا ہے کہ بارش بھی اللہ تعالیٰ قہار و جبّار ہونے کا پیغام دے رہی ہے۔ اے لوگو! دیکھو بارش نے کیا کیا رنگ دکھائے ہیں۔

بند نمبر ۴

ہر جا بچھا رہا ہے سبزا ہرے بچھونے — قدرت کے بچھ رہے ہیں ہر جا ہرے بچھونے

جنگل میں ہو رہے ہیں پیدا ہرے بچھونے — بچھوا دیے ہیں حق نے کیا کیا ہرے بچھونے

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند ہماری کتاب میں موجود نظم "برسات کی بہاریں" سے لیا گیا ہے۔ یہ نظم اردو کے مشہور شاعر نظیر اکبر آبادی کی تحریر کردہ ہے جنھیں عوامی و جمہوری شاعر کہا جاتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس بند میں شاعر ایک ہی بات الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ کہہ رہا ہے کہ زمین پر ہر طرف ہری ہری گھاس، بچھونے کی طرح بچھ گئی ہے۔ جو نرم اور راحت افزا ہے۔ شاعر برسات کی وجہ سے ہر طرف سبزہ ہی سبزہ ہونے کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے برسات ایسی برسائی ہے کہ جگہ جگہ سبزہ ہی سبزہ ہے، جنگل میں مزید سبزہ پیدا ہو گیا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ ہر طرف ہرے ہرے، سبز سبز بستر، قالین اللہ تعالیٰ نے بچھوا دیے ہیں۔ اے میرے دوستو! دیکھو بارش نے کیا کیا رنگ دکھائے ہیں۔

JOIN FOR MORE!!!

بند نمبر ۵

سبزوں کی لہلہاہٹ، کچھ ابر کی سیاہی — اور چھا رہی گھٹائیں سرخ اور سفید، کاہی

سب بھیگتے ہیں گھر گھر لے ماہ تا بہ ماہی — یہ رنگ کون رنگے تیرے سوا الٰہی

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند ہماری کتاب میں موجود نظم "برسات کی بہاریں" سے لیا گیا ہے۔ یہ نظم اردو کے مشہور شاعر نظیر اکبر آبادی کی تحریر کردہ ہے جنھیں عوامی و جمہوری شاعر کہا جاتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس بند میں شاعر برسات کی وجہ سے آسمان پر بادلوں کے مختلف رنگوں کا ذکر رہا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ گہرے سیاہ اور ہلکے سیاہ بادلوں میں سورج کی شعاعوں کے اثر سے کئی رنگ ابھر رہے ہیں۔ جب بادل گہرے ہوں تو وہ کالے سیاہی کی مانند، جب بادلوں میں شفق ظاہر ہو تو یہی بادل سرخ، اسی طرح کبھی بادل سفید، کبھی ہلکے سبز رنگ کے نظر آتے ہیں۔ شاعر برسات کو موسلا دھار قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ بارش کی شدت ایسی ہے کہ دنیا کہ ہر چیز پانی میں ڈوبی ہوئی ہے۔ چاند، سے لے کر مچھلیاں تک (یعنی آسمان سے لے کر زمین تک) بارش میں

بھیگ رہی ہیں۔ تمام گھر بارش میں تر بتر ہو رہے ہیں۔ اے اللہ یہ سب دل کش اور خوب صورت منظر تُو ہی کر سکتا ہے۔ تیرے علاوہ کسی کو طاقت نہیں کہ ہمیں ایسا منظر دکھائے۔ اے لوگو! دیکھو بارش نے کیا کیا رنگ دکھائے ہیں۔

بند نمبر۶

چھت گرنے کا کسی جا غل شور ہو رہا ہے　　دیوار کا بھی دھڑکا کچھ ہوش کھو رہا ہے
در در حویلی والا ہر آن رو رہا ہے　　مفلس سو جھونپڑے میں دل شاد سو رہا ہے
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند ہماری کتاب میں موجود نظم "برسات کی بہاریں" سے لیا گیا ہے۔ یہ نظم اردو کے مشہور شاعر نظیر اکبر آبادی کی تحریر کردہ ہے جنھیں عوامی و جمہوری شاعر کہا جاتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس بند میں شاعر برسات کے نقصانات کا ذکر کر رہا ہے کہ بارش کی وجہ سے کئی گھروں کی چھتیں گر گئیں ہیں۔ جس کے گرنے کی آوازیں آ رہی رہیں۔ اور جن لوگوں کے گھروں کی چھت گری ہیں وہ لوگ بھی شور مچا رہے ہیں۔ اسی طرح بعض لوگوں کو یہ ڈر بھی لگ رہا ہے کہ کہیں ان کے گھروں کی دیواریں نہ گر جائیں۔ بارش امیروں اور غریبوں دونوں قسم کے لوگوں کو پریشان کر رہی ہے۔ لیکن جو لوگ انتہائی غریب اور مفلس ہیں جن کا کوئی گھر ہی نہیں بلکہ جھونپڑے میں رہنے کے عادی ہیں وہ بارش میں بھی بڑے مزے سے سو رہے ہیں۔ ان کو بارش کے منفی اثرات کی خبر ہی نہیں ہے۔ وہ تو خوابِ خرگوش میں آرام کر رہے ہیں۔ اے میرے دوستو! ذرا دیکھو برسات کیا کیا رنگ دکھا رہی ہے۔

بند نمبر۷

کیچڑ سے ہو رہی ہے جس جا، زمیں پھسلنی　　مشکل ہوئی ہے واں سے ہر اک کو راہ چلنی
پھسلا جو پاؤں پگڑی مشکل ہے پھر سنبھلنی　　جوتی گری تو واں سے کیا تاب پھر نکلنی
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند ہماری کتاب میں موجود نظم "برسات کی بہاریں" سے لیا گیا ہے۔ یہ نظم اردو کے مشہور شاعر نظیر اکبر آبادی کی تحریر کردہ ہے جنھیں عوامی و جمہوری شاعر کہا جاتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس بند میں شاعر نے کچی گلیوں اور سڑکوں کا منظر پیش کیا ہے۔ جن پر بارش کی وجہ سے کیچڑ ہو جاتی ہے۔ اور اس پر چلنے سے قدم پھسل جاتے ہیں۔ چلنا دوبھر ہو جاتا ہے۔ اگر کسی کا پاؤں پھسل جائے تو اسے اپنی پگڑی (عمامہ یا ٹوپی) سنبھالنا مشکل ہو جاتی ہے۔ دوسرا مطلب اس کا یہ بنتا ہے کہ کیچڑ کی وجہ کسی شریف انسان کا پیر پھسل جائے تو وہ گر پڑتا ہے۔ کیچڑ میں گندا ہو جانے سے اس شریف انسان کی عزت خاک میں مل جاتی ہے۔ ایسے موقع پر لوگ اس سے ہمدردی کرنے کے بجائے اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اردو زبان میں پگڑی سنبھالنا محاورہ ہے جس کا مطلب "عزت بچانا" ہے یہاں دونوں معانی لیے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی کی جوتی کیچڑ میں پھنس جائے تو آسانی سے نکالی نہیں جاسکتی ہے۔ کیوں کہ اس کو پاؤں سے نکالنے کوشش میں انسان خود بھی کیچڑ میں لت پت ہو سکتا ہے۔ اے میرے دوستو! ذرا دیکھو تو برسات کیا کیا رنگ دکھا رہی ہے۔

بند نمبر۸

گِر کر کسی کے کپڑے دلدل میں ہیں معطر　　پھسلا کوئی، کسی کا کیچڑ میں منھ گیا بھر
اک دو نہیں پھسلتے کچھ اس میں آن اکثر　　ہوتے ہیں سیکڑوں کے سر نیچے پاؤں اُوپر
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند ہماری کتاب میں موجود نظم ”برسات کی بہاریں“ سے لیا گیا ہے۔ یہ نظم اردو کے مشہور شاعر نظیر اکبر آبادی کی تحریر کردہ ہے جنھیں عوامی و جمہوری شاعر کہا جاتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس بند میں شاعر کیچڑ میں پھنس جانے کا منظر پیش کیا ہے کہ کسی شخص کے گرنے سے دلدل میں کپڑے لت پت ہو کر بدبو سے بھر گئے ہیں۔ لیکن شاعر نے بطورِ مزاح ”معطر“ کا لفظ استعال کیا ہے۔ کوئی شخص کیچڑ میں اس طرح گرا ہے کہ کیچڑ اس کے منہ پر تھپ گئی ہے۔ اور یہ حادثہ اکّا دکّا نہیں ہو رہے ہیں بلکہ کئی لوگ اسی طرح برسات کی کیچڑ میں پھسل کر گر رہے ہیں۔ اور ایسی بری طرح گر رہے ہیں کہ کسی کا سر نیچے اور پاؤں اوپر ہو رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ لوگوں کا حال اور ان کی برسات کے موسم میں کیچڑ میں لت پت ہونے کی کیفیت بیان کرنا نہایت مشکل ہے۔ مختصر یہ کہ لوگ بارش میں مصیبت میں مبتلا ہیں۔ اے میرے دوستو! ذرا دیکھو تو برسات کیا کیا رنگ دکھا رہی ہے۔

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS BASIM www.studypak.xyz

آمدِ صبح

بند نمبر ۱

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زارِ صبح　　گلزارِ شب خزاں ہُوا آئی بہارِ صبح
کرنے لگا فلک زرِ انجم نثارِ صبح　　سرگرمِ ذکرِ حق ہوئے طاعت گزارِ صبح
تھا چرخِ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند ہماری کتاب میں موجود نظم ”آمدِ صبح“ سے لیا گیا ہے۔ اس نظم کے شاعر میر ببر علی انیس ہیں جنھیں مرثیے کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس بند میں میر انیس تخیلاتی طور پر ۱۰ محرم الحرام ۶۱ھ کی اس صبح کا ذکر رہے ہیں جو کہ سرزمینِ کربلا پر نمودار ہوئی جس میں امامِ عالی مقام حضرت حسین نے اسلام کی تابندگی کے لیے اپنے عظیم جانثار ساتھیوں کے ہمراہ اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ کربلا کے میدان میں صبح کا منظر بیان کرتے ہوئے سورج کے طلوع ہونے کی نشاندہی کرتے ہوئے شاعر کہنا چاہ رہے ہیں کہ سورج نکلنے سے پہلے آسمان پر ایک سرخی سی نمودار ہوتی ہے۔ جسے شفق کہتے ہیں۔ شاعر کے مطابق یہ سرخی آسمان پر ایسے پھیلی ہے جیسے لالہ کے پھول کھل اٹھے ہوں۔ یہاں شاعر نے گلِ لالہ کے سرخ رنگ کو بطور استعارہ پیش کیا ہے۔ رات کے وقت ایک خاموشی اور سناٹا ہر طرف طاری ہوتا ہے۔ اس عمل کو شاعر نے خزاں سے تعبیر کیا ہے کہ اسلام پر گویا ایک خزاں کو دور دوراں تھا، اسلام مرجھا چکا تھا۔ لہٰذا اس صبح کے ہوتے ہی خزاں کا دور ختم ہو جائے گا اور اسلام پر بہار آجائے گی۔ کیوں کہ کربلا کے عظیم مجاہد اسلام کی تابندگی کے لیے اپنی جانوں کا نظرانہ پیش کرنے کو تیار بیٹھے ہیں۔ اتنی حسین صبح پر ہر کوئی فدا ہونے کو تیار ہے حتیٰ کہ آسمان بھی اپنے ستاروں کا قیمتی خزانہ اس صبح پر قربان کر رہا ہے۔ آگے شاعر کہتا ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ

اوراس کی عبادت میں مشغول ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے جو کہ اس وقت سرزمینِ کربلا میں موجود تھے وہ عبادت گزار لوگ بھی اپنے معبود کی بندگی میں مصروف ہوگئے۔ اوراُس کے کچھ دیر بعد سورج باقاعدہ نمودار ہوگیا۔ آسمان پر سورج کا نمودار ہونا ایسا تھا جیسے کسی سرسبز باغ میں گلاب کا کوئی پھول کھِل اٹھا ہو۔ تشبیہات نے صبح کے منظر کو بہت دل کش بنا دیا ہے۔

بند نمبر۲

چلنا وہ بادِ صبح کے جھونکوں کا دم بہ دم — مرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب وتابِ نہر وہ موجوں کا پیچ وخم — سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت، نہ کم
کھا کھا کے اَوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند ہماری کتاب میں موجود نظم "آمدِ صبح" سے لیا گیا ہے۔ اس نظم کے شاعر میر ببر علی انیس ہیں جنھیں مرثیے کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس بند میں میر انیس تخیلاتی طور پر ۱۰ محرم الحرام ۶۱ ھ کی اس صبح کا ذکر رہے ہیں جو کہ سرزمینِ کربلا پر نمودار ہوئی جس میں امامِ عالی مقام حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اسلام کی تابندگی کے لیے اپنے عظیم جانثار ساتھیوں کے ہمراہ اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ شاعر اس منظر کو اپنے جذبات میں بیان کر رہا ہے کہ اس صبح کے وقت ہوا کے نرم نرم جھونکے متواتر چل رہے تھے۔ ایک کے بعد ایک جھونکا آرہا تھا۔ باغ کے پرندے بیٹھے مختلف سروں میں گیت گا رہے تھے۔ نہر کا پانی چمک رہا تھا۔ اور اس کی لہریں بل کھا رہی تھیں۔ ہوا میں معتدل سردی تھی جسے شاعر نے کمالِ فن کے ساتھ بیان کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ "سردی ہوا میں، پر نہ زیادہ بہت، نہ کم" الفاظ پر شاعر کا اختیار دیکھنے کے قابل ہے۔ گویا موسم خوش گوار تھا۔ آخری شعر میں تشبیہ استعمال ہوئی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ شبنم کے قطرات ریت کے ذرات پر اس طرح لگ رہے ہیں کہ جیسے موتی۔ صحرا میں ہر طرف ہرے بھرے سبزے پر شبنم کا نظارہ دل فریب تھا اور یوں لگتا ہے کہ جیسے اس سبزے کے ہرے بھرے ہونے کی اصل وجہ اس کی اچھی خوراک ہے جو کہ اسے ہر شب اوس کی صورت میں میسر آتی ہے۔

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS

بند نمبر۳

وہ صبحِ نور اور وہ صحرا، وہ سبزہ زار — تھے طائروں کے غول درختوں پہ بے شمار
چلنا نسیمِ صبح کا رہ رہ کے بار بار — کُو کُو وہ قمریوں کی وہ طاؤس کی پکار
وا تھے دریچے باغِ بہشتِ نعیم کے
ہر سُو رواں تھے دشت میں جھونکے نسیم کے

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند ہماری کتاب میں موجود نظم "آمدِ صبح" سے لیا گیا ہے۔ اس نظم کے شاعر میر ببر علی انیس ہیں جنھیں مرثیے کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس بند میں میر انیس تخیلاتی طور پر ۱۰ محرم الحرام ۶۱ ھ کی اس صبح کا ذکر رہے ہیں جو کہ سرزمینِ کربلا پر نمودار ہوئی جس میں امامِ عالی مقام حضرت حسینؓ نے اسلام کی تابندگی کے لیے اپنے عظیم جانثار ساتھیوں کے ہمراہ اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ شاعر اس منظر کو اپنے جذبات

میں بیان کر رہا ہے کہ صبح کے وقت ہر طرف نور ہی نور پھیلا ہوا تھا۔ دوسری طرف اس صحرا میں بے شمار پرندے اس صبح کی عظمت کے سبب درختوں پر بیٹھے چہچہا رہے تھے۔ صبح کی ٹھنڈی اور لطیف ہوا، جسے نسیم کہتے ہیں، تھم تھم کر چل رہی تھی۔ پرندوں میں سے کوئل، فاختہ اور مور وغیرہ کی آواز زور زور سے بلند ہو رہی تھی جو کہ کانوں کو بھلی معلوم ہو رہی تھی اور یوں لگ رہا تھا گویا یہ تمام پرندے بھی لشکرِ اسلام کی فتح و کامرانی کا پیشگی اعلان کر رہے تھے۔ شاعر مزید کہتا ہے کہ اس دشتِ کربلا میں صبح کا وقت ایسا سہانا اور فرحت بخش معلوم ہو رہا تھا جیسے جنت کی کھڑکیاں کھول دی گئی ہوں اور یہ تازہ، ٹھنڈی ہوا کے جھونکے وہاں سے ہی آ رہے ہیں۔

بند نمبر ۴

آمد وہ آفتاب کی وہ صبح کا سماں تھا جس کی ضَو سے وجد میں طاؤسِ آسماں
ذرّوں کی روشنی پہ ستاروں کا تھا گماں نہرِ فُرات بیچ میں تھی مثلِ کہکشاں
ہر نخل پر ضیائے سرِ کوہِ طُور تھی
گویا فلک سے بارشِ بارانِ نُور تھی

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند ہماری کتاب میں موجود نظم "آمدِ صبح" سے لیا گیا ہے۔ اس نظم کے شاعر میر ببر علی انیس ہیں جنھیں مرثیے کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔

JOIN FOR MORE!!!

(ب) تشریح:

اس بند میں میر انیس تخیلاتی طور پر ۱۰ محرم الحرام ۶۱ھ کی اس صبح کا ذکر رہے ہیں جو کہ سرزمینِ کربلا پر نمودار ہوئی جس میں امامِ عالی مقام حضرت حسینؓ نے اسلام کی تابندگی کے لیے اپنے عظیم جانثار ساتھیوں کے ہمراہ اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ صبح کے اس خوب صورت منظر کو ان کی شاعرانہ مہارت نے چار چاند لگا دیے ہیں وہ کہتے ہیں کہ صبح کے وقت مشرق کے افق پر سورج کا نمودار ہونا ایک حسین سماں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اس کی روشنی میں آسمان کا "مور" رقص کر رہا ہو۔ شاعر نے آسمان کے نیلے رنگ کو مور کے رنگ سے مثال دی ہے۔ اور اس کی گردش کو مور کا وجد یعنی جھومنا کہا ہے۔ اس عالم میں سورج کی شعاعیں جب ریت کے ذروں پر پڑ رہی تھیں تو یہ ریت کے ذرے ایسے چمکنے لگے کہ جیسے آسمان پر تارے چمکتے ہوں۔ تاروں کی ایک خوب صورت ترتیب کہکشاں کہلاتی ہے۔ میر انیس کا شاعرانہ کمال یہاں عروج پر ہے۔ انھوں نے سرزمینِ کربلا پر بہنے والی نہرِ فرات کو ستاروں کے سی چمک دھمک سے تعبیر کیا ہے۔ نہر کا پانی رواں دواں تھا۔ اس چلتے ہوئے پانی پر سورج کی کرنیں پڑیں تو اس کی جھلمل نے کہکشاں کا سماں پیدا کر دیا۔ بہتے ہوئے پانی کے ساتھ ظاہر ہے کہ درختوں کا حُسن ہوتا ہے۔ شاعر کے مطابق ان بلند و بالا درختوں پر سورج کی شعاعیں ایسے چمک رہی تھیں جیسے کوہِ طور پر اللہ تعالیٰ کے وہ جلوے جنھیں دیکھنے کی طاقت موسیٰ علیہ السلام میں بھی نہ تھی اور آپ علیہ السلام بے ہوش ہو گئے تھے۔ گویا کہ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے آسمان سے نور کی بارش ہو رہی ہو اور ہر دیکھنے والے پر اس خوب صورت منظر سے ایک پاکیزہ کیفیت طاری ہو رہی تھی۔

بند نمبر ۵

اوجِ زمیں سے پست تھا چرخِ زبرجدی کوسوں تھا سبزہ زار سے صحرا زمردی
ہر خشک و تر پہ تھا کرمِ بحرِ سرمدی بے آب تھے مگر دُرِ دریائے احمدی
روکے ہوئے تھی نہر کو امت رسول کی
سبزہ ہرا تھا خشک تھی کھیتی بتول کی

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند ہماری کتاب میں موجود نظم ’’آمدِ صبح‘‘ سے لیا گیا ہے۔ اس نظم کے شاعر میر ببر علی انیس ہیں جنھیں مرثیے کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس بند میں میر انیس تخیلاتی طور پر ۱۰ محرم الحرام ۶۱ھ کی اس صبح کا ذکر رہے ہیں جو کہ سرزمینِ کربلا پر نمودار ہوئی جس میں امامِ عالی مقام حضرت حسینؓ نے اسلام کی تابندگی کے لیے اپنے عظیم جانثار ساتھیوں کے ہمراہ اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ اس بند میں شاعر نے زمین کو آسمان سے بھی بلند مرتبہ قرار دیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ میدانِ کربلا میں دنیا کی عظیم ہستیاں آکر قیام پذیر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر کہتا ہے کہ زمین کی حیثیت آج بلندی میں نیلے آسمان سے بھی ارفع و اعلیٰ ہے۔ آج آسمان پست نظر آرہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کرم زمین کی ہر خشک و تر چیز پر ہے۔ ہر طرف دور دور تک، صحرا میں سبزے کا فرش زمرد پتھر کی طرح گہرا سبز ہو رہا ہے۔ لیکن افسوس اور دکھ کی بات یہ تھی کہ ہمارے پیارے نبی ﷺ کی اولاد (جنھیں شاعر نے موتیوں سے تشبیہ دی) پیاسی تھی۔ آخری شعر میں شاعر کہتا ہے کہ امامِ حسین اور ان کے رفقاء پر پانی روکنے والے غیر نہیں تھے وہ تو ہمارے نبی ﷺ کا کلمہ پڑھنے والے تھے۔ کربلا کے میدان میں سب کو پانی میسر تھا۔ چرند، پرند، جانور، نباتات سب کو پانی فراہم ہو رہا تھا مگر افسوس دنیا کی سب سے عظیم ہستیاں، حضرت فاطمۃ الزہرا کی اولاد کے سردار حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء کو پیاسا رکھا ہوا تھا۔

JOIN FOR MORE!!!

بند نمبر ۶

وہ پھولنا شَفَق کا وہ مینائے لاجورد
مخمل سی وہ گِیاہ وہ گُل سبز و سرخ و زرد
رکھتی تھی پھونک کر قدم اپنا ہَوائے سَرد
یہ خوف تھا کہ دامنِ گل کو نہ پڑے گرد
پھولوں سے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے
تھالے بھی نخل کے سبدِ گل فروش تھے

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند ہماری کتاب میں موجود نظم ’’آمدِ صبح‘‘ سے لیا گیا ہے۔ اس نظم کے شاعر میر ببر علی انیس ہیں جنھیں مرثیے کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس بند میں میر انیس تخیلاتی طور پر ۱۰ محرم الحرام ۶۱ھ کی اس صبح کا ذکر رہے ہیں جو کہ سرزمینِ کربلا پر نمودار ہوئی جس میں امامِ عالی مقام حضرت حسینؓ نے اسلام کی تابندگی کے لیے اپنے عظیم جانثار ساتھیوں کے ہمراہ اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ شاعر صبح کے اُس منظر کو پیش کر رہے ہیں جب اجالے کی سفیدی زیادہ روشن ہونے لگتی ہے، اور سورج نکلنے سے ذرا پہلے مشرقی افق پر شفق کی سرخی بھی پھیل جاتی ہے۔ شاعر نے شفق کے پھولنے کو ایسی سرخ شراب سے تشبیہ دی ہے۔ یہ اس لیے کہ شفق کے قریب نظر آنے والا آسمان کا منظر تھا۔ دوسرے مصرعے میں زمین پر مخمل کی طرح نرم گھاس کا فرش بھی تھا۔ شاعر کہتا ہے کہ میدانِ کربلا میں ٹھنڈی ہوا بھی اس احتیاط سے چل رہی تھی کہ کہیں حضرت امام حسین اور ان کے رفقاء کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ بلکہ ان پاک ہستیوں کو مٹی اور گرد بھی نہ لگ جائے۔ آخر میں شاعر کہتا ہے کہ ہر طرف سبز درختوں پر سرخ پھول اتنی کثرت سے کھلے ہوئے نظر آرہے تھے کہ جیسے درخت سرخ لباس میں ہوں۔ شاعر نے سرخ پھولوں سے لدے ہوئے سبز درختوں کے گرد بنے ہوئے پھولوں کو پھول بیچنے والوں کے تھالوں سے تشبیہ دی ہے۔ ہر درخت پر لگے ہوئے پھولوں کی کثرت سے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ جیسے پھول بیچنے والوں کے بھرے ہوئے تھال دکھائی دیتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ امام عالی مقام اپنے

پاس موجود ایک ایک پھول کو اللہ کی بارگاہ میں اس طرح پیش کر رہے تھے کہ جیسے ایک پھول بیچنے والا خریدار کو پھول پیش کرتا ہے۔ اصل میں یہ اس منظر کی عکاسی ہے جب امام حسین رضی اللہ عنہ ہر شہید کے جنازے پر پہنچتے اور اس کو میدان کربلا سے اٹھا کر لاتے اور خالقِ کائنات سے مخاطب ہو کر کہتے کہ میری اس قربانی کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما۔

تعلیمات نبوی ﷺ

بند نمبر ۱

یہ کہہ کر کیا علم پر ان کو شیدا کہ ہیں دُور رحمت سے سب اہلِ دنیا
مگر دھیان ہے جن کو ہر دم خدا کا ہے تعلیم کا یاں سدا جن میں چرچا
انھیں کے لیے یاں ہے نعمت خدا کی
انھیں پر ہے واں جا کے رحمت خدا کی

JOIN FOR MORE!!!

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند ہماری کتاب میں موجود نظم "تعلیمات نبوی ﷺ" سے لیا گیا ہے۔ اس نظم کے شاعر الطاف حسین حالی ہیں جنھیں اردو کا پہلا قومی شاعر کہا جاتا ہے۔

(ب) تشریح:

حالی نے یہ نظم (مسدس مد و جزرِ اسلام) سر سید احمد خان کی فرمائش پر لکھی تھی۔ جس میں مسلمانوں کو حضورِ اکرم ﷺ کی تعلیمات پر عمل کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ سر سید اس نظم پر اتنے خوش ہوئے کہ انھوں نے ایک بار کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پوچھا کہ دنیا سے کیا لائے ہو تو میں جواب میں کہوں گا کہ حالی سے "مسدس" لکھوا کر لایا ہوں۔ اس بند میں شاعر کہتا ہے کہ ہمارے پیارے نبی ﷺ نے اپنے ماننے والوں کو علم سے محبت اور حصولِ علم کا جذبہ یہ کہہ کر ابھارا کہ جو اپنے رب کی رحمت سے قریب ہونا چاہتے ہیں وہ حصولِ علم کے لیے سرگرمِ عمل رہیں۔ علم حاصل کرنے سے اللہ تعالیٰ کی رحمت حاصل ہوتی ہے۔ اللہ والے ہی ہیں جو علم حاصل کرتے اور علم کی روشنی پھیلاتے ہیں۔ ایسے ہی اہلِ علم کے لیے دنیا میں بھی نعمتیں ہیں اور آخرت میں بھی اہلِ علم کامیاب اور کامران ہوں گے۔ اہلِ علم دنیا و آخرت میں اللہ کی رحمت میں رہیں گے۔

بند نمبر ۲

سکھائی انھیں نوعِ انساں پر شفقت کہا ہے یہ اسلامیوں کی علامت
کہ ہمسایہ سے رکھتے ہیں وہ محبت شب و روز پہنچاتے ہیں ان کو راحت
وہ جو حق سے اپنے لیے چاہتے ہیں
وہی ہر بشر کے لیے چاہتے ہیں

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند ہماری کتاب میں موجود نظم "تعلیمات نبوی ﷺ" سے لیا گیا ہے۔ اس نظم کے شاعر الطاف حسین حالی ہیں جنھیں اردو کا پہلا قومی شاعر کہا جاتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس بند میں شاعر کہتا ہے کہ ہمارے پیارے نبی ﷺ نے اہلِ ایمان کو پوری انسانیت پر شفقت اور ان سے محبت کرنے کا درس دیا۔

انسانیت پر شفقت اور انسانوں سے محبت کو مسلمانوں کی پہچان بتایا۔ شاعر کہتا ہے کہ نبی ﷺ کا ماننے والا اپنے پڑوسی سے محبت کرتا ہے۔ اپنے پڑوسیوں کا ہر وقت خیال رکھتا ہے۔ مسلمان ہمسایوں کی تکالیف دور کرتا ہے۔ انھیں راحت اور آرام پہنچاتا ہے۔ مسلمان کی ایک پہچان یہ بھی بتائی گئی ہے کہ جو چیز وہ خود کے لیے پسند کرتا ہے وہی چیز تمام مسلمانوں کے لیے پسند کرتا ہے۔

بند نمبر ۳

خدا رحم کرتا نہیں اُس بشر پر — نہ ہو درد کی چوٹ جس کے جگر پر
کسی کے گر آفت گزر جائے سر پر — پڑے غم کا سایہ نہ اس بے اثر پر
کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہو گا عرش بریں پر

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند ہماری کتاب میں موجود نظم "تعلیمات نبوی ﷺ" سے لیا گیا ہے۔ اس نظم کے شاعر الطاف حسین حالی ہیں جنھیں اردو کا پہلا قومی شاعر کہا جاتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس بند میں شاعر کہتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے مسلمانوں کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ اُس انسان پر رحم نہیں فرماتا جس کا دل سخت ہو۔ جو دوسروں کی مصیبت کو اپنے دل میں محسوس نہیں کرتا اللہ تعالیٰ بھی اس پر رحم نہیں کرتا اور نہ کرے گا۔ اگر لوگوں پر مصیبت یا تکلیف آجائے، اور اُن مصیبت زدہ کو دیکھ کر کسی شخص کا دل غمگین نہ ہو تو ایسے سخت دل لوگوں کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتا۔ دنیا و آخرت میں ان پر اللہ تعالیٰ نظرِ رحمت نہیں فرمائے گا۔ اے مسلمانو! تم زمین پر رہنے والوں پر شفقت اور رحم کرنا۔ کل بروز قیامت اللہ تعالیٰ بھی تم پر مہربان رہے گا۔ اللہ تعالیٰ جب رحم فرمائے گا تو تم جنت کی ابدی نعمتوں سے سرفراز بھی ہو گے۔

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS www.studyplan.xyz

بند نمبر ۴

ڈرایا تعصب سے ان کو یہ کہہ کر — کہ زندہ رہا اور مرا جو اسی پر
ہوا وہ ہماری جماعت سے باہر — نہ ساتھی ہمارا نہ ہم اس کے یاور
نہیں حق سے کچھ اس محبت کو بہرہ
کہ جو تم کو اندھا کرے اور بہرا

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند ہماری کتاب میں موجود نظم "تعلیمات نبوی ﷺ" سے لیا گیا ہے۔ اس نظم کے شاعر الطاف حسین حالی ہیں جنھیں اردو کا پہلا قومی شاعر کہا جاتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس بند میں شاعر کہتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے مسلمانوں کو جن برائیوں سے بچنے کی تلقین کی ان میں سے ایک اہم برائی تعصب بھی ہے۔ حضور ﷺ نے مسلمانوں کو رنگ و نسل، ذات پات کی بنیاد پر کسی کا حق مارنے سے منع فرمایا۔ انصاف سے کام لینے کا حکم فرمایا۔ زبان، رنگ و نسل، اپنا اور غیر، امیر، غریب، وطنی، غیر وطنی سے بالاتر ہو کر حق دار کو اُس کا حق دینے کی تاکید فرمائی۔ یہی انصاف ہے۔ انصاف اسلام میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ انصاف کے برعکس جو تعصبانہ سلوک کرتا ہے ایسے شخص کے بارے میں فرمایا جو تعصب میں زندگی گزارے، اور تعصبانہ رویے کو اختیار رکھتے ہوئے مر جائے تو وہ مومنین اور متقین کی جماعت سے خارج ہو گیا۔ متعصبانہ شخص سے میرا (یعنی حضور ﷺ کا)

کوئی تعلق نہیں اور نہ میں اُس سے محبت کرتا ہوں۔ آخر میں شاعر کہتا ہے کہ اپنی قوم سے اتنی محبت کرنا کہ دوسروں کے حقوق تلف ہوں۔ ایسی محبت اور شفقت سے اللہ تعالیٰ خوش نہیں ہوتا ہے۔ اپنی قوم کی محبت میں اندھے ہو جانے سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کا، اپنی قوم، اپنی ذات، اپنے ہم زبان، اپنے قبیلے کے لوگوں کے مقابلے میں دوسروں سے ناانصافی کرنا تعصب ہے۔ جو انصاف کے خلاف ہے۔ مسلمان کو جہنم میں لے جانے کا سبب بن سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس برائی سے بھی محفوظ فرمائے۔

بند نمبر ۵

بچایا برائی سے ان کو یہ کہہ کر — کہ طاعت سے ترکِ معاصی ہے بہتر
تَوَرُّع کا ہے ذات میں جن کے جوہر — نہ ہوں گے کبھی عابد اُن کے برابر
کرو ذکر اہلِ وَرَع کا جہاں تم
نہ لو عابدوں کا کبھی نام واں تم

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند ہماری کتاب میں موجود نظم ''تعلیمات نبوی ﷺ'' سے لیا گیا ہے۔ اس نظم کے شاعر الطاف حسین حالی ہیں جنھیں اردو کا پہلا قومی شاعر کہا جاتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس بند میں شاعر کہتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے مسلمانوں کو برائیوں سے اِس طرح بچایا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت تو کرتے ہیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ گناہوں سے نہیں بچتے۔ ایسے لوگ افضل یا بہتر نہیں ہیں۔ بلکہ وہ لوگ افضل اور اعلیٰ ہیں جو نفلی عبادات تو کم کرتے ہیں لیکن فرائض کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بھی بچتے رہتے ہیں۔ گناہوں سے بچنے والوں کا رتبہ نفلی عبادات کرنے والے سے اعلیٰ ہے۔ لہٰذا اے مسلمانو! چھوٹے بڑے تمام گناہوں سے ضرور بچنا۔ شاعر مزید کہتا ہے جو لوگ متقی اور پرہیز گار ہیں اُن کا رتبہ، بے علم و عمل عبادت گزاروں سے افضل اور اعلیٰ ہے۔ کیوں کہ متقی لوگ اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر گناہوں سے بچتے ہیں۔ اہلِ علم یا اللہ والوں کی گناہوں سے بچنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اُن پر ایسی عنایت اور نعمتیں عطا فرماتا ہے کہ انھیں گناہ کرنے سے حیا آتی ہے۔ لہٰذا عبادت گزار اُن سے افضل و اعلیٰ نہیں ہوتے ہیں۔

بند نمبر ۶

غریبوں کو محنت کی رغبت دلائی — کہ بازو سے اپنے کرو تم کمائی
خبر تا کہ لو اس سے اپنی پرائی — نہ کرنی پڑے تم کو در در گدائی
طلب سے ہے دنیا کی گر یاں یہ نیت
تو چمکو گے واں ماہِ کامل کی صورت

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند ہماری کتاب میں موجود نظم ''تعلیمات نبوی ﷺ'' سے لیا گیا ہے۔ اس نظم کے شاعر الطاف حسین حالی ہیں جنھیں اردو کا پہلا قومی شاعر کہا جاتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس بند میں شاعر کہتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے غریب مسلمانوں کو محنت کرنے پر ابھارا کہ ''محنت سے روزی کمانے والا اللہ تعالیٰ کا دوست ہے''۔ تم محنت سے اپنے اہل و عیال کا خیال رکھو بلکہ دوسرے مستحقین کی بھی مدد کرو۔ اے مسلمانو! لوگوں سے بھیک مت مانگنا۔

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS

دردر گدائی نہ کرنا۔ بھیک مانگنے والا قیامت میں بغیر گوشت کے اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہو گا۔ آخرت میں ذلیل وخوار ہو گا۔ اے مسلمانو! اس نیت سے دولت کمانا کہ دوسروں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔ اپنے اہل وعیال کا خیال رکھے تو یہ دنیا نہیں ہے۔ بلکہ ایسا کرنے والا تو قیامت میں سرخرو اور کامیاب ہو گا۔ شاعر کہتا ہے کہ جو مسلمان اس نیت سے مال ودولت کماتے ہیں کہ اہل وعیال خوش وخرم زندگی گزاریں، دوسروں کے آگے ہاتھ نہ پھیلائیں، غرور وتکبر بھی نہ ہو، ساتھ ہی ساتھ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی بھی نہ ہو، یعنی حلال طریقے سے روزی کماتے ہیں۔ ایسے مسلمانوں کے چہرے قیامت میں چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہے ہوں گے۔

بند نمبر ۷

امیروں کو تنبیہ کی اس طرح پر کہ ہیں تم میں جو اغنیاء اور تونگر
اگر اپنے طبقے میں ہوں سب سے بہتر بنی نوع کے ہوں مددگار و یاور
نہ کرتے ہوں بے مشورت کام ہرگز
اٹھاتے نہ ہوں بے دھڑک گام ہرگز

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند ہماری کتاب میں موجود نظم "تعلیمات نبوی ﷺ" سے لیا گیا ہے۔ اس نظم کے شاعر الطاف حسین حالی ہیں جنھیں اردو کا پہلا قومی شاعر کہا جاتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس بند میں شاعر کہتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے دنیا کے تمام طبقوں کی رہنمائی فرمائی۔ امیروں کو سمجھایا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے تمھیں مال ودولت سے نوازا ہے تو تمھیں چاہیے کہ تمہارے ارد گرد جو غریب لوگ ہیں بالخصوص غریب بہن، بھائی اور رشتے داروں کی مدد کرو۔ اس کے بعد دوسرے غریبوں کی مدد کرو۔ بلکہ ہو سکے تو تمام انسانوں کی مدد کرو۔ مزید امراء کو سمجھایا کہ اے اہلِ دولت تم اپنے آپ کو عقلِ کُل نہ سمجھنا، کوئی بھی کام بغیر مشورے کے نہ کرنا۔ ورنہ تم نقصان اٹھاؤ گے۔ ہمارے نبی ﷺ جو کہتے تھے اُس پر پہلے خود بھی عمل فرماتے تھے۔ آپ ﷺ اپنے صحابہ کرام سے مشورے بھی لیا کرتے تھے اور اُن کے مشوروں پر عمل بھی کرتے تھے۔ لہٰذا ہمیں بھی چاہیے کہ کوئی بھی اہم کام کرنا ہو، مشورہ ضرور کریں۔

JOIN FOR MORE!!!

بند نمبر ۸

تو مُردوں سے آسودہ تر ہے وہ طبقا زمانہ مبارک ملے جس کو ایسا
پہ جب اہلِ دنیا ہوں اَشرارِ دنیا نہ ہو عیش میں جن کو اوروں کی پرواہ
نہیں اس زمانے میں کچھ خیر وبرکت
اِقامت سے بہتر ہے اس وقت رِحلت

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند ہماری کتاب میں موجود نظم "تعلیمات نبوی ﷺ" سے لیا گیا ہے۔ اس نظم کے شاعر الطاف حسین حالی ہیں جنھیں اردو کا پہلا قومی شاعر کہا جاتا ہے۔

(ب) تشریح:

یہ بند پوری نظم کا نچوڑ ہے۔ اس بند میں شاعر طنزیہ انداز میں اصلاحی پیغام دے رہے ہیں کہ جب اہلِ ثروت ودولت عیش وآرام میں مبتلا ہو جائیں، انھیں دوسروں کی بالکل بھی پرواہ نہ ہو، کسی کا خیال نہ رکھیں، ایسے زمانے میں اچھائی برائی کی تمیز ختم ہو جائے گی۔ ایسے زمانے میں

زندہ رہنے سے تو موت بہتر ہے۔ جنھیں ایسا دَور یا زمانہ ملا۔ ایسے لوگوں سے تو مُردے بہتر رہے جو اپنی زندگی گزار کر رخصت ہو گئے۔ ایسے پُر فتن زمانے سے اللہ تعالیٰ ہمیں بچائے۔ شاعر کہتا ہے کہ اچھے اور نیک لوگ اُس زمانے میں حسرت کریں گے کہ ہم یہ زمانہ ہی نہ دیکھتے۔ کاش ہم اس زمانے میں نہ ہوتے! ہم پہلے موت کا جام پی لیتے!

روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے

بند نمبر ا

کھول آنکھ! زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ
مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ
ایام جدائی کے ستم دیکھ، جفا دیکھ
بے تاب نہ ہو، معرکۂ بیم ورجا دیکھ

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند نظم "روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" سے لیا گیا ہے۔ اس نظم کے شاعر حکیم الامت علامہ اقبال ہیں۔ یہ نظم اقبال کے مجموعہ کلام "بالِ جبریل" سے ماخوذ ہے۔

(ب) تشریح:

اقبال کی یہ پوری نظم تمثیلی یا تصوراتی ہے۔ اس نظم میں زمین کی روح دنیا کے پہلے انسان حضرت آدمؑ کا استقبال کر رہی ہے۔ اس بند میں علامہ اقبال کہتے ہیں کہ زمین حضرت آدم علیہ السلام کو خوش آمدید کرتے ہوئے کہتی ہے کہ اے آدم (انسان بھی مراد ہو سکتی ہے) اپنی آنکھیں کھول، اور اس دنیا کے نظاروں پر نگاہ ڈال، یہاں طرح طرح کے دل فریب مناظر ہیں۔ زمین، آسمان، فضا، مشرق سے طلوع ہوتا ہوا سورج غرض ہر نظارہ دلچسپی سے معمور ہے اور بصیرت میں اضافہ کرنے والا ہے۔ ان نظاروں کو دیکھ۔ پھر یہاں خدا کا بے پردہ نُور بھی دکھائی دے گا۔ لیکن وہ پردوں میں چھپا ہوا ملے گا۔ ان دل چسپیوں کے ساتھ ساتھ یہاں اپنی زوجہ بی بی حوا سے جدائی کا دکھ بھی سہنا پڑے گا۔ زمیں پر امید اور ناامیدی کی باہمی کشمکش ہو گی۔ تجھے صبر اور سکون کے ساتھ یہ سب کچھ دیکھنا اور یہ سب دکھ درد برداشت کرنے ہوں گے۔
لیکن پریشانی کی بات نہیں زندگی بیم ورجاء (امید اور خوف) کی کشمکش کا نام ہے۔ تم محنت کر کے اس دنیا میں نئی جنت آباد کر سکتے ہو۔ اللہ نے تمھیں صلاحیتیں دی ہیں انھیں بروئے کار لاؤ اور کامیابی حاصل کرو۔

بند نمبر ۲

ہیں تیرے تصرّف میں یہ بادل، یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک، یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایّام میں آج اپنی ادا دیکھ

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند نظم "روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" سے لیا گیا ہے۔ اس نظم کے شاعر حکیم الامت علامہ اقبال ہیں۔ یہ نظم اقبال کے مجموعہ کلام "بالِ جبریل" سے ماخوذ ہے۔

(ب) تشریح:

اقبال کی یہ پوری نظم تمثیلی یا تصوراتی ہے۔ اس نظم میں زمین کی روح دنیا کے پہلے انسان حضرت آدمؑ کا استقبال کر رہی ہے۔ اس بند میں علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اے آدم علیہ السلام (اے انسان) اس دنیا میں جتنی اللہ تعالیٰ نے دوسری مخلوقات پیدا کیں ہیں وہ سب تیرے

ہی اختیار اور تصرف میں تیری خدمت کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ یہ آسمان پر تیرتے ہوئے بادل تیرے لیے ہیں اور یہ تیرے لیے کھیتوں کو سیراب کریں گے تاکہ تُو وہاں سے غلّہ حاصل کر سکے، یہ آسمانوں کے گنبد یہ فضائیں جو آسمان اور زمین کے درمیان موجود ہیں۔ یہ پہاڑ، یہ جنگل، یہ سمندر، یہ ہوائیں، ان سب کو تیرے ہی واسطے خلق کیا گیا ہے۔ تاکہ تُو مکمل دل جمعی اور اطمینان سے خدا کا نائب بن کر اپنے فرائض ادا کر سکے۔

نہ تُو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے　　　جہاں ہے تیرے لیے تُو نہیں جہاں کے لیے

تیرے زمین پر آنے سے پہلے تک تُو فرشتوں کی اہمیت اور عظمت سے متاثر تھا اور مختلف فرشتوں کو طرح طرح کے بلند مقامات پر دیکھ دیکھ کر ان سے مرعوب ہو جاتا تھا۔ لیکن تجھے شاید معلوم نہ تھا کہ تیرا مقام فرشتوں سے بھی بلند و بالا ہے۔ اب تجھے اس جہان میں رہنے سے اور یہاں اپنے کمالات دکھانے کا موقع ملا ہے۔ اب تو وقت کے آئینے میں اپنی اداؤں اور اپنے حسن پر بھی نگاہ ڈال اور دیکھ، بقول حالی

فرشتوں سے بہتر ہے انسان ہونا　　　مگر اِس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

بند نمبر۳

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے　　　دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے

ناپید ترے بحرِ تخیّل کے کنارے　　　پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے

تعمیرِ خودی کر، اثرِ آہِ رَسا دیکھ

JOIN FOR MORE!!!

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند نظم "روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" سے لیا گیا ہے۔ اس نظم کے شاعر حکیم الامت علامہ اقبال ہیں۔ یہ نظم اقبال کے مجموعہ کلام "بالِ جبریل" سے ماخوذ ہے۔

(ب) تشریح:

اقبال کی یہ پوری نظم تمثیلی یا تصوراتی ہے۔ اس نظم میں زمین کی روح دنیا کے پہلے انسان حضرت آدمؑ کا استقبال کر رہی ہے۔ اس بند میں اقبال فرماتے ہیں کہ تیرے وجود میں خدائے خالق و مالک نے لامحدود اوصاف پیدا کیے ہیں اور اس کائنات کو تیرے لیے مسخر کر دیا گیا ہے۔ زمین و آسمان اور جو کچھ اِس زمین و آسمان میں ہے، تیری خدمت کے لیے ہے۔ حتیٰ کہ زمانہ بھی تیری طرف دیکھ رہا ہے۔ اور تیری آنکھوں کے اشاروں کا منتظر ہے۔ یعنی ابھی تیری خواہشات تیری آنکھوں ہی سے ظاہر ہو رہی ہوں گی اور زبان سے ادا نہیں ہوئی ہوں گی کہ ان کی تکمیل کا اہتمام ہو جائے گا۔ یہاں زمین پر تیری وہ شان و عظمت ہو گی کہ آسمان کے ستارے دُور سے تیری شان اور عظمت کا نظارہ کیا کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے تجھے عقل جیسی نعمت عطا فرمائی ہے۔ یہ تخیل ایسا سمندر ہے جس کے کنارے نظر ہی نہیں آتے یعنی اس تخیل کی وسعت کی کوئی حد نہیں ہے۔ اگرچہ تُو زمین پر ہو گا لیکن تیرے آثار آسمان پر بھی پہنچ جائیں گے۔ اور جب تو خدا کی جدائی میں یا کسی اور غم میں نالہ و فریاد کرے گا تو تیری آہوں کی چنگاریاں آسمان تک جائیں گی۔ یہ زمین اور اس کی دیگر چیزیں تیری خودی اور غیرت میں اضافے کے لیے بے حد مفید ہیں۔

لیکن اس سب کے لیے ایک کام کرنا پڑے گا اور وہ ہے "تعمیرِ خودی"، یعنی اپنی ذات کی معرفت اور کماحقّہ اپنی صلاحیتوں کا صحیح استعمال۔ ان سے کام لے اپنی خودی کو پروان چڑھا اور پھر آسمان تک پہنچتی ہوئی اپنی آہوں کا اثر دیکھ۔ اے انسان! تیرے کارناموں کو دیکھ کر آسمان اور آسمان کی مخلوق بھی حیرت زدہ رہ جائے گی۔

بند نمبر۴

خورشیدِ جہاں تاب کی ضَو تیرے شَرر میں　　　آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہُنر میں

جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
اے پیکرِ گِل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند نظم "روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" سے لیا گیا ہے۔ اس نظم کے شاعر حکیم الامت علامہ اقبال ہیں۔ یہ نظم اقبال کے مجموعہ کلام "بالِ جبریل" سے ماخوذ ہے۔

(ب) تشریح:

اقبال کی یہ پوری نظم تمثیلی یا تصوراتی ہے۔ اس نظم میں زمین کی روح دنیا کے پہلے انسان حضرت آدمؑ کا استقبال کر رہی ہے۔ اقبال اس بند میں کہتے ہیں کہ اے انسان! تیرے عشق کی چنگاری میں آسمان کو چمکانے والے سورج کی روشنی اور آب و تاب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تجھے وہ عزم، حوصلہ اور معرکہ سر کرنے کا بے پایاں جذبہ عطا فرمایا ہے کہ جس کی بدولت تو وہ حیرت انگیز کارنامے سر انجام دے سکتا ہے کہ کائنات اور عالمِ انسانیت چمک اٹھے۔ اے انسان! تیرے اندر طرح طرح کے علوم و فنون کو حاصل کرنے اور ان سے کام لینے کی صلاحیت ہے اور وہ اپنی اس صلاحیت سے کئی دنیائیں آباد کرے گا۔ ایک جنت تو وہ ہے جو تجھے بنا کسی محنت و کوشش کے تحفۃً اللہ تعالیٰ کی طرف سے عنایت کی گئی تھی۔ لیکن اے انسان تیری جنت خود تیرے خونِ جگر (یعنی مسلسل جد وجہد، محنت و مشقت) میں موجود ہے۔ مسلسل کوشش سے تُو ایسی کامیابیاں حاصل کرے گا جو تیری حیات ارضی کو جنت بنا دیں گی۔ اے انسان تیری فطرت ایسی بلند و بالا ہے کہ اسے بخشی ہوئی جنت پسند نہیں ہے۔ اے خاک اور مٹی کے نمونے، اے انسان اپنی مسلسل محنت سے پیدا کی ہوئی جنت ہی سے سکون اور اطمینان پا سکے گا۔ تُو اپنی مسلسل کوشش سے ایسی جنتیں پیدا کرے گا کہ ان پر آسمان کی جنتوں کو بھی رشک آئے گا۔

JOIN FOR MORE!!!

بند نمبر ۵

نالندہ ترے عود کا ہر تار ازل سے
تُو جنسِ محبت کا خریدار ازل سے
تُو پیر صنم خانۂ اسرار ازل سے
محنت کش و خوں ریز و کم آزار ازل سے
ہے راکبِ تقدیر جہاں تیری رضا دیکھ

(ب) تشریح:

اقبال کی یہ پوری نظم تمثیلی یا تصوراتی ہے۔ اس نظم میں زمین کی روح دنیا کے پہلے انسان حضرت آدمؑ کا استقبال کر رہی ہے۔ اس بند میں شاعر کہتا ہے کہ اے انسان تیرے ساز کا ہر تار ابتداء سے نالہ و فریاد کر رہا ہے۔ عشق و محبت، آہ و فغاں تیرے فطری جوہر ہیں۔ تُو ازل سے قدرت کے رازوں کو جاننے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تیری فطرت میں جستجو کا مادّہ رکھا ہے۔ تو کائنات پر غور کرتا ہے۔ تجھ میں تفکر، تدبر، تجزیہ اور مطالعہ کی خداداد صلاحیتیں ہیں۔ ان صلاحیتوں کی بدولت تو کائنات کے مخفی سے مخفی راز کھول سکتا ہے۔ تُو محنت و مشقت کرنے والا ہے۔ اور جانتا ہے کہ جس نے کوشش کی اُس نے پالیا۔ انسان جس کی کوشش کرتا ہے اللہ تعالیٰ وہی عطا فرماتا ہے۔ اے انسان تو فساد کرنے اور خون بہانے والا ہے لیکن ساتھ ساتھ کسی کو تکلیف دینا بھی پسند نہیں کرتا ہے۔ اے انسان تجھ میں قہاری کے ساتھ ساتھ غفاری خصوصیات بھی موجود ہیں۔ اے ابن آدم تُو ان خداداد صلاحیتوں کی بدولت اشرف المخلوقات اور اس جہاں کا فرماں روا ہے۔ تُو اس جہان کی تقدیر بنانے والا ہے۔ یہ جہان تیری مرضی اور خواہش کا پابند ہے۔ اس جہاں کی قسمت تیرے ہاتھ ہے، اب یہ تیری مرضی کہ تُو اسے آباد کرتا ہے یا بربادی کی طرف لے جاتا ہے۔

سلطان ٹیپو کی وصیت

شعر نمبرا

تُو رہِ نَوَردِ شوق ہے منزل نہ کر قبُول   لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمِل نہ کر قبول

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ شعر نظم "سلطان ٹیپو کی وصیت" سے لیا گیا ہے۔ اس نظم کے شاعر حکیم الامت علامہ اقبال ہیں۔ یہ نظم اقبال کے مجموعہ کلام "ضربِ کلیم" سے ماخوذ ہے۔

(ب) تشریح:

علامہ اقبال کی یہ نظم بھی تمثیلی ہے۔ اقبال کے خیال کے مطابق اگر ٹیپو سلطان نے وصیت کی ہوتی تو اس طرح کی ہوتی۔ اس لیے اس شعر میں تصوراتی طور پر ٹیپو سلطان کی زبانی ہمیں یہ پیغام دیتے ہیں کہ اے انسان تُو راہِ محبت کا مسافر ہے اس لیے تجھے منزل قبول نہیں کرنی چاہیے۔ کیوں کہ منزل ملنے کے بعد انسان جمود اور سکون میں مبتلا ہو جاتا ہے جو کہ انسان کو زیب نہیں دیتا ہے۔ کامیاب انسان وہی ہے جو مسلسل جدوجہد اور حرکت میں رہے۔ مزید کہتے ہیں بلکہ اگر تیرے ساتھ لیلیٰ جیسی محبوبہ بھی ساتھ شریکِ سفر ہو تب بھی سکوت اور جمود کا شکار مت ہونا اور اس دنیا میں ہرگز دل نہ لگانا کیونکہ یہ دنیا تیری منزل نہیں، یہ تو نشانِ منزل ہے۔ منزل بہت آگے ہے۔ اس شعر میں شاعر انسان کو ہر حال حرکت و عمل، جہدِ مسلسل کا پیغام دے رہے ہیں۔

شعر نمبر۲

اے جُوئے آب بڑھ کر ہو دریائے تند و تیز   ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ شعر نظم "سلطان ٹیپو کی وصیت" سے لیا گیا ہے۔ اس نظم کے شاعر حکیم الامت علامہ اقبال ہیں۔ یہ نظم اقبال کے مجموعہ کلام "ضربِ کلیم" سے ماخوذ ہے۔

(ب) تشریح:

علامہ اقبال کی یہ نظم بھی تمثیلی ہے۔ اقبال کے خیال کے مطابق اگر ٹیپو سلطان نے وصیت کی ہوتی تو اس طرح کی ہوتی۔ اس لیے اس شعر میں تصوراتی طور پر ٹیپو سلطان کی زبانی ہمیں یہ پیغام دیتے ہیں کہ اے مسلمانوں چھوٹی چھوٹی ندیوں، ٹکڑیوں میں بٹ کر نہ رہو۔ وقتی اور محدود مفادات کے تابع اور پابند بن کر خود کو ضایع مت کرو۔ بلکہ آگے بڑھ کر اور مل جُل کر طاقت ور، ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا کی مانند بن جاؤ، جو ہر رکاوٹ کو تہس نہس کر کے اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہتا ہے۔ ایسا دریا جو کسی کنارے کو قبول نہ کرے۔ دریا کی طرح متحد ہو جاؤ کہ دشمن تمھیں نقصان نہ پہنچا سکے۔

اس شعر میں تمثیلی انداز میں شاعر کہہ رہے ہیں کہ اے مسلمانو! تم دریا کی ایسی موجوں کی طرح بن جاؤ جیسے دریا تیزی سے بہے تو تم اس دریا سے بھی زیادہ ڈٹ کر دشمن کا مقابلہ کرو۔ اس جہدِ مسلسل میں تمھیں کہاں سکون، سکوت یا جمود کا شکار نہیں ہونا ہے۔ کیوں کہ زندگی حرکت و عمل ہی کا نام ہے۔ ایسے ہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو مسلسل کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS www.studypak.xyz

شعر نمبر ۳

کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں
محفل گداز! گرمیٔ محفل نہ کر قبول

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ شعر نظم "سلطان ٹیپو کی وصیت" سے لیا گیا ہے۔ اس نظم کے شاعر حکیم الامت علامہ اقبال ہیں۔ یہ نظم اقبال کے مجموعہ کلام "ضربِ کلیم" سے ماخوذ ہے۔

(ب) تشریح:

علامہ اقبال کی یہ نظم بھی تمثیلی ہے۔ اقبال کے خیال کے مطابق اگر ٹیپو سلطان نے وصیت کی ہوتی تو اس طرح کی ہوتی۔ اس لیے اس شعر میں تصوراتی طور پر ٹیپو سلطان کی زبانی ہمیں یہ پیغام دیتے ہیں کہ اے مسلمان تُو دنیا کی رنگینوں اور رونقوں میں گم مت ہو جانا۔ یہ دنیا تو کافروں کے لیے جنت اور مومنوں کے لیے قید خانے کی طرح ہے۔ اے مسلمان تُو اللہ کی توحید پر اور حضور اکرم ﷺ کی رسالت پر ایمان رکھتا ہے۔ تُو بتوں کو نہیں پوجتا ہے اور نہ ہی کبھی پوجے گا۔ لیکن مجھے یہ ڈر ہے کہ تُو دنیاوی خواہشات کے بتوں میں مبتلا نہ ہو جائے۔ اگر ایسا ہے تو یہ دنیا بھی تیرے لیے بت خانہ ہے۔ تُو مسلمان ہو کر بھی خواہشاتِ نفسانی میں مبتلا ہے۔ جب کہ تجھے تو اپنی خواہشات کو اپنے رب تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت کی پابندی میں رکھنی چاہیے۔ لہذا یاد رکھ اے مسلمان دنیا کی برائیوں میں، رونقوں میں ایسا نہ گم ہو جانا کہ اپنے رب تعالیٰ کی اطاعت اور فرمابرداری سے ہی غافل ہو جائے۔ دنیا میں مگن ہو کر خالقِ حقیقی کی نافرمانی کرنا تیری شان کے لائق نہیں۔ یہ خامیاں تو اللہ اور رسول کے انکار کرنے والوں کی ہیں۔ یہ بات بھی ذہن نشین کر لے کہ تُو تو محفل کی جان ہوتا ہے اور محفل کو پر جوش رکھتا ہے لہٰذا دنیا کو اپنے تابع رکھنا، خود کبھی بھی دنیا کے تابع مت بننا۔

JOIN FOR MORE!!!

شعر نمبر ۴

صبحِ ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دِل نہ کر قبول

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ شعر نظم "سلطان ٹیپو کی وصیت" سے لیا گیا ہے۔ اس نظم کے شاعر حکیم الامت علامہ اقبال ہیں۔ یہ نظم اقبال کے مجموعہ کلام "ضربِ کلیم" سے ماخوذ ہے۔

(ب) تشریح:

علامہ اقبال کی یہ نظم بھی تمثیلی ہے۔ اقبال کے خیال کے مطابق اگر ٹیپو سلطان نے وصیت کی ہوتی تو اس طرح کی ہوتی۔ اس لیے اس شعر میں تصوراتی طور پر ٹیپو سلطان کی زبانی ہمیں پیغام دے رہے ہیں۔ اس شعر میں علامہ اقبال اپنی شاعری کا وہ نظریہ عقل و عشق بیان کرتے ہیں، جس نظریے میں اقبال عشق کو عقل سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اس نظریے میں اقبال عقل کی اہمیت کا انکار بھی نہیں کرتے لیکن بہر حال عشق کو فوقیت دیتے ہیں۔ اقبال اپنے نظریے میں کہتے ہیں کہ عشق والے دنیا و آخرت دونوں میں کامیاب و کامران رہتے ہیں جب کہ عقل والے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اس شعر میں بھی شاعر کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات انسان کو پیدا فرمایا، اسی وقت، یعنی خلقت کے پہلے دن انسان سے فرشتوں نے کہہ دیا تھا کہ یاد رکھو عقل کو سب کچھ مت سمجھ لینا۔ اپنے فیصلے دل سے کرنا۔ جو لوگ عقل کے غلام ہوتے ہیں وہ عشق کے فیصلے نہیں مانتے اور وہی لوگ ناکام اور نامراد رہتے ہیں۔ اس کے برعکس عشق والے عقل کے فیصلے قبول نہیں کرتے ہیں۔ عشق والوں کو پتا ہوتا ہے کہ عقل سے منزل نہیں ملتی۔

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

شعر نمبر ۵

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے　　　　شرکت میانۂ حق وباطل نہ کر قبول

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ شعر نظم "سلطان ٹیپو کی وصیت" سے لیا گیا ہے۔ اس نظم کے شاعر حکیم الامت علامہ اقبال ہیں۔ یہ نظم اقبال کے مجموعہ کلام "ضربِ کلیم" سے ماخوذ ہے۔

(ب) تشریح:

علامہ اقبال کی یہ نظم بھی تمثیلی ہے۔ اقبال کے خیال کے مطابق اگر ٹیپو سلطان نے وصیت کی ہوتی تو اس طرح کی ہوتی۔ اس لیے اس شعر میں تصوراتی طور پر ٹیپو سلطان کی زبانی ہمیں پیغام دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ حق اور باطل کی جنگ ابتداء سے چلی آرہی ہے۔ سچ اپنی صفات میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ حق کا ماننے والا کبھی باطل کا حمایتی نہیں ہوتا ہے۔ حقِ تعالیٰ پر ایمان والا اپنے رب ہی پر بھروسہ کرتا ہے۔ جب کہ باطل یا کافر قوتیں اللہ کو نہیں مانتیں۔ وہ دنیاوی سازوسامان، مادی چیزوں اور اسباب پر نظر رکھتی ہیں۔ لہٰذا اے مسلمانو! ظاہری مادی چیزوں، مال واسباب پر بھروسہ نہیں کرنا بلکہ مسبّب الاسباب خالقِ حقیقی پر بھروسہ رکھو گے تو دونوں جہانوں میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ اور دشمن بھی تمھیں نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک کلام میں اس طرح کہی ہے۔

"حق آگیا۔ باطل مٹ گیا، اور باطل مٹنے ہی کے لیے ہے"۔ (سورۃ بنی اسرائیل پارہ ۱۵)

JOIN FOR MORE!!!

سورۂ رحمٰن (ایک تاثر)

بند نمبر ۱

اے فنا انجام انساں کب تجھے ہوش آئے گا　　　　تیرگی میں ٹھوکریں آخر کہاں تک کھائے گا
اس تمرد کی رَوِش سے بھی کبھی شرمائے گا　　　　کیا کرے گا سامنے سے جب حِجاب اٹھ جائے گا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند نظم "سورۂ رحمٰن (ایک تاثر)" سے لیا گیا ہے۔ اس نظم کے شاعر جوش ملیح آبادی ہیں جن کو شاعرِ انقلاب اور شاعرِ شباب کہا جاتا ہے۔

(ب) تشریح:

جوش ملیح آبادی نے اس نظم میں سورۂ مبارکہ سورۃ رحمٰن کا تاثر قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اس بند میں شاعر کہتے ہیں کہ اے فانی انسان تجھے کب ہوش آئے گا؟ کب تُو اللہ تعالیٰ کے احکامات کو بجالائے گا، کب تُو خود کو تبدیل کر کے اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کرے گا؟ تُو موت کے قریب تر ہوتا جارہا ہے، تیری زندگی برف کی مانند پگھلتی جارہی ہے لیکن تُو پھر بھی اندھیروں میں بھٹکا جارہا ہے۔ اے انسان تُو نے اپنی زندگی کا زیادہ تر وقت اپنے رب کی نافرمانی میں گزار دیا۔ غرور تکبر نے تیری آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے۔ تُو کس بات پر تکبر کرتا ہے تجھے اپنے اس رویہ پر ذرا سی بھی ندامت نہیں ہوتی! اب تو اپنے طریقہ ہائے زندگی کو بدل کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں لگ جا۔ اپنے سابقہ طرزِ عمل پر شرمندہ ہو جا۔ اپنے رب کی سرکشی سے باز آجا۔ اگر تُو نے اب بھی ایسا نہیں کیا تو یاد رکھ جلد تیری آنکھوں کے سامنے وہ پردہ اٹھ جائے گا اور موت کا فرشتہ تیرا کام تمام کر دے گا۔ کیا تُو اُس وقت اللہ تعالیٰ سے توبہ واِستغفار کرے گا؟ اگر اس وقت پر امید لگائے بیٹھا ہے تو یاد رکھ، اس وقت تو توبہ کا دروازہ بند ہو چکا ہو گا۔ اُس وقت کی توبہ قابلِ قبول نہیں ہو گی۔ لہٰذا جلد از جلد توبہ کر، اپنی رَوِش بدل ورنہ موت تیری تمام آرزوؤں

کو ختم کر دے گی۔اے غافل اس وقت کو غنیمت جان۔بتا تو سہی کہ تو اپنے رب تعالیٰ کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلائے گا۔تُو اپنے رب کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کر سکتا۔اللہ تعالیٰ نے تجھے اتنی ساری نعمتوں سے نوازا ہے کہ تُو کمزور، ناتواں اپنے خالقِ حقیقی کی عنایات کا شکر ادا کر ہی نہیں سکتا ہے۔

بند نمبر ۲

یہ سحر کا حُسن، یہ سیارگاں اور یہ فضا　　یہ معطر باغ، یہ سبزہ، یہ کلیاں دل رُبا
یہ بیاباں، یہ کھلے میدان، یہ ٹھنڈی ہوا　　سوچ تُو، کیا کیا، کیا ہے تجھ کو قدرت نے عطا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند نظم "سورۂ رحمٰن (ایک تاثر)" سے لیا گیا ہے۔ اس نظم کے شاعر جوش ملیح آبادی ہیں جن کو شاعر انقلاب اور شاعر شباب کہا جاتا ہے۔

(ب) تشریح:

جوش ملیح آبادی نے اس نظم میں سورہ رحمٰن کا تاثر قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔اس بند میں شاعر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے کچھ کا ذکر کر رہا ہے۔یہ صبح کا خوب صورت اور حَسین منظر، یہ سیارے، یہ فضا، یہ ماحول، یہ خوشبو دار باغات، یہ دل کش سبزہ، کلیاں یہ سب چیزیں انسان کو خوش کرنے، فائدہ اٹھانے کے لیے رب تعالیٰ نے تخلیق کیں ہیں۔اے فنا ہو جانے والے اور غافل انسان اِن پر غور تو کر۔ مزید یہ بھی دیکھ کہ اللہ تعالیٰ نے یہ میدان، یہ جنگل کس کے لیے بنائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ٹھنڈی ہوا کس کے لیے بنائی ہے۔اے انسان غور و فکر تو کر، اللہ تعالیٰ نے تجھے کیا کیا نعمتیں عنایت کی ہیں۔اے غافل اس وقت کو غنیمت جان بتا تو سہی کہ تو اپنے رب تعالیٰ کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلائے گا۔تُو اپنے رب کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کر سکتا۔اللہ تعالیٰ نے تجھے اتنی ساری نعمتوں سے نوازا ہے کہ تُو کمزور، ناتواں اپنے خالقِ حقیقی کی عنایات کا شکر ادا کر ہی نہیں سکتا ہے۔

بند نمبر ۳

خُلد میں حُوریں تِری مشتاق ہیں، آنکھیں اُٹھا　　نیچی نظریں جن کا زیور، جن کی آرائش حیا
جن ّو انساں میں کسی نے بھی نہیں جن کو چھُوا　　جن کی باتیں عِطر میں ڈوبی ہوئی جیسے صَبا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند نظم "سورۂ رحمٰن (ایک تاثر)" سے لیا گیا ہے۔ اس نظم کے شاعر جوش ملیح آبادی ہیں جن کو شاعر انقلاب اور شاعر شباب کہا جاتا ہے۔

(ب) تشریح:

جوش ملیح آبادی نے اس نظم میں سورہ رحمٰن کا تاثر قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔اس بند میں شاعر جنت کی نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے انسان اگر تُو نے دنیا میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری کی تو جنت میں تجھے حوریں ملیں گی۔ بلکہ وہ تیرا انتظار کر رہی ہیں۔وہ حوریں جن کی شان اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں یہ بتائی ہے کہ حوریں با حیا ہوں گی۔پاک دامن ہوں گی۔جن ّ اور انسانوں میں سے کسی نے انھیں دیکھا نہ مس کیا، نہ چھوا ہو گا۔اُن حوروں کی باتیں دل کو خوش کرنے والی ہیں۔ جیسے بہار کی تازہ ہَوا۔اے انسان غور و فکر تو کر، اللہ تعالیٰ

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS www.

نے تجھے کیا کیا نعمتیں عنایت کی ہیں۔اے غافل اس وقت کو غنیمت جان بتا تو سہی کہ تو اپنے رب تعالیٰ کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلائے گا۔تُو اپنے رب کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے تجھے اتنی ساری نعمتوں سے نوازا ہے کہ تُو کمزور،ناتواں اپنے خالقِ حقیقی کی عنایات کا شکر ادا کر ہی نہیں سکتا ہے۔

بند نمبر۴

سبز گہرے رنگ کی بیلیں چڑھی ہیں جابجا نرم شاخیں جھومتی ہیں، رقص کرتی ہے صبا
پھل وہ شاخوں میں لگے ہیں دل فریب و خوش نما جن کا ہر ریشہ ہے قند و شہد میں ڈوبا ہُوا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند نظم "سورۂ رحمٰن (ایک تاثر)" سے لیا گیا ہے۔ اس نظم کے شاعر جوش ملیح آبادی ہیں جن کو شاعر انقلاب اور شاعر شباب کہا جاتا ہے۔

JOIN FOR MORE!!!

(ب) تشریح:

جوش ملیح آبادی نے اس نظم میں سورہ رحمٰن کا تاثر قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔اس بند میں شاعر جنت کی مزید خصوصی نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے انسان کو غور و فکر کی دعوت دے رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت میں جو نعمتیں تیری لیے بنائی ہیں وہ بظاہر تو اِس دنیا جیسی ہیں مگر اُن کی لذت دنیا کی کوئی چیز نہیں دے سکتی ہے۔اے انسان تُو ذرا سوچ کہ اللہ تعالیٰ نے کیسے کیسے خوش رنگ پودے اور بیلیں پیدا کی ہیں۔ سبز گہرے رنگ کی بیلوں کو دیکھ کر آنکھوں میں طراوت آجاتی ہے۔ جب ہَوا چلتی ہے تو درختوں، پودوں اور بیلوں کی ٹہنیاں ہلنے لگتی ہیں۔یوں لگتا ہے کہ جیسے خوشی سے جھوم رہی ہیں۔ شاخوں میں ایسے پیارے اور دلوں کو خوش کرنے والے پھل لگے ہوئے ہیں جو ذائقے میں شہد کی طرح ہیں اور اُن کا ایک ایک ریشہ (ٹکڑا) مٹھاس سے بھرا ہوا ہے۔اے غافل اس وقت کو غنیمت جان بتا تو سہی کہ تو اپنے رب تعالیٰ کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلائے گا۔تُو اپنے رب کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے تجھے اتنی ساری نعمتوں سے نوازا ہے کہ تُو کمزور،ناتواں اپنے خالقِ حقیقی کی عنایات کا شکر ادا کر ہی نہیں سکتا ہے۔

بند نمبر۵

پھول میں خوشبو بھری، جنگل کی بُوٹی میں دوا بحر سے موتی نکالے صاف روشن خوش نما
آگ سے شعلہ نکالا، ابر سے آبِ صفا کس سے ہو سکتا ہے اس کی نعمتوں کا حق ادا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند نظم "سورۂ رحمٰن (ایک تاثر)" سے لیا گیا ہے۔ اس نظم کے شاعر جوش ملیح آبادی ہیں جن کو شاعر انقلاب اور شاعر شباب کہا جاتا ہے۔

(ب) تشریح:

جوش ملیح آبادی نے اس نظم میں سورہ رحمٰن کا تاثر قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔اس بند میں شاعر اللہ تعالیٰ کی مزید نعمتوں کا ذکر کر کے انسان کو رب تعالیٰ کے قریب لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔شاعر کہتے ہیں کہ اے غافل انسان، پھول میں خوشبو کس نے ڈالی ہے؟ جنگل جسے ہماری اکثریت فضول سمجھتی ہے، وہاں جانے سے کتراتی ہے لیکن جنگل میں بھی اللہ تعالیٰ نے جو پودے اور جڑی بوٹیاں پیدا کیں ہیں

اُن میں بھی ہمارے لیے شِفااور صحت یابی رکھی ہے۔ سوچ تو سہی کس ذات نے یہ خوبیاں جنگل کی جڑی بُوٹیوں میں رکھی ہیں، وہ ذات اللہ تعالیٰ ہی کی ہے۔ لیکن تُو غافل اور نادان ہے۔ جوشؔ مزید کہتے ہیں کہ سمندر میں موتی کتنے صاف وشفاف وخوش نما اور خوب صورت ہوتے ہیں تُو نے کبھی غور بھی کیا؟ یہ کس نے بنائے ہیں؟ یہ بھی ہمارے ربِ عزوجل نے ہی تخلیق کیے ہیں۔ اے انسان اللہ تعالیٰ اگر آگ نہ بناتا تو تُو کیا کرتا؟ آگ بھی اسی رب نے بنائی ہے۔ بارش پر غور کر! کتنا صاف وشفاف پانی آسمان سے برساتا ہے، جو تیری صحت کے لیے بھی بہت مفید ہے اور کھیتوں، باغات، فصلوں کے لیے بھی بہت فائدہ مند ہے۔ عام پانی تُو بہت استعمال کرتا ہے فصلیں اور اناج میں اس سے بھی اضافہ ہوتا ہے لیکن جب بارش کا تھوڑا سا پانی فصلوں میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے چلا جاتا ہے تو فصلیں عام پانی کی نسبت بہت اناج پیدا کرتی ہیں۔ اے انسان تیری بنائی ہوئی چیز اور رب تعالیٰ کی بنائی ہوئی چیز میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس کا اندازہ اے انسان تُو بالکل بھی نہیں کر سکتا ہے۔ اے انسان غور وفکر تو کر، اللہ تعالیٰ نے تجھے کیا کیا نعمتیں عنایت کی ہیں۔ اے غافل اس وقت کو غنیمت جان بتا تو سہی کہ تو اپنے رب تعالیٰ کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلائے گا۔ تُو اپنے رب کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے تجھے اتنی ساری نعمتوں سے نوازا ہے کہ تُو کمزور، ناتواں اپنے خالقِ حقیقی کی عنایات کا شکر ادا کر ہی نہیں سکتا ہے۔

بند نمبر۶

صبح کے شفاف تاروں سے برستی ہے ضِیا
شام کو رنگِ شفق کرتا ہے اک محشر بپا

چودھویں کے چاند سے بہتا ہے دریا نور کا
جھوم کر برسات میں اٹھی ہے متوالی گھٹا

کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ بند نظم "سورۂ رحمٰن (ایک تاثر)" سے لیا گیا ہے۔ اس نظم کے شاعر جوشؔ ملیح آبادی ہیں جن کو شاعرِ انقلاب اور شاعرِ شباب کہا جاتا ہے۔

(ب) تشریح:

جوشؔ ملیح آبادی نے اس نظم میں سورہ رحمٰن کا تاثر قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اس بند میں شاعر نے نظامِ فلکی کا ذکر کر کے انسان کو احساس دِلانے کی کوشش کی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے۔ شاعر کہتا ہے کہ دن اور رات کی مختلف کیفیتوں کو نظارہ کرو۔ صبح کے وقت روشن ستاروں سے کیسی خوب صورت روشنی ظاہر ہوتی ہے؟ یہ وہی وقت ہے جس وقت ہمارے پیارے نبی ﷺ کی اس دنیا میں تشریف آوری ہوئی تھی۔ اس کے بعد شام کو شاعر موضوع بناتا ہے کہ اے انسان جب شام ہوتی ہے تو اُس کا اختتامی وقت پر غور کر جب سورج غروب ہو رہا ہوتا ہے اور شفق پھوٹتی ہے۔ سرخ مائل زرد رنگ کا سورج کیسا حسین لگ رہا ہوتا ہے۔ ایک قیامت خیز منظر تُو دیکھتا ہے، یہ سب کس کے لیے اور کس کے حکم سے ہوتا ہے؟ چودھویں تاریخ کی رات کو جب ماہِ کامل یعنی پورا چاند ہوتا ہے تو اس کی آب وتاب آنکھوں کے سامنے کیسا دل کش منظر پیش کر رہی ہوتی ہے؟ ایسا لگ رہا ہوتا ہے جیسے نُور کا دریا بہہ رہا ہو۔ اسی طرح بارش کے موسم میں مسلسل کالی گھٹائیں دلوں کو مسرور کرتی رہتی ہیں۔ اے انسان اس منظر پر ہی غور کر! کیا پھر بھی اپنے رب نافرمانی کرتا رہے گا؟ اے انسان غور وفکر تو کر، اللہ تعالیٰ نے تجھے کیا کیا نعمتیں عنایت کی ہیں۔ اے غافل اپنے رب تعالیٰ کی کون کون سی نعمتیں کو جھٹلائے گا۔ تُو اپنے رب کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے تجھے اتنی ساری نعمتوں سے نوازا ہے کہ تُو اپنے خالقِ حقیقی کی عنایات کا شکر ادا کر ہی نہیں سکتا ہے۔ لہٰذا جتنا ہو سکے اپنے رب کی نعمتوں کا شکر ادا کر۔

پرانا کوٹ

شعر نمبر ۱

خرید اجاڑوں میں نیلام سے پُرانا کوٹ جو پھٹ کے چل نہ سکے یہ نہیں ہے ایسا نوٹ

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ شعر نظم "پرانا کوٹ" سے لیا گیا ہے۔ یہ مزاحیہ نظم سید محمد جعفری کی ہے۔ جن کا شمار اردو کے ممتاز مزاحیہ شاعروں میں ہوتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس شعر میں شاعر سید محمد جعفری کہتے ہیں کہ انھوں نے سردیوں میں اپنے لیے ایک پُرانا کوٹ نیلامی میں سے خریدا۔ مگر یہ کوٹ ایسا نہیں ہے کہ پھٹ جانے کے بعد بے کار ہو جائے۔ بلکہ یہ تو اتنا پرانا ہو چکا ہے کہ اس طرح اس کے پھٹنے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہو گا اور یہ پھر بھی بیچا جا سکے گا۔ یہ کوٹ بنا ہی نیلام کی دکان کے لیے ہے۔ ورنہ کوئی شریف انسان اس کو پہننے کے لیے نہیں خرید سکتا۔ اس شعر میں شاعر طنزیہ انداز میں یہ بات بھی کہہ رہے ہیں کہ یہ پھٹے ہوئے نوٹ کی طرح نہیں ہے کہ جو پھٹنے کے بعد نہ چل سکے۔

JOIN FOR MORE!!!

شعر نمبر ۲

بنا ہے کوٹ یہ نیلام کی دُکاں کے لیے "صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے"

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ شعر نظم "پرانا کوٹ" سے لیا گیا ہے۔ یہ مزاحیہ نظم سید محمد جعفری کی ہے۔ جن کا شمار اردو کے ممتاز مزاحیہ شاعروں میں ہوتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس شعر میں شاعر سید محمد جعفری کہتے ہیں کہ یہ کوٹ بنا ہی نیلام کی دوکان کے لیے تھا۔ یہ پرانا ہونے کے باوجود بار بار خریدا اور بیچا جا سکتا ہے۔ ایک دکان سے دوسری دکان، اور ایک گاہک سے دوسرے گاہک اسے خریدتے اور پہنتے ہیں۔ لہٰذا اس کوٹ کو حاصل کرنے کے لیے تمام لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے۔ جبکہ وہ اس پر رائے زنی بھی کر سکتے ہیں کہ یہ کوٹ کیسا ہے؟ اچھا ہے، بُرا ہے۔ اس شعر کا دوسرا مصرع غالبؔ کا ہے۔ جسے شاعری میں صنعتِ اشتقاق، یا عام طور پر تحریف بھی کہتے ہیں۔

شعر نمبر ۳

بڑا بزرگ ہے یہ، آزمودہ کار ہے یہ کسی مرے ہوئے گورے کی یادگار ہے یہ

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ شعر نظم "پرانا کوٹ" سے لیا گیا ہے۔ یہ مزاحیہ نظم سید محمد جعفری کی ہے۔ جن کا شمار اردو کے ممتاز مزاحیہ شاعروں میں ہوتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس شعر میں شاعر سید محمد جعفری نے تین باتیں طنزاً کہیں ہیں کہ کوٹ بہت بزرگ ہے یعنی بہت پُرانا اور خستہ حال ہے۔ یہ آزمایا ہوا ہے۔ مطلب ہے کہ بہت سارے لوگوں نے اس کوٹ کو طویل عرصے تک پہنا اور استعمال کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی کہ کسی انگریز (گورے) نے بھی اسے استعمال کیا ہے۔ لہٰذا اب اگر ہم مشرقی لوگ بھی اسے پہننے میں بڑا فخر محسوس کریں گے۔ ساتھ ہی یہ

بھی کہیں گے کہ بھئی یہ تو ترقی یافتہ لوگوں کے استعمال میں بھی رہ چکا ہے۔ اس شعر میں شاعر اہلِ مشرق کی احساس محرومی، احساسِ کمتری کو بھی بیان کر رہے ہیں۔

شعر نمبر ۴

پرانی وضع کا بے حد عجیب جامہ ہے　　پہن چکا اسے خود "واسکوڈی گاما" ہے

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ شعر نظم "پرانا کوٹ" سے لیا گیا ہے۔ یہ مزاحیہ نظم سید محمد جعفری کی ہے۔ جن کا شمار اردو کے ممتاز مزاحیہ شاعروں میں ہوتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس شعر میں شاعر سید محمد جعفری کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ کوٹ پرانی وضع کو لباس ہے، جو آج کل استعمال میں لانا عجیب وغریب لگتا ہے۔ مگر پھر بھی ہم اس کو فخر سے پہنتے ہیں۔ گو کہ یہ کوٹ اتنا پرانا ہے کہ اسے دنیا کے مشہور سیاح واسکوڈی گاما بھی پہن چکے ہیں، جس کا زمانہ آج سے پانچ سو سال پہلے کا ہے۔ اس شعر میں شاعر نے مبالغہ سے مزاح پیدا کیا ہے اور کوٹ کو شان و شوکت سے پہنے پر طنز کیا ہے۔

JOIN FOR MORE!!!

شعر نمبر ۵

نہ دیکھ کہنیوں پر اِس کی خستہ سامانی　　پہن چکے ہیں اسے ترک اور ایرانی

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ شعر نظم "پرانا کوٹ" سے لیا گیا ہے۔ یہ مزاحیہ نظم سید محمد جعفری کی ہے۔ جن کا شمار اردو کے ممتاز مزاحیہ شاعروں میں ہوتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس شعر میں شاعر سید محمد جعفری کہتے ہیں کہ اس کوٹ کی بوسیدہ اور پھٹی ہوئی کہنیوں کا خیال مت کرو۔ بس اتنا سوچو کہ یہ کوٹ کس قدر قیمتی اور اہم ہے کہ اس کوٹ کو ترکوں اور ایرانیوں نے بھی پہنا ہے۔ جو ہمارے علاقوں میں صدیوں پہلے آئے تھے۔ اس کے علاوہ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوٹ مختلف ممالک میں استعمال ہوتا رہا ہے بلکہ یوں کہیے کہ اس نے بہت سے ملکوں کی سیر بھی کی ہوئی ہے۔ ایرانیوں نے ہندوستان پر جب کہ ترکوں نے عرب ممالک پر سلطنتِ عثمانیہ کی بنیاد رکھی تھی۔

شعر نمبر ۶

جگہ جگہ یہ پھرا مثلِ "مارکوپولو"　　یہ کوٹ کوٹوں کا لیڈر رہے اس کی "جے" بولو

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ شعر نظم "پرانا کوٹ" سے لیا گیا ہے۔ یہ مزاحیہ نظم سید محمد جعفری کی ہے۔ جن کا شمار اردو کے ممتاز مزاحیہ شاعروں میں ہوتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس شعر میں شاعر سید محمد جعفری کہتے ہیں کہ یہ کوٹ مختلف ممالک میں پھرتا رہا ہے۔ اسی طرح یہ کوٹ صرف ایک عام اور معمولی کوٹ نہیں ہے بلکہ کوٹوں کا لیڈر رہے۔ کیوں کہ لیڈر ہی دنیا کے مختلف ملکوں کا سفر کرتے ہیں۔ اس جے بولو یعنی اس کے حق میں نعرے لگاؤ۔ شاعر بطورِ مبالغہ اور طنزیہ کوٹ کی تعریف کر رہا ہے۔ اس سے شاعر کا مقصد اس پرانے کوٹ کا مزاق اڑانا اور قاری کو ہنسانا ہے۔

شعر نمبر ۷

بڑا بزرگ ہے یہ گو قلیل قیمت ہے　　میاں بزرگوں کا سایہ بڑا غنیمت ہے

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ شعر نظم "پرانا کوٹ" سے لیا گیا ہے۔ یہ مزاحیہ نظم سید محمد جعفری کی ہے۔ جن کا شمار اردو کے ممتاز مزاحیہ شاعروں میں ہوتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس شعر میں شاعر سید محمد جعفری کوٹ کی بزرگی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ کوٹ اس قدر پرانا اور تجربہ کار کوٹ ہے جس طرح ہمارے بزرگ لوگ ہوتے ہیں۔ اس شعر میں شاعر نے پرانے کوٹ کو بزرگوں سے تشبیہ دی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ کوٹ بہت پرانا ہے، تجربہ کار ہے اس کے باوجود اس کی قیمت بہت ہی کم ہے۔ اے لوگو! اس پرانے کوٹ کی قدر کرو۔ جس طرح ہمارے لیے بڑوں کا سایہ بہت فائدہ مند ہوتا ہے اسی طرح اس پرانے کوٹ کا ہمارے درمیان ہونا بھی باعث اعزاز، اطمینان و سکون اور باعثِ برکت ہے۔

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS BASIM www.studypak.xyz

شعر نمبر ۸

نشان ہیں کسی ٹیچر کی بادشاہی کے　　ہیں اس پہ دھبّے جو سرخی کے اور سیاہی کے

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ شعر نظم "پرانا کوٹ" سے لیا گیا ہے۔ یہ مزاحیہ نظم سید محمد جعفری کی ہے۔ جن کا شمار اردو کے ممتاز مزاحیہ شاعروں میں ہوتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس شعر میں شاعر سید محمد جعفری کہتے ہیں کہ اس پرانے کوٹ پر جو سرخ، لال اور کالے دھبے اور نشانات ہیں یہ کسی استاد کے قلم کی روشنائی (ink) کے داغ دھبے ہیں۔ جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس کوٹ کو کسی استاد نے پہنا ہے اور اس پر حکمران رہا ہے۔ اس شعر میں استاد کی مفلوک الحالی پر بھی طنز کیا ہے۔ کیوں کہ استاد خود کتنا مفلوک الحال ہوتا ہے نہ اپنے لباس کا خیال رکھ سکتا ہے نہ کسی اور چیز کا۔ شاعر نے استاد اور کوٹ کی نسبت سے معاشرے میں اساتذہ کو دی جانے والی کم حیثیتی کی جانب اشارۃً اور طنزاً بیان کیا ہے۔ جس کے کئی مطالب لیے جاسکتے ہیں۔

شعر نمبر ۹

جگہ جگہ جو یہ کیڑوں کی ضرب کاری ہے　　نئی طرح کی یہ صنعت ہے، دستکاری ہے

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ شعر نظم "پرانا کوٹ" سے لیا گیا ہے۔ یہ مزاحیہ نظم سید محمد جعفری کی ہے۔ جن کا شمار اردو کے ممتاز مزاحیہ شاعروں میں ہوتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس شعر میں شاعر سید محمد جعفری پرانے کوٹ کو جو کیڑوں مکوڑوں نے کاٹ کاٹ کر سوراخ کیے ہیں اس کو جدید صنعت، دست کاری کہہ کر پکارتے ہوئے ہے کہا کہ یہ جو کوٹ میں سوراخ وغیرہ ہیں یہ نئے زمانے کا نیا انداز ہے، نیا فیشن ہے۔ شاعر کہتے ہیں کہ اس کوٹ میں جگہ جگہ

جو سوراخ ہوگئے ہیں وہ کیڑوں نے کسی کی فرمائش پر نئے زمانے کے لحاظ سے بنائے ہیں۔ کیڑوں کے اس عمل سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ بھی ہنر مندی اور دست کاری میں کمال رکھتے ہیں۔

شعر نمبر ۱۰

جو قدر دان ہیں وہ جانتے ہیں قیمت کو — کہ آفتاب چُرا لے گیا ہے رنگت کو

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ شعر نظم "پرانا کوٹ" سے لیا گیا ہے۔ یہ مزاحیہ نظم سید محمد جعفری کی ہے۔ جن کا شمار اردو کے ممتاز مزاحیہ شاعروں میں ہوتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس شعر میں شاعر سید محمد جعفری طنزیہ انداز میں کہتے ہیں کہ یہ اتنا پرانا کوٹ ہے کہ دھوپ لگ لگ کر اس کا سارا رنگ اڑ گیا ہے۔ طنزاً شاعر کہنا چاہ رہے ہیں کہ در اصل ایسا نہیں ہے بلکہ یہ کوٹ تو اتنا قیمتی ہے کہ سورج اس کی رنگت کو چرا کر لے گیا ہے۔ اس کے باوجود جو لوگ پرانی چیزوں سے بہت محبت کرتے ہیں یا بہت کنجوس ہوتے ہیں، وہ اس کوٹ کی قیمت کا اندازہ صحیح لگا سکتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ سخی اور کنجوس کا خرچ مہینے کے آخر میں برابر ہوتا ہے۔ اس طرف اشارہ لگ رہا ہے کہ جو کنجوس ہوتے ہیں وہ پرانی اشیاء بھی مہنگی خرید لیتے ہیں اور انھیں پتا بھی نہیں چلتا ہے۔ اور اپنے آپ پر فخر کرتے ہیں کہ ہم نے یہ چیز سستی خرید لی ہے۔

شعر نمبر ۱۱

یہ کوٹ کوٹوں کی دنیا کا بادا آدم ہے — اگرچہ ہے وہ نگہ جو نگاہ سے کم ہے

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ شعر نظم "پرانا کوٹ" سے لیا گیا ہے۔ یہ مزاحیہ نظم سید محمد جعفری کی ہے۔ جن کا شمار اردو کے ممتاز مزاحیہ شاعروں میں ہوتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس شعر میں شاعر سید محمد جعفری طنز اور مبالغے کے انداز میں کہتے ہیں کہ یہ دنیا کا سب سے پہلا اور پرانا کوٹ ہے۔ اگرچہ گھس گھس کر ایسا کمزور ہو گیا ہے مگر یہ عزت اور اہمیت کا حق دار ضرور ہے۔ اے لوگو! تم اس کی قدر نہیں کر سکتے کیوں کہ تمہاری ظاہری آنکھیں اس کو دیکھ رہی ہیں۔ بظاہر تو یہ پرانا اور کم قیمت ہے لیکن جو اہلِ نظر ہیں اصل اس کی اہمیت اور قدر تو وہی جان سکتے ہیں۔

شعر نمبر ۱۲

دَہانِ زخم کے مانند، ہنس رہے ہیں کاج — وصول کرتے ہیں چینی کی اَنکھڑیوں سے خِراج

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ شعر نظم "پرانا کوٹ" سے لیا گیا ہے۔ یہ مزاحیہ نظم سید محمد جعفری کی ہے۔ جن کا شمار اردو کے ممتاز مزاحیہ شاعروں میں ہوتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس شعر میں شاعر سید محمد جعفری پرانے کوٹ کے بٹنوں کو چینی لوگوں کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس پرانے کوٹ کے مسلسل استعمال سے اس کے جو کاج ہیں وہ بڑے بڑے ہو گئے ہیں۔ ان بڑے بڑے کاجوں میں چھوٹے چھوٹے بٹن چینی لوگوں کی آنکھوں کی طرح لگ رہے ہیں۔ دوسری تشبیہ اس شعر میں یہ ہے کہ جس طرح انسان ہنستا تو اس کے دانت ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اسی

JOIN FOR MORE!!!

طرح کاج کی سلائی بھی دانتوں کی طرح لگتی ہے۔ لیکن یہ اس پرانے کوٹ کے کاج پھٹنے کی وجہ سے بڑے بڑے ہوگئے ہیں۔ جسے چینی لوگ بھی حیرت سے دیکھتے ہیں۔

شعر نمبر ۱۳

جگہ جگہ جو یہ دھبّے ہیں اور چکنائی — پہن چکا ہے کبھی اس کو کوئی حلوائی

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ شعر نظم "پرانا کوٹ" سے لیا گیا ہے۔ یہ مزاحیہ نظم سید محمد جعفری کی ہے۔ جن کا شمار اردو کے ممتاز مزاحیہ شاعروں میں ہوتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس شعر میں شاعر سید محمد جعفری کہتے ہیں کہ اس پرانے کوٹ میں جو کئی جگھوں پر چکنائی اور دھبے لگے ہوئے ہیں۔ اس میں کوٹ کا کوئی قصور نہیں ہے یہ تو بے جان چیز ہے۔ اصل قصور تو اس کو پہننے والے کا ہے جس حلوائی نے اس پرانے کوٹ کو پہنا ہے اگر وہ نہ پہنتا تو اس کوٹ میں یہ نقص اور عیب بھی نہ ہوتا ہے۔ شاعر طنزاً کہہ رہے ہیں کہ کوٹ ایسا عجیب وغریب ہے کہ اسے ہر آدمی نے پہنا ہے۔ بڑے بڑے سیاح، فاتح ایرانی اور ترک، لیکن عام آدمی بھی اس سے استفادہ کرچکا ہے۔ وہ عام آدمی حلوائی ہے۔

شعر نمبر ۱۴

گزشتہ صدیوں کی تاریخ کا وَرَق ہے یہ کوٹ — خرید و اس کو کہ عبرت کا اک سبق ہے یہ کوٹ

(الف) نظم اور شاعر کا نام:

یہ شعر نظم "پرانا کوٹ" سے لیا گیا ہے۔ یہ مزاحیہ نظم سید محمد جعفری کی ہے۔ جن کا شمار اردو کے ممتاز مزاحیہ شاعروں میں ہوتا ہے۔

(ب) تشریح:

اس شعر میں شاعر سید محمد جعفری کہتے ہیں کہ کوٹ دنیا کی صدیوں کی تاریخ بتا رہا ہے۔ اسے خرید و اور اسے استعمال کرو۔ اگر اہلِ علم دنیا کی تاریخ سمجھنا چاہتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ وہ اس پرانے کوٹ سے درسِ عبرت حاصل کریں۔ اے لوگو! اس کوٹ سے ہمیں ہماری تاریخ کے ابتدائی آثار مل سکتے ہیں۔ لہٰذا اس کوٹ کو دیکھو اور سیکھو۔ ہماری تاریخ کتنی عبرت ناک ہے۔

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS
www.studyfalcon.xyz

نظموں کے مرکزی خیال

برسات کی بہاریں

(الف)تعارف شاعر:

اسرارِ قدرت نظیر اکبر آبادی کے قلم کی تخلیق ہے۔سید ولی محمد نام اور نظیر تخلص تھا۔۱۷۴۶ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی اور معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔نظیر اکبر آبادی کو عوامی و جمہوری شاعر اور بنجارہ شاعر بھی کہا جاتا ہے۔ان کی شاعری فطرت سے قریب تر اور حقیقت کی آئینہ دار ہے۔نظیر کلام کے دوران نئے الفاظ کا کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔اس دور میں جب کہ غزل کا بول بالا تھا، نظیر اکبر آبادی نے نظم کی اہمیت کو اُجاگر کیا۔نظیر اکبر آبادی کو "مصورِ فطرت" بھی کہا جاتا ہے۔بقول ڈاکٹر سید عبد اللہ:

نظیر اکبر کی منفرد شاعری کی وجہ مطالعہ جزئیات ہے۔(ڈاکٹر سید عبد اللہ)

JOIN FOR MORE!!!

(ب) مرکزی خیال:

برسات کا موسم بڑا دلکش اور روح پرور ہوتا ہے۔زندگی پر گویا بہار آجاتی ہے۔ہر طرف چہل پہل، رونق اور دلچسپی کا سماں ہوتا ہے۔ہر شے تروتازہ معلوم ہونے لگتی ہے۔پرندوں کا چہچہانا، مسرت و خوشی سے ڈالی ڈالی کا جھومنا، پھولوں پر نکھار آنا، ہر طرف رنگوں کی بہار، خوشبو میں بسی ہوئی ٹھنڈی ہواؤں سے سبزے کا لہلہانا، یہ سب برسات کی بہاریں ہیں اور ہر ایک ان سے لطف اندوز ہوتا ہے۔امیر ہو کہ غریب، برسات کے خوشگوار ماحول سے سب پر مسرت کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔

البتہ بعض مواقع پر یہ ماحول تکلیف دہ بھی ہو جاتا ہے مثلاً جو لوگ حویلیوں میں رہتے ہیں ان کو مکانوں کی فکر لاحق ہو جاتی ہے کہ کہیں ان کا کوئی حصہ گر نہ پڑے یا برسات میں کیچڑ کی وجہ سے گرنے کا ڈر ہوتا ہے۔غریب کو اگرچہ مکان کے گرنے کا خوف نہیں ہوتا کہ وہ جھونپڑی میں رہتا ہے تو چھت ٹپکنے کا ڈر ضرور ہوتا ہے۔غرض برسات کا موسم خوشی و مسرت اور غم و الم کی ملی جلی کیفیت کا نام ہے۔

جن کے پہلو میں ہے دل، اور دل میں دم جذبات کا
پوچھئے ان خوش نصیبوں سے مزا برسات کا

M.HARIS

پرانا کوٹ

(الف)تعارف شاعر:

یہ نظم سید ضمیر جعفری کے طنز و مزاح کا دلکش نمونہ ہے۔ضمیر جعفری طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے حوالے سے شہرت رکھتے ہیں۔وہ معاشرے کی ناہمواریوں کا شوخی و ظرافت کے پیرائے میں اس طریقے سے ذکر کرتے ہیں کہ برا بھی نہیں لگتا اور اس پہلو کی خرابی سے آگاہی بھی حاصل ہو جاتی ہے۔

(ب) مرکزی خیال:

نظم پرانا کوٹ سید محمد ضمیر جعفری کا ایک مزاحیہ شاہکار ہے۔اس میں مزاح کے ساتھ ساتھ طنز کے پہلے بھی موجود ہیں۔ایک طنز تو یہ ہے کہ پسماندہ ممالک کے لوگ اتنے پسماندہ ہیں کہ موسم کی سختیوں کو جھیلنے کیلئے پرانے کپڑے بھی خوشی خوشی لے لیتے ہیں۔دوسرا یہ طنز بھی

ہے کہ ہمارے معاشرے کے بعض لوگ اپنی ثقافت اور تہذیب و تمدن کو بھول کر مغرب سے اس قدر متأثر ہیں کہ ان کے ناقابل استعمال کپڑے پہننا بھی اپنے لئے باعث صد افتخار سمجھتے ہیں۔ ایک مثبت پہلو بھی ہے کہ پرانے کوٹ کی ہنسی ہنسی میں خوب تعریف کی گئی ہے کہ اگر کوئی کم تر حیثیت کا حامل ہو تو وہ احساس کمتری کا شکار نہ ہو۔

روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے

(ج) تعارف شاعر:

یہ نظم شاعر مشرق علامہ اقبال کا شاہکار ہے۔ علامہ اقبال کو آفاقی شاعر کہا جاتا ہے۔ علامہ نے دوسرے شعراء کی طرح زلف و رخ کی بات کرنے کے بجائے ناصحانہ انداز اختیار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ علامہ کی شاعری میں **"رومانی جمود"** نہیں بلکہ **"روحانی سربلندی"** پائی جاتی ہے۔ اقبال نے انسان کو اس کی عظمت کا احساس دلایا اور اسے شعور بخش کر اسرار و رموزِ زندگی سے آشنا کیا۔

(الف) مرکزی خیال:

شاعر مشرق علامہ اقبال اس نظم میں حضرت آدم علیہ السلام کے جنت سے دنیا پر اتارے جانے کے احوال بیان کر رہے ہیں۔ اقبال کی خیال میں زمین ایک جاندار کی صورت میں سب سے پہلے انسان سے مخاطب ہے لیکن یہ دراصل علامہ کے جذبات کا اظہار ہے اور نوجوانوں کے نام پیغام ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ فرشتوں نے آدم کو نیک تمناؤں کے ساتھ رخصت کیا اور زمین خود پر اتارے گئے پہلے انسان کو تسلی دے رہی ہے۔ جناب اقبال انسان کو دعوت دیتے ہیں کہ جنت سے نکالے جانے کے غم کو لے کر بیٹھنے سے کہیں زیادہ اچھا یہ ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو پہچانے اور اپنی محنت و کاوش سے اس دنیا کو ہی جنت میں بدل دے۔ پوری نظم کا نچوڑ اس ایک مصرعے میں مقید ہے:

اے پیکرِ گِل! کوششِ پیہم کی جزاء دیکھ

سورۂ رحمٰن

(الف) تعارف شاعر:

مندرجہ بالا نظم شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کا حسین تخیل ہے۔ جوش ملیح آباد کے رہنے والے تھے۔ اصل نام شبیر حسن خان تھا اور جوشؔ تخلص۔ جوش جدید دور کے ایک عظیم شاعر ہیں۔ نام کی طرح ان کے کلام میں بھی جوش اور بانکپن پایا جاتا ہے۔ ساتھ ساتھ سادہ غزلیں اور غنائیت بھری نظمیں بھی ان کے کلام کا حصہ ہیں۔ یہ نظم بھی ایسا ہی ایک تخیل ہے۔ حسین تخیلات اور متنوع موضوعات کی بنا پر انھیں **"شاعر انقلاب، شاعر شباب اور شاعر اعظم"** کے القابات سے یاد کیا جاتا ہے۔ جوش کی آپ بیتی "یادوں کی بارات" بھی قابل ذکر ہے۔

(ب) مرکزی خیال:

جوش ملیح آبادی کی یہ نظم درحقیقت "سورۂ رحمٰن" کی عکاس ہے۔ نظم کے عنوان سے ظاہر ہے کہ انھوں نے یہ نظم سورۂ رحمٰن سے متأثر ہو کر لکھی ہے۔ جس طرح سورۂ رحمٰن میں اللہ تبارک و تعالی نے جن و انس کو مخاطب کر کے اپنی نعمتوں کو تذکرہ کیا ہے، جوشؔ نے بھی اس نظم میں "کب تک" اور "کون کون سی" کے الفاظ سے پروردگار کی دنیوی و اخروی نعمتوں کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے اور انسان کو کفرانِ نعمت پر ملامت کیا ہے اور انسان کو یہ سبق سکھلایا ہے کہ وہ کچھ بھی کر لے اللہ تعالی کی لامحدود نعمتوں کا حق ادا نہیں کر سکتا لہٰذا اسے چاہیے کہ اللہ کی نعمتوں پر اس کا شکر بجالایا جائے۔ نظم کے ہر بند کے بعد ٹیپ کا مصرع مرکزی خیال کی خوب خوب وضاحت کرتا ہے۔

کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS www.studyxyz

آمدِ صبح

(الف)تعارف شاعر:

میر ببر انیس اردو کے مشہور مرثیہ نگار شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے کمال سے مرثیہ کے فن کو کمالِ عروج عطا کیا ہے۔ ان کا کلام فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ جذبات و واقعات کی منظر کشی ان کا امتیازی نشان ہے۔ ان کی پانچ پشتیں مرثیہ نگاری میں مصروفِ عمل رہیں۔ میر انیس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ الفاظ ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں۔

(ب) مرکزی خیال:

نظم آمدِ صبح میر انیس کے مرثیے کا ابتدائیہ ہے۔ میر انیس اس نظم میں ۱۰ محرم الحرام ۶۱ھ کی اس تاریخی صبح کا حال بیان کر رہے ہیں کہ جس میں نواسۂ رسولؐ اپنے اعزاء و اقرباء کے ہمراہ میدانِ کربلا میں موجود ہیں اور جو صبح عصر تک دنیا کے عظیم المیے میں بدلنے والی ہے۔ نظم کے پس منظر میں ایک یہ خیال پیش کیا گیا ہے کہ صبح روشنی اور ایمان کی علامت ہے جبکہ رات کفر اور اندھیرے کی۔ رات کیسی بھی سیاہ اور طویل ہو صبح کی روشنی اس پر غالب آجاتی ہے، بالکل اسی طرح کفر کتنی ہی طاقت اور قوت رکھتا ہو اس کا انجام فنا اور ذلت ہی ہوتا ہے۔ میدانِ کربلا اس بہت حسین اور واضح مثال ہے۔

ع: اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

JOIN FOR MORE!!!

تعلیمات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

(الف)تعارف شاعر:

یہ نظم خواجہ الطاف حسین حالیؔ کے دردمندانہ جذبات کا اظہار ہے۔ مولانا حالی سرسید احمد خان کے راست تھے اور سرسید تحریک کا مقصد زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب برپا کرنا تھا۔ چنانچہ شعر و ادب کے حوالے سے یہ کام حالیؔ کے حصے میں آئی۔ حالی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے شعر میں فضول گوئی سے بچتے ہوئے سادہ اور پر اثر زبان میں وہ کام کیا جو ایک ناصح اپنی نصیحت سے اور سپاہی تلوار سے کرتا ہے۔

M.HARIS www.studypak.xyz

(ب) مرکزی خیال:

یہ نظم حالیؔ کی شہرہ آفاق کتاب "مسدس مدوجزرِ اسلام" کا وہ حصہ ہے جس میں حالی نے رسول محترم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ تعلیمات کو بیان کیا ہے۔ وہ تعلیمات جن سے دنیا میں عظیم انقلاب برپا ہوا۔ جن سے عرب کے بدو، اونٹوں کے چرواہے تمام عالم کیلئے رہبر و رہنما بن کر سامنے آئے۔ جیسا کہ اکبر الہ آبادی نے کہا:

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا

ان تعلیمات کا اندازہ نظم کے آخری بند سے ہوتا ہے کہ اگر معاشرہ ان تعلیمات کے مطابق ہو تو ایسے معاشرے میں جینا مرنے سے بہتر ہے، لیکن اگر معاشرے میں یہ پاکیزہ تعلیمات نہ ہوں تو وہاں جینے کے بجائے مرنا اچھا ہے۔

☆......☆......☆

اسباق کا خلاصہ

JOIN FOR MORE!!!
M.H
www.studypak.xyz

سوال نمبر ۵ :طریقۂ جواب

موزوں طریقہ: خلاصے کا مواد اصل مواد کا تقریباً ایک تہائی ہونا چاہیے۔ اس میں وہ تمام نکات بیان کیے جائیں جن پر کہانی تعمیر ہوئی ہے۔

☆ عنوانات قائم نہیں کرنے چاہئیں۔

☆ اشعار کا استعمال بالکل نہیں ہونا چاہیے، کیوں کہ اشعار لکھنا خلاصے کی روح کے خلاف ہے۔

مصنف کا تعارف: اس عنوان کے تحت مصنف کی ادبی حیثیت، خصوصیاتِ نثر اور چند تصانیف کا ذکر ضرور ہو۔

مثال:

سبق: ماما عظمت مصنف: ڈپٹی نذیر احمد

مختصر تعارف: ادبی حیثیت: ڈپٹی نذیر احمد اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔ وہ اردو کے اوّلین ناول نگار ہیں۔ مترجم ہیں،، انشاء پرداز ہیں۔

خلاصے میں مواد اِتنا ہو جس میں اُن تمام اہم نِکات کو بیان کیا جائے جن پر قصّے کی عمارت تعمیر ہوئی ہے۔

JOIN FOR MORE!!!

جوابی خاکہ

(الف) تعارفِ مصنف:

(ب) خلاصہ:

M.HARIS www.studypak.xyz

اسباق کا خلاصہ

ٹھیلے والا شہزادہ

(الف)تعارفِ مصنف:

آپ کا نام علی حسن ہے اور خواجہ نظام الدین اولیاء کے خاندان سے ہونے کی بناء پر نظامی کہلائے اور "خواجہ حسن نظامی" کے نام سے شہرت پائی۔ تعلیم معمولی تھی۔ ابتداء میں اخباروں میں مضامین لکھے، پھر لغت گوئی اور پند و نصائح تحریر کر کے چوٹی کے ادیب بن گئے۔ آپ کا طرزِ تحریر اپنی جگہ ایک منفرد چیز ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی روانی سے عام بول چال کی زبان میں بڑی باتیں کہ جاتے ہیں۔ آپ کی مشہور کتابیں غدرِ دہلی کے افسانے اور بیگمات کے آنسو ہیں۔ آپ کی ادبی عظمت کے لیے یہ ہی کافی ہے کہ علامہ اقبال نے آپ کے بارے میں فرمایا کہ "اگر مجھے حسن نظامی جیسی نثر لکھنی آجائے تو میں شاعری کرنا چھوڑ دوں۔"

(ب) خلاصہ:

یہ واقعہ ۱۱ مئی ۱۹۱۷ء کا ہے۔ انتہائی گرم اور چلچلاتی دھوپ میں بوڑھا ٹھیلے والا شہزادہ ایک اینٹوں کے بھٹے سے اینٹیں اٹھا کر رائے سینا (نئی دہلی) لے جا رہا تھا۔ سر پر سورج کی تیز کرنیں اور مونچھوں پر راستے کا گرد و غبار اور پیشانی پر قطرات۔ اسکے پیچھے ایک موٹر غالباً قطب صاحب سے آرہی تھی۔ موٹر بان نے راستہ لینے کیلئے کئی دفعہ ہارن بجایا لیکن بوڑھے کو سنائی نہ دیا اور موٹر ٹھیلے سے ٹکرا گئی مگر ڈرائیور ہوشیار تھا موٹر کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ اس موٹر میں ایک سوداگر اور ایک عورت بیٹھے تھے۔ مرد نشے میں دھت تھا۔ غیظ کے عالم میں گاڑی سے اترا اور بے چارے ٹھیلے والے کو مارنے لگا۔ ٹھیلے والا اکیلا، ضعیف اور ناتواں تھا اور سب سے بڑھ کر مفلس اور نادار۔ اول تو وہ کچھ سمجھا ہی نہیں اور دو چار کوڑے کھا لئے مگر خبر نہیں دل میں کیا ہمت رکھتا تھا کہ اس نے اچانک بیل ہانکنے کا چابک لے کر جوابی حملہ کر دیا اور شرابی مرد کا سر پھاڑ دیا۔ موٹر بان نے سوداگر کی مدد کرنا چاہی مگر بوڑھے کے ایک ہی وار سے اس کا چہرہ بھی لہولہان ہو گیا۔ یہ دیکھ کر موٹر میں سوار عورت نے رونا شروع کر دیا اور دونوں مرد موٹر میں بیٹھ کر گالیاں دیتے ہوئے بھاگ نکلے۔ بوڑھا خاموش کھڑا مسکراتا رہا اور کہتا رہا بس ایک ہی وار میں بھاگ نکلے! تیموری طمانچہ کھانا کچھ آسان نہیں۔

دوسرے دن رائے سینا کے تھانے میں دو زخمی ٹھیلے والے جمع تھے جو بوڑھے ٹھیلے والے کے ساتھی تھی۔ داروغہ نے پوچھا کیا تم نے ان کو زخمی کیا ہے؟ ساتھیوں نے کہا کہ یہ سننے سے قاصر ہے تب ایک سپاہی نے زور سے وہی سوال کیا، بوڑھے نے جواب دیا: "ہاں! "میں نے مارا ہے مگر انھوں نے چار کوڑے مجھے بے وجہ مارے پھر میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا کیونکہ یہ امیر لوگ ہم غریبوں کو گھاس پھوس سمجھتے ہیں جبکہ آج سے ساٹھ برس پہلے ان کے باپ بلکہ سارا ہندوستان میرا محکوم تھا۔ داروغہ یہ سن کر مسکرایا اور سمجھا شاید یہ بوڑھا پاگل ہو گیا ہے اسلئے اسے حوالات میں بند کر دیا۔ دوسرے دن سٹی مجسٹریٹ کے سامنے بوڑھا ٹھیلے والا پولیس کی حراست میں حاضر تھا اور دونوں زخمی بھی موجود تھے۔ بوڑھے ٹھیلے والے نے بیان میں کہا: "میرا نام ظفر سلطان ہے اور میں مرزا بابر کا بیٹا ہوں جو ہندوستان کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے بھائی تھے۔ غدر کے بعد دربدر کی ٹھوکریں کھانے کی بعد پھرتا پھرتا دہلی آگیا اور ٹھیلا چلانے لگا جس روز یہ واقعہ پیش آیا میں اپنے ٹھیلے پر اینٹیں لیکر رائے سینا جا رہا تھا۔ میں نے پیچھے سے آنے والی موٹر کی آواز نہیں سنی کیونکہ میں بہرا ہوں موٹر والوں نے میری حالت پر رحم نہ کھایا اور مجھے کوڑے مارنا شروع کر دیے۔ میرے بدن میں جو خون ہے اسے اب ظلم سہنے اور مار کھانے کی عادت ہو گئی ہے مگر پہلے نہ تھی۔ غدر سے پہلے جس

جگہ آپ کرسی پر بیٹھے ہیں یہ میری جگہ تھی اور شریروں اور سرکشوں کو میں اسی مقام پر سزا دیتا تھا۔ میرے دل و دماغ نے ان باتوں کو ابھی تک فراموش نہیں کیا پھر میں چار کوڑے کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ میں نے بے شک اپنا بدلہ پورا کر لیا میں آپ کے انصاف کے سامنے اپنا سر جھکانے کو تیار ہوں۔" بوڑھے کی بات سن کر عدالت میں سناٹا چھا گیا اور ہر شخص آبدیدہ ہو گیا۔

عدالت نے بوڑھے ٹھیلے والے کو باعزت طور پر بری کر دیا اور ان دونوں مدعیوں پر دس دس روپے جرمانہ کر دیا۔ پھر مجسٹریٹ نے دریافت کیا تمہیں سرکار کی طرف سے پنشن نہیں ملتی جو تم یہ ذلیل کام کرتے ہو؟ اس پر بوڑھے نے جواب دیا میں اس میں کوئی ذلت اور شرم محسوس نہیں کرتا کیونکہ میں محنت کی روزی کماتا ہوں اور بیلوں پر حکومت کرتا ہوں اور خود بیل بن کر غلامی نہیں کرنا چاہتا۔

ٹھیلے والا شہزادہ دہلی میں پہاڑ گنج کی مسجد میں نماز سے فارغ ہوا تو اس دن عدالت میں موجود ایک شخص نے اس کے تمام حالات جاننے کی خواہش ظاہر کی۔ بوڑھے نے بتایا کہ وہ مرزا بابر کا بیٹا ہے۔ غدر سے پہلے اگرچہ بادشاہ کی حکومت برائے نام تھی مگر عزت اور احترام میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ غدر برپا ہوا تو باغیوں نے بلا امتیاز بہت ظلم کئے، لیکن جب انگریز پنجاب کی مدد سے دوبارہ دہلی پر قابض ہوئے تو بادشاہ سمیت سارا شہر بھاگ نکلا۔ میری والدہ نابینا تھیں ان کو ایک رَتھ میں سوار کرا کے اپنے ایک دوست کی طرف جو زمیندار تھے اور کرنال میں رہتے تھے، روانہ ہوا۔ رات کو ایک گاؤں میں قیام کیا وہاں رات کو چور بیل کھول کر لے گئے۔ صبح کو میں فکر مند ہوا پھر گاؤں سے ایک گاڑی مانگی مگر گاؤں کے زمیندار نے بہانہ کر دیا کیونکہ وہ اس طرح ہمیں لوٹنا چاہتے تھے اور یہی کچھ انھوں نے کیا۔ ہمارا مال و اسباب لوٹ کر ہمیں جنگل میں پھنکوا دیا۔ ایک تو سفر کی تھکن، اوپر سے ہم نے ایک صبح سے کچھ کھایا بھی نہ تھا، اس کی بھوک الگ۔ غرض ایسا وقت تھا کہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھلائے۔

پھر ایک گنوار وہاں سے گزرا اس نے روپے پیسے کے لالچ میں والدہ کے سر پر ایک لٹھ مارا جس سے وہ شدید زخمی ہو گئیں اور اسی حالت میں دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ میں نے انھیں وہیں ریت میں دفن کیا اور خود بہ مشکل ایک درخت کے نیچے جا کر لیٹ گیا۔ کچھ دیر میں ایک فوجی سوار وہاں سے گزرا میں نے اپنی ساری بپتا سنائی وہ سپاہی بڑا رحم دل اور مسلمان تھا۔ اس نے میرا علاج کروایا جس سے میں اچھا ہو گیا اور اس کی خدمت کرنے لگا۔ پھر بمبئی آگیا اور خیراتی قافلے میں شامل ہو کر مکہ معظمہ چلا گیا۔ وہاں دس برس گزار کر مدینہ حاضری دی اور پانچ برس وہاں گزارے۔ اس کے بعد شام اور بغداد ہوتا ہوا ایک میمن بھائی سے ساتھ کراچی آگیا۔ پھر دہلی کی یاد ستانے لگی اور یہاں آگیا اور ریل میں مزدوری شروع کی۔ کچھ پیسے بچائے اور ساجھے میں یہ ٹھیلا خریدا، پھر آہستہ آہستہ ساجھی کا حصہ ادا کر کے اپنا ذاتی ٹھیلا بنالیا اور اب اسی پر میری گزر اوقات ہے۔ سائل نے بہرے پن کے متعلق پوچھا تو ٹھیلے والے شہزادہ نے بتایا کہ گاؤں والوں نے مارا تو اسی دماغی چوٹ کی وجہ سی قوتِ سماعت سے محروم ہو گیا اب صرف بائیں کان سے کچھ سن سکتا ہوں دایاں بالکل بیکار ہے۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ اب دنیا بھر کے عیب سننے سے کان قاصر ہیں۔

سائل نے ٹھیلے والے شہزادے کی عبرتناک داستان سن کر اپنی کتاب میں لکھنے کی اجازت چاہی تو شہزادے نے اجازت دیتے ہوئے کہا کہ یہ ضرور لکھ دو مگر یہ بھی لکھ دینا کہ:

" ہر گزرنے والی بات، گزرنے والا وقت اور گزرنے والی راحت تکلیف دہ اور جھوٹی ہے مگر اس میں عبرت ضرور ہے۔"

JOIN FOR MORE!!!

بائیسکل کی تعلیم

(الف) تعارفِ مصنف:

شوکت تھانوی کا اصل نام محمد عمر تھا۔ ۱۹۰۷ء میں بھارت میں پیدا ہوئے اپنے ذاتی شوق سے علم میں اضافہ کرتے رہے۔ صحافت سے دلچسپی کی بنا پر مشہور اخبار ہمدم، ہمت اور سرپنچ سے وابستہ رہے اور سرپنچ نے ہی شوکت تھانوی کو مزاح نگاری کی راہ پر ڈالا۔ ان کے مضامین سودیشی ریل اور سودیشی ڈاک آج بھی بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ ان کے مزاح میں بے تکلفی اور بے ساختگی ہے وہ لفظوں اور محاوروں کی موزونیت سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ وہ فطرتاً ظریف ہیں ان کے یہاں طنز کم اور مزاح زیادہ ہے وہ نہیں چاہتے کہ قاری غیر ضروری طور پر طنز کا

شکار رہے۔ وہ ایک باغ و بہار شخصیت تھے یہی وجہ ہے کہ وہ بات سے بات پیدا کرنے کے فن سے آگاہ ہیں اور اپنی معلومات اور مشاہدات سے اپنی تحریروں میں نیرنگی پیدا کرتے ہیں۔ ان کی زبان شگفتہ اور سادہ ہوتی ہے ان کی تحریر کی اسی سادگی نے انھیں مقبول عام و خاص بنایا ہے۔ نصاب میں شامل مضمون "بائیسکل کی تعلیم" ان کا نمائندہ مضمون ہے جس میں شوق، عشق کی حد تک چلا جاتا ہے۔

(ب) خلاصہ:

اس مضمون میں نوعمری کی ایک عام سی خواہش اور اس کی تکمیل کیلئے پیش آنے والے واقعات اور مشکلات کو مصنف نے بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ مضمون نگار کو سائیکل چلانے کا شوق جنون کی حد تک تھا تاکہ اس پر سوار ہو کر وہ سیر و تفریح سے لطف اندوز ہو سکے۔ کم عمری کے باعث شرط رکھی گئی کہ وہ پہلے سائیکل چلانا سیکھ لے تو پھر نئی سائیکل خرید کر دی جاسکتی ہے اس کا یہ اصرار تھا کہ سائیکل ہو تو سیکھا جائے۔ یہ گفت و شنید جاری تھی کہ حسنِ اتفاق سے ایک دن ایک بزرگ سائیکل پر سوار ہو کر گھر پر ملاقات کیلئے تشریف لائے ایسا موقع تو کبھی کبھی ملتا ہے وہ ملاقات میں مصروف رہے اور مصنف نے سائیکل اٹھائی اور سڑک پر آگئے اب تو سائیکل چلانا ہی تھا جو اس پر چڑھنے کی کوشش کی تو حادثات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔

پہلی بار مصنف سائیکل کے فریم میں الجھ کر گر پڑا پھر کوشش کی تو پھر گر پڑے۔ پھر سوار ہو کر کچھ دور چلے تو مگر توازن برقرار نہ رہا اور سائیکل ایک گدھے سے جا ٹکرائی، پھر اٹھا ہاتھ پاؤں جھاڑے اور درخت کے سہارے گدی پر بیٹھے، کچھ دور چلے تو پل سے جا ٹکرائی اور خود نالے میں گرتے گرتے بچے۔ مگر شوق تو عشق کی حد تک فرواں تھا، باز نہ آیا، ذرا سنبھل کر آگے بڑھا تو سڑک پر گزرنے والی ایک بوڑھی دھوبن سے جا ٹکرایا وہ گالیاں دیتی رہی اور یہ ان کی منت سماجت کرتے رہے بڑی مشکل سے جان چھوٹی۔ اب سوار نہ ہونے کا خیال آیا ہی تھا کہ ہمت کو شاوری مبارک۔ یہ پھر اٹھے اور سائیکل پر جا بیٹھے اتفاقاً ایک بزرگ تسبیح پڑھتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ اب کی دفعہ سائیکل ان سے جا ٹکرائی وہ گرے اور یہ ان کے اوپر تھے وہ بزرگ اپنی سادہ لوحی سے سمجھے کہ شاید یہ موت کا فرشتہ ہے اور اس نے آن دبوچا ہے۔ یہ فوراً اٹھے اور ان سے معذرت کرنے لگے وہ بے چارے خاموش رہے اور صرف گھورتے رہے۔ اب جو مصنف نے سائیکل کا جائزہ لیا تو یہ انکشاف ہوا کہ سائیکل کا ہینڈل گھوم کر دوسری جانب چلا گیا ہے اور اس کا زاویہ تبدیل ہو گیا ہے اب اس کو سیدھا کس طرح کیا جائے مصنف اس فن سے ناواقف تھے یعنی ہینڈل سیدھا کرنا مشکل تھا، لہذا بائیسکل کی یہ تعلیم نامکمل چھوڑ کر مڑی ہوئی سائیکل لیکر گھر پہنچے اب جو گھر والوں نے ان کے ساتھ سلوک کیا وہ ناقابلِ بیان ہے۔

(ب)مصنف کا نام:

سبق بائیسکل کی تعلیم مزاح نگار شوکت تھانوی کی تصنیف ہے جو ان کی کتاب "بحر تبسم" سے ماخوذ ہے۔

میبل اور میں

(الف)تعارف مصنف:

پطرس بخاری کا اصل نام احمد شاہ پطرس ہے۔ پطرس ان مزاح نگاروں میں سے ہیں جن کی تحریریں حجم میں کم ہونے کے باوجود وزن میں بہت زیادہ ہےں جن پر ادب کا شعبۂ مزاح فخر کر سکتا ہے۔ ان کے مضامین اردو کے مزاحیہ ادب میں ایک نئے باب کا درجہ رکھتے ہیں۔ وہ زندگی کے نہایت معمولی اور روزمرہ معاملات میں میں مزاح کے انوکھے پہلو نکالتے ہیں۔ زبان ان کے مزاح میں شہ رگ کا درجہ رکھتی ہے۔

(ب) خلاصہ:

میبل اور پطرس دونوں کیمبرج یونیورسٹی میں ایک ہی مضمون (انگریزی ادبیات) کے طالب علم تھے۔ دونوں کو مطالعے کا شوق تھا ان کے مشاغل اور دلچسپیاں بھی تقریباً ایک ہی تھیں۔ دونوں کا مطالعہ وسیع تھا۔ اس سلسلے میں دونوں کتب کا باہمی تبادلہ کرتے رہتے تھے۔ پطرس

کے مطابق جدید نظریۂ مساوات اور فرد کی آزادی کے تصور کے خیال نے دونوں سے قولاً مرد اور عورت کی برابری اور ہر لحاظ سے مساوی حیثیت کو تسلیم کرا لیا تھا۔ لیکن فطرت کے اصول نے دونوں کے اندرونی جذبات کو بیرونی اثرات سے آزاد رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں ایک دوسرے کے برتر ہونے کے احساس میں مبتلا تھے اور
دونوں پر یہ مثل صادق آتی تھی:

ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور کھانے کے اور!

اپنی برتری کے احساس نے میبل کو آمادہ کیا کہ کم تر معلومات رکھنے کے باوجود وہ خود کو علم کی ذخیرہ اندوز اور لٹریچر کی مکھی ثابت کرے خواہ اس کے لئے اسے غیر اخلاقی اصول بھی اختیار کرنا پڑیں۔ دوسری جانب پطرس نے اپنے دل میں میبل کو شکست دینے کی ٹھان لی۔ پطرس نے اپنے مطالعے پر اپنا تمام وقت صرف کیا لیکن اسکے باوجود اسکی رفتارِ مطالعہ میبل سے میل نہ کھا سکی۔ میبل معمول کے مطابق زیرِ مطالعہ کتب اور مضامین پر بحث و مباحثہ اور دورکنی تنقیدی نشست میں برجستہ، بے باک اور استادانہ شان سے تبصرہ اور تنقید کرتی رہی۔ وہ ہر روز نئی کتابیں لاتی اور پطرس کو تنقید و گفتگو کی دعوت دیتی اور موقع پر ذہناً اپنی برتری منوا کر چلی جاتی۔

ان حالات سے دلبرداشتہ ہو کر بالآخر مردانہ برتری اور وقار کے احساس نے پطرس کو آمادہ کر لیا کہ میبل کی رفتارِ مطالعہ کا ساتھ دیا جائے۔ اس لئے کہ وہ صرف مرد ہی نہیں تھا بلکہ ایشیائی مرد تھا اور اسے یقین تھا کہ مرد ہی برتر ہے۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ کچھ بھی ہو مرد کی برتری کو برقرار رکھا جائے گا۔ اس نے اپنی خفت مٹانے اور مردوں کی لاج رکھنے کے لئے کتابوں پر بغیر مطالعے کے تنقید شروع کر دی اور اس فنکارانہ انداز میں تنقید کی کہ میبل کے فرشتے بھی نہ سمجھ سکے کہ پطرس جزوی مطالعے کی بعد بھرپور تبصرہ و تنقید کرتا ہے۔

لیکن ضمیر کی ہر دھڑکن اس کے فعل پر ملامت کرتی رہی اور دل و دماغ میں کشمکش جاری رہی ایک دن اچانک پطرس انفلوئنزا میں مبتلا ہوا علالت نے اسکے احساسِ ندامت کو بیدار کیا اور دوسرے گناہوں کی طرح یہ گناہ بھی اسے بے چین کرنے لگا۔ آخر کار پشیمانی نے پطرس کو مجبور کر دیا کہ وہ اعترافِ گناہ کرتے ہوئے اپنی اس حرکت پر میبل سے معذرت کر لے۔ چنانچہ اس نے اپنی اس ناپسندیدہ حرکت پر میبل سے معذرت کر لی اور اس پر واضح کر دیا کہ وہ کتب کا مطالعہ کیے بغیر تبصرہ کرتا رہا تھا۔ ساتھ ہی اس بات کا بھی عزم کر لیا کہ اب وہ تمام کتابیں پوری دلجمعی سے پڑھے گا اور تنقید و مطالعے کا حق ادا کرے گا۔

چنانچہ جب پطرس نے کتابوں کو مطالعے کیلئے کھولا تو یہ دیکھ کر اس کی عقل کے طوطے اڑ گئے کہ کتابوں کے اکثر اوراق کٹے ہوئے نہ تھے۔ جس پر پطرس یہ سمجھ گیا کہ میبل نے بھی میری طرح کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تاکہ جدید مغربی نظریہ مساوات درست ہے اور یہ حقیقت ہے کہ:

"مرد و عورت کسی معاملے میں مساوی ہوں یا نہ ہوں ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے اور فریب دینے میں یقیناً برابر ہیں۔"

JOIN FOR MORE!!!

ماما عظمت

(ب) تعارف مصنف:

ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کو اردو کا پہلا ناول نگار کہا جاتا ہے۔ آپ نے 1868ء میں اردو زبان کا اولین ناول "مراۃ العروس" لکھ کر اردو ادب میں ناول نگاری کی ابتداء کی۔ ڈپٹی نذیر احمد دہلوی اپنے مضامین سے معاشرے کی اصلاح کا کام لیتے ہیں۔ انھوں نے اہم معاشرتی مسائل کو دلچسپ فرضی قصوں کے ذریعے اِس طرح پیش کیا ہے جیسے کڑوی دوائی کو حلق سے اُتارنے کے لئے اِس پر شکر لپیٹ کی جاتی ہے۔ خصوصاً عورتوں کی نفسیات قلمبند کرنے کا خاص ملکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈپٹی نذیر احمد کی طبیعت میں ودیعت رکھا گیا۔ مراۃ العروس، ابن الوقت، توبۃ النصوح آپ کے مشہور ناول ہیں۔

(الف) خلاصہ:

یہ کہانی ایک شریف گھرانے سے متعلق ہے جس کے سربراہ مولوی محمد فاضل ہیں۔ وہ گھر سے دور کہیں ملازمت کرتے ہیں جو گھر کے خرچ کے لئے رقم بھجواتے رہتے ہیں۔ یہ رقم سامانِ خورد و نوش کے لئے گھر کی پُرانی ملازمہ ماما عظمت کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے۔ اِس اندھے اعتماد کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے یہ خادمہ جس کشتی میں سوار ہے اُسی میں سوراخ کر دیتی ہے۔ وہ اِس گھر کو آس پاس کے دوکانداروں کا مقروض کر دیتی ہے۔ وہ اِس طرح کہ مولوی صاحب کے نام پر آس پاس کے گھرانوں کا سودا اُدھار لیتی ہے اور ادائیگی کی رقم خود رکھ لیتی ہے۔ اِن گھروں میں اُس کی بیٹی کا گھر بھی شامل ہے۔

مولوی محمد فاضل کے بیٹے محمد کامل کی شادی ہو جاتی ہے اور گھر میں ایک نئے فرد یعنی محمد کامل کی بیوی اصغری کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ لڑکی نہایت سنجیدہ، عام فہم اور تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوتی ہے۔ اُس کی سلیقہ شعاری کی بدولت گھر والے اُسے "تمیز دار بہو" کے خطاب سے نوازتے ہیں۔ گھر کے معاملات میں دلچسپی کے باعث بہت جلد ہی اصغری کو ماما عظمت کی نمک حرامیوں کا پتا چل جاتا ہے۔ اب وہ مناسب موقع کے انتظار میں رہتی ہے کہ کب اُسے موقع ملے اور اِس مسئلے کا حل کیا جائے۔ بہت جلد ہی یہ موقع بھی اُس کے ہاتھ آ جاتا ہے جب مولوی محمد فاضل ماہِ رمضان میں چھٹیاں گزارنے گھر تشریف لاتے ہیں۔ اِن چھٹیوں میں وہ کچھ رقم اپنے ساتھ لاتے ہیں تاکہ قرضوں کا بوجھ ہلکا ہو سکے۔ پہلے تو وہ ماما عظمت کی معرفت سے قرضہ اُتارنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن اصغری سے بات چیت کے دوران وہ اُس کی یہ تجویز تسلیم کر لیتے ہیں کہ قرض داروں کو گھر پر بُلا کر اُن کے واجبات ادا کئے جائیں۔ دوسرے روز ہی تمام دوکان داروں کو گھر بلا لیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے حلوائی سامنے آتا ہے اور اپنا ۳۰ رُوپے کا حساب پیش کرتا ہے۔ گھر والوں سے بحث و تکرار کے بعد یہ قرض صرف ٦ سے ٧ رُوپے ثابت ہوتا ہے۔ چار سیر بالوشاہی میلاد کی مد میں لکھی پائی جاتی ہے جب کہ اِس قسم کی کوئی تقریب گھر میں عرصہ دراز سے گھر میں منعقد نہیں ہوئی تھی۔ اِسی طرح سبزی فروش، قصائی اور بنیے کے حساب میں بھی خُرد برد کا پتا چلتا ہے۔ بزاز اور ہزاری مل کا حساب اگلے روز پر رکھ دیا جاتا ہے۔

رات کو کھانے سے فارغ ہو کر ماما عظمت جب گھر سے باہر نکلتی ہے تو مولوی محمد فاضل اُس کے پیچھے اپنا ایک مخبر متعین کر دیتے ہیں۔ ماما پہلے اپنی بیٹی کے گھر جاتی ہے اور وہاں سے چوڑیاں اور دیگر زیورات لے کر بزاز اور ہزاری مل سے رجوع کرتی ہے۔ وہ اُن سے التجا کرتی ہے کہ یہ رقم رکھ لو لیکن کل مولوی صاحب کے سامنے کچھ مت بولنا۔ اِس کاروائی کی خبر وہ مخبر اصغری کو دے دیتا ہے۔ دوسرے روز یہ دونوں قرض دار جب مولوی صاحب کی خدمت میں پیش ہوتے ہیں تو ماما عظمت کی دی ہوئی لالچ یہ کہتے ہوئے اُس کے منہ پر مار دیتے ہیں کہ مالیت تو ہمارے واجبات سے کئی کم ہے۔ وہ ملازمہ کی فریب کاریوں کے بارے میں بھی مولوی صاحب کو آگاہ کر دیتے ہیں۔ اپنا پول کھلتا دیکھ کر ماما عظمت گھبرا جاتی ہے اور اقبالِ جرم کر لیتی ہے۔ یہ اعتراف جرم مولوی صاحب کو اتنا ٹھیس پہنچاتا ہے کہ وہ طیش میں آ کر فوراً ہی اُس نمک حرام کی چھٹی کر دیتے ہیں۔

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS

آزادی کی راہ میں

(الف) تعارف مصنفہ:

خدیجہ مستور کے افسانوں کے پانچ مجموعے سامنے آئے۔ جن میں بوچھاڑ اور چندر روز اور شامل ہیں۔ 1962ء میں اپنے شہرہ آفاق ناول آنگن پر آدم جی ایوارڈ ملا۔ ان کا یہ ناول کردار نگاری، منظر نگاری اور اسلوب کے لحاظ سے منفرد ناول ہے۔ جب کہ اُن کے افسانوں کے آخری مجموعے "ٹھنڈا میٹھا پانی" پر انہیں ہجرہ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ڈاکٹر احسن فاروقی لکھتے ہیں:

"آنگن کسی ایک گھر کی کہانی نہیں بلکہ اس کینوس پر پورا برصغیر رنگ بکھیر تا نظر آتا ہے۔ خدیجہ مستور نے تحریک جدوجہد آزادی

کے پس منظر میں یہ ناول لکھا ہے اور بتانا چاہا ہے کہ آزادی کے متوالے غلامی کے خلاف نفرت رکھتے ہیں۔"

(ب) خلاصہ:

یہ کہانی ایک ایسے گھرانے کی ہے جس کے سربراہ انگریز سرکار کے ملازم ہیں، لیکن گھر کے تمام افراد ہی دل میں انگریز سے سخت نفرت رکھتے ہیں۔ اس کہانی کا مرکزی کردار ایک لڑکی عالیہ ہے، لیکن اس کردار کے پس پردہ دراصل مصنفہ خود ہیں اور یہ ان کے گھر کی کہانی ہے۔

عالیہ کے والد دو تین دن سے سخت مصروف تھے کیونکہ ان کا انگریز افسر معائنے کے لئے آنے والا تھا۔ ڈاک بنگلے میں اس کے رہنے کا انتظام کیا جارہا تھا اور اسی تیاری کے پیش نظر عالیہ کی آپا کے ہاتھوں کے کڑھے ہوئے میز پوش اور گلدان بھی ڈاک بنگلہ منتقل کر دیے گئے تھے اور اس کے لئے بہترین کھانے پکانے کی ہدایت بھی جاری کر دی گئی تھی۔ یہ سب دیکھ کر عالیہ کی والدہ ان کا مذاق اڑاتی ہیں اور کہتی ہیں:

"خوب! انگریزوں کو گالیاں دیتے ہیں اور اب وہ آرہا ہے تو مارے ڈر کے سٹی گم ہے حضرت کی! زبانی جمع خرچ کرنے میں کیسے تیز ہوتے ہیں لوگ بھی۔"

ایسی باتیں سن کر عالیہ کو اپنی ماں پر بڑا غصہ آتا اور وہ سوچتی کہ کاش وہ ایک ذرا دیر کو اماں کی اماں بن سکتی تو پھر بتاتی کہ چھیڑ خانی کرنے کا کیا فائدہ ہوتا ہے۔ بہر حال عالیہ کے والد بہت سویرے ہی اس انگریز افسر کا خیر مقدم کرنے کے لئے اسٹیشن پہنچ جاتے ہیں اور دوپہر تک واپس نہیں آتے۔ ادھر دسترخوان مختلف انواع واقسام کی خوشبوؤں سے مہک رہا ہوتا ہے کہ ایک چپراسی گھبرایا ہوا بھاگتا ہوا آتا ہے اور خبر دیتا ہے کہ عالیہ کے والد نے اسٹیشن پر ہی اس افسر کا سر پھاڑ دیا ہے کیونکہ اس نے انھیں ڈیم فول کہا تھا، اب وہ حوالات میں بند ہیں۔ اس واقعہ کی اطلاع عالیہ کے ماموں اور چچا کو دی جاتی ہے کیونکہ اس گھمبیر وقت میں اس خاندان کو سرپرست کی ضرورت تھی، لیکن ماموں تو یہ کہہ کر فرار حاصل کر لیتے ہیں کہ:

"اقدام قتل بہت بڑا جرم ہے، ایسے آدمی کی بیوی بچوں کی سرپرستی کرنے میں انھیں بھی خطرہ ہے۔"

البتہ چچا، جو کہ انگریز سے سخت نفرت کرتے ہیں وہ سب کے سر پر ہاتھ رکھتے ہیں اور انھیں اپنے گھر تک پہنچانے کا انتظام کرتے ہیں۔

جب یہ لوگ روانہ ہونے کے لئے تانگہ پر سوار ہوتے ہیں تو عالیہ کی اسکول کی نگران عیسائی خاتون انھیں یہ کہہ کر تسلی دیتی ہے کہ:

"تم لوگ کھوش رہنا، گم مت کرنا، تمہارا افادر بوت اچھا آدمی تھا، تمہارا ملک جرور آزاد ہو گا۔"

چچا کے گھر پہنچ کر عالیہ بستر پر کروٹیں لے رہی ہوتی ہے اور وہ سوچتی ہے کہ ان کے والد کا قید میں کیا حال ہو گا؟ کاش اسے نیند آجائے یا صبح ہو جائے۔

نوجوان سپہ سالار کا عزم وحوصلہ

(الف) تعارف مصنف:

عبدالحلیم شرر اردو ادب میں اسلامی تاریخی ناول نگاری کے بانی، جریدہ نگار اور ایک بڑے انشاء پرداز ہیں لیکن جس چیز نے انھیں اردو ادب میں ایک ممتاز مقام دیا ہے وہ ان کی اسلامی تاریخی ناول نگاری ہے۔ ان کے ناولوں کا مقصد اسلاف کے کارنامے یاد دلا کر آنے والی نسل میں قوتِ عمل اور ولولہ تازہ پیدا کرنا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے اخبارات اور رسائل سے وابستہ رہے جن میں سے بیشتر انھوں نے خود کاری کیے۔ منصور موہنا ان کا خوبصورت شاہکار ہے۔

(ب) خلاصہ:

اس اقتباس میں جوان کے ایک مشہور ناول منصور موہنا سے ماخوذ ہے۔ اس کا پس منظر موجودہ وہ پاکستانی علاقہ ہے جو دریائے اٹک اور

آس پاس پر مشتمل ہے اور زمانہ آج سے ایک ہزار سال قبل کا ہے جب غزنی کے فرماں رواسلطان محمود نے ہندوستان پر حملوں کا آغاز کیا تھا۔اس مضمون میں صرف ایک جھلک اس جھڑپ کی دکھائی گئی ہے جو سلطان کے ترک سپاہیوں اور ہندوستان کے راجپوت فوجیوں میں ہوئی اور جس میں آخر کار فتح مسلمان فوجیوں کی ہوئی۔ دریائے اٹک کا میدان مسافروں کے لئے سندھ جانے کا راستہ تھا مشرقی کنارے پر گرمیوں کی ایک صبح کو ترک فوجیوں کی ایک جماعت' جو چھ سو سپاہیوں پر مشتمل ہے۔جنگ میں شکست کے بعد بھاگے ہوئے راجا کے تعاقب میں ہے اس دستہ کا سپہ سالار ایک خوبصورت نوجوان ہے جو آگے آگے جارہاہے اور اپنے ساتھی سے راستے کی تصدیق کرتا ہے اور اس بات پر فخر کرتا ہے کہ ہندو راجپوت چاہے کتنے ہی دلیر 'بہادر اور جنگجو ہوں ترک سپاہیوں کے مقابلے نہیں ٹھہر سکتے اور اس رائے کا بھی اظہار کرتا ہے کہ اب اسلام کی روشنی اس کفرستان میں پھیلانے کا جو موقع ملا ہے اسے ہاتھ سے نجانے دینا چاہئے اور واپس غزنی لوٹ جانے کے بجائے پیش قدمی جاری رکھنی چاہئے۔ محمد بن قاسم کے بعد یہ دوسرا سپہ سالار تھا جو اس ملک میں وارد ہوا تھا۔

اسی دوران اس کی مڈبھیڑ راجپوت فوج سے ہوتی ہے جو تعداد پانچ سو سپاہیون پر مشتمل تھی وہ رکا اور اپنے سپاہیون سے کہنے لگا کہ اب بہادری اور مہارت کے جوہر دکھانے کا وقت آگیا ہے اس راجپوت فوج نے اچانک مسلمانوں پر حملہ کردیا اور ایک خوفاک جنگ شروع ہوگئی۔ ہندو فوج شکست کھاکر بھاگنے والی تھی کہ دو سو راجپوت سپاہی اور آپہنچے اور شریکِ جنگ ہوگئے۔اب مسلمان کچھ خوفزدہ ہوگئے مگر نوجوان سپہ سالار اپنی تقریر سے مسلمانوں کی ہمت بندھائی اور خود آگے بڑھ کر راجپوت سپاہیوں سے نبرد آزما ہوگیا اور اس بہادری سے مقابلہ کیا کہ ہندوؤں کے پاؤں اکھڑ گئے۔رات ہونے والی تھی کہ لڑائی کا فیصلہ مسلمانوں کے حق میں ہوگیا سارا میدان لاشوں سے پٹ گیا اور غیرتِ قومی پر جان دینے والے اب خوابِ مرگ کے مزے لوٹ رہے تھے۔ میدان خون سے لالہ زار تھا۔ وہ راجا جس کے تعاقب میں مسلمان آئے تھے گرفتار تھا اس طرح ایک نوجوان سپہ سالار کے عزم وحوصلہ کی وجہ سے مسلمانوں نے اپنے سے بڑی فوج پر فتح حاصل کرلی۔

☆......☆......☆

JOIN FOR MORE!!!

سوالات وجوابات

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS BASIM
www.studypak.xyz

رسم ورواج کی پابندی کے نقصانات

سوال(۱): سر سید احمد خان نے ایک دانا کا قول اور دوسرے کی رائے کا جو نتیجہ پیش کیا ہے وہ لکھئے؟

جواب: سر سید احمد خان نے پہلے دانا کا یہ قول پیش کیا کہ انسان کی تمام ذہنی اور عملی قوتیں صحیح طریقے سے اپنا اپنا کام کر رہی ہوں اور ان کا ایک دوسرے سے پورا پورا تعاون ہو تو یہی چیز ایک کامیاب زندگی کے لیے ضروری ہے۔ سر سید نے دوسرے دانا کی رائے اس طرح پیش کی کہ ہر شخص کو اس طرح زندگی گذارنی چاہیئے کہ وہ اپنا کام پوری آزادی اور لگن سے کرتا رہے مگر اس سے دوسروں کی آزادی کو کوئی نقصان نہ پہنچے پہلا قول انسان کی ذاتی اور انفرادی زندگی گذارنے کا عمدہ طریقہ ہے جبکہ دوسرے دانا کی رائے انسان کی اجتماعی اور تہذیبی زندگی کی رہنمائی قرار دی جاتی ہے اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں انسان کی انفرادی اور اجتماعی ترقی وخوشحالی کی ذمہ دار ہیں۔

سوال(۲): بے سوچے سمجھے پرانی رسومات کی تقلید سے کیا نقصانات ہوتے ہیں؟

جواب: بغیر سوچے سمجھے پرانی فرسودہ رسموں پر چلنے سے انسان کو ذاتی اور اجتماعی دونوں نقصانات ہوتے ہیں ترقی اور خوشحالی کے دروازے بند ہونے لگتے ہیں۔ رسموں کے بے جا تقلید سے اچائی اور برائی کی تمیز ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ انسان کی انفرادی صلاحیتیں بھی متاثر ہونے لگتی ہیں۔

JOIN FOR MORE!!!

سوال(۳): یہ خیال کہ "رسومات کی پابندی نہ کرنے سے انسان خراب ہو جاتا ہے"، کیوں غلط ہے؟

جواب: یہ فرسودہ اور جاہلانہ خیال ہے کہ رسموں پر عمل درآمد نہ کرنے والے خراب اور برے لوگ ہوتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ رسموں پر لگے بندھے طریقوں سے عمل کرنے سے انسان خراب ہو جاتا ہے۔ ہر انسان میں فطری طور پر برائیوں کو روکنے اور اچھائیوں کو قبول کرنے کی صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں ان ہی صلاحیتوں کی وجہ سے وہ برائیوں کو چھوڑتا ہے اور اچھائیوں کو قبول کرتا ہے۔ غلط اور فرسودہ رسموں کو چھوڑنا ایک فطری عمل ہے اس سے انسان خراب نہیں ہوتا۔

سوال(۴): ہماری طبیعت غلط رسموں کی پابندی کی مطیع و متحمل کیوں ہو جاتی ہے؟

جواب: جس گھرانے میں رسموں پر سختی سے پابندی کی جاتی ہے اس گھرانے میں آنکھ کھولنے والے بچے بھی اندھی تقلید کے نتیجے میں ان رسموں پر عمل کرنے لگتے ہیں یہی چیز اکثر انسان کی فطرت بن جاتی ہے اور وہ ان غلط رسموں کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کرتے۔ اس طرح وہ عادتاً لکیر کے فقیر بن جاتے ہیں۔

سوال(۵): رسومات کی کورانہ تقلید کس طرح انسان کو تنزلی کی طرف لے جاتی ہے؟

جواب: فرسودہ رسومات کو کورانہ یعنی بغیر سوچے سمجھے تقلید کرنے سے انسان ترقی کے بجائے تنزلی کی جانب جانے لگتا ہے۔ معاشرے میں موجود غیر ضروری رسم ورواج انسان کی ترقی وخوشحالی میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ مثلاً شادی ایک مقدس فریضہ ہے لیکن فضول رسم ورواج میں پڑ کر کئی کئی ہفتوں تک شادی کی خوشیاں مناتے ہیں قرضے لے کر فضول اخراجات کرتے ہیں جس کے نتیجے میں ترقی وخوشحالی کے بجائے مختلف قسم کی پریشانیوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور انسان تنزلی کی جانب گرنے لگتا ہے۔

سوال(۶): مشرقی اقوام کے زوال کا اصل سبب سر سید احمد خان کی نظر میں کیا ہے؟

جواب: مشرقی اقوام سے مراد ایشیائی قومیں ہیں اور ان میں مسلمان قوم بھی شامل ہے۔ سر سید احمد خان اقوام بالخصوص مسلمان اقوام کی ماضی کے کارناموں اور ایجادات کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ماضی میں ان اقوام میں عقل و فہم اور غور و فکر کی صلاحیتیں موجود تھیں۔ غلط اور فرسودہ رسم و رواج پر عمل کرنے سے یہ صلاحیتیں زنگ آلود ہو گئیں۔ اور آسانی سے دوسری جدید اقوام کی گلام بن گئیں یہی ان اقوام کی زوال اور تنزلی کا اصل سبب ہے۔

مسلمانوں کا قدیم طرزِ تعلیم

سوال(۱): قدیم زمانے کے مسلمانوں میں تعلم و تعلیم کی کیا صورت تھی؟

جواب: قدیم زمانے میں مسلمانوں کی تعلیم اور تعلم کا طریقہ سادہ اور فطری تھا۔ اساتذہ سیکھی ہوئی باتوں کو اپنے شاگردوں میں منتقل کرتے۔ زبانی سکھانے کا طریقہ رائج تھا۔ زیادہ علوم کا تعلق روایات سے تھا۔ نحو، معانی، فقہ، اصول حدیث اور اسماالرجال جیسے علوم موجود تھے۔ فلسفہ اور منطق جیسے علوم کو برا سمجھا جاتا تھا۔ تعلیم کے معاملے میں حکومت کی سرپرستی نہ تھی بلکہ لوگ خود ہی بچوں کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کرتے۔

سوال(۲): جب مسلمانوں میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہوا تو درس گاہوں میں کون کون سے علوم پڑھائے جاتے تھے؟

جواب: مسلمانوں کے قدیم دور میں جب کتابوں کے لکھنے، لکھانے اور مرتب کرنے کا سلسلہ شروع ہوا تو ان کتابوں کی تدریس کے لیے درسگاہیں قائم ہونا شروع ہوئیں۔ ان درسگاہوں میں نحو، معانی، لغت، فقہ، اصولِ حدیث، تاریخ، اسماء الرجال، طبقات اور متعلقات جیسے علوم کو سکھایا اور سمجھایا جانے لگا۔

سوال (۳): علومِ نقلی اور علومِ عقلی میں کیا فرق ہے؟

جواب: علومِ نقلی وہ علوم ہوتے ہیں جن کو باقاعدہ نقل کر کے نئی نسل کو سکھایا جاتا ہے۔ نقلی علوم میں مہارت حاصل کرنے کے لیے حافظہ کی سلاحیت کا بہترین ہونا ضروری ہے۔ علم الحدیث، تاریخ، سیرت، جغرافیہ اور روایات وغیرہ نقلی علوم کہلاتے ہیں۔ ان میں عقل سے زیادہ حافظہ یا یادداشت کو استعمال کرنا پڑتا ہے جبکہ عقلی علوم وہ علوم ہوتے ہیں جن کو سمجھنے کے لیے عقل و فہم کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ انسان غور و فکر پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ایسے علوم میں فلسفہ، کلام، سیاسیات، قانون وغیرہ شامل ہیں۔

سوال(۴): مسلمانوں کی فتوحات اور ان کے عروج کے زمانے میں علوم و فنون کی حیرت انگیز ترقی کی کیا وجہ تھی؟

جواب: سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اسلام نے "تعلیم" حاصل کرنے کو ایک فرض قرار دیا کیونکہ تعلیم کے بغیر دین کو بھی نہیں سمجھا جاسکتا۔ تعلیم ہی کی وجہ سے اس کائنات میں موجود چیزوں سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ اسی وجہ سے علم حاصل کرنے کا جذبہ پھیلتا گیا۔

سوال(۵): مسلمانوں کے عروج کے زمانے میں تعلیم کا مستند طریقہ کیا تھا؟

جواب: مسلمانوں کے عروج کے زمانے میں تعلیم کے دو مستند طریقے زیادہ مشہور تھے۔ پہلا طریقہ زبانی تقریر کرنا جس کو آج "لیکچر" کہا جاتا ہے۔ استاد جماعت میں اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر کسی موجوع پر تفصیلی لیکچر دیتا ہے طالبعلم اسے نوٹ کرتے جاتے ہیں۔ آخر میں سوال و جوابات کا

سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ دوسرا طریقہ بحث ومباحثے یعنی مناظرے کا تھا۔ مشہور علماء اپنی نگرانی میں طلبہ کے درمیان مناظرہ کراتے۔ اس دوران ضرورت پڑنے پر اساتذہ ان کی رہنمائی کرتے اور آخر میں نگران علماء اس بحث ومباحثے کا حاصل یا نتیجہ پیش کرتے۔

سوال(۶): مسلمانوں کے عروج کے زمانے میں کن کن مقامات کو علمی مراکز کا درجہ حاصل تھا اور کیوں؟

جواب: مسلمانوں کے عروج کے زمانے میں جو علمی مراکز مشہور تھے اس کا سبب یہ تھا کہ علماء کرام اور ماہر اساتذہ کی بڑی تعداد ہمیشہ موجود رہتی تھی۔ ان میں علم کے فروغ کا جذبہ موجود تھا۔ ان مشہور مقامات میں ہرات، نیشاپور، مرو، بخارا، فارس، بغداد، مصر، شام اور اندلس کے شہر قرطبہ خاص طور پر مشہور ہیں۔

سوال(۷): مسلمانوں کے عروج کے زمانے میں سلاطین، اہل منصب اور اہل ثروت کس طرح علوم وفنون کی سرپرستی اور اہل قلم کی قدردانی کرتے تھے؟

جواب: مسلمانوں کے عروج کے زمانے میں سلاطین، اہل منصب اور اہلِ ثروت لوگ خود بھی علوم کے ماہر ہوتے تھے۔ اسی وجہ سے اہلِ علم کی سرپرستی کرتے تھے، ان کو بھاری معاوضے دیتے، ان کے مرتبہ اور شان کے مطابق اخراجات، برداشت کرتے، معمولی امیر آدمی کے پاس بھی سینکڑوں ادیب اور عالم وفاضل علماء موجود ہوتے تھے۔

JOIN FOR MORE!!!

روزمرہ اور محاورہ

سوال(۱): محاورے کا اطلاق مفرد لفظ پر کیوں نہیں ہوتا اور اس کے لئے دو یا دو سے زیادہ الفاظ کا ہونا کیوں ضروری ہے؟

جواب: محاورے میں کئی لفظ شامل ہوتے ہیں جبکہ "مفرد" لفظ اکیلا لفظ ہوتا ہے جس کا تعلق لغت سے ہوتا ہے ہر مفرد یعنی اکیلے لفظوں کے الگ الگ معنی ہوتے ہیں لیکن دو یا دو سے زائد مفرد لفظوں کو اہل زبان ایک ساتھ استعمال کرتے ہیں اور جو بول چال میں عام ہو جاتے ہیں وہ "محاورہ" کے نام سے مشہور ہو جاتا ہے۔ محاورے میں موجود لفظوں کے حقیقی کے بجائے مجازی معنی لئے جاتے ہیں۔

سوال(۲): روزمرہ اور محاورے میں کیا فرق ہے؟

جواب: ایسے اکیلے لفظ جن کے لغت کے اعتبار سے معنی موجود ہوں انہیں مفرد وہ الفاظ کہا جاتا ہے یہی مفرد الفاظ جب اہل زبان بولتے ہیں تو وہ روزمرہ کی زبان بن جاتی ہے جبکہ محاورے میں دو یا دو سے زیادہ الفاظ ہوتے ہیں ان میں ایک معنی کے اعتبار سے حقیقی اور دوسرا مجازی مفہوم کو ظاہر کرتا ہے۔ محاورہ اہل زبان زیادہ استعمال کرتے ہیں جو عوام میں بھی مقبول ہونے لگتے ہیں۔

سوال(۳): چند مثالیں دے کر سمجھایئے کہ محاورے کا اطلاق ان افعال پر ہوتا ہے جو کسی اسم سے مل کر حقیقی نہیں بلکہ مجازی معنی میں استعمال ہوتے ہیں؟

جواب: محاورہ ان دو یا دو سے زائد الفاظوں کے استعمال کو کہتے ہیں جن میں ایک لفظ کے حقیقی معنی نکلیں اور دوسرے لفظوں کے مجازی معنی نکلیں مثلاً قسم کھانا، مار کھانا، غم کھانا، دھوکہ کھانا۔ ان تمام مثالوں میں "کھانا" اپنے مجازی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

سوال(۴): فصاحت کے لیے روزمرہ کی پابندی ضروری ہے یا محاورے کی؟

جواب: ایسی تحریر یا گفتگو جس کا ہر لفظ صاف، سادہ، اور عام روزمرہ کی زبان کے مطابق ہوتا ہے اسے فصاحت پر مبنی تحریر یا گفتگو کہا جاتا ہے۔

اس لیے صاف ستھری اور بامعنی بول چال کے لیے روزمرہ کا استعمال نہایت ضروری ہے البتہ کسی مناسب موقعہ پر محاوروں کا استعمال "روزمرہ" کے ساتھ کیا جاسکتا ہے جس سے اس عبارت کی خوبصورتی اور معنوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ

سوال(۱): ملکہ صداقت زمانی کو سلطان آسمانی کی بیٹی اور ملکہ دانش کو اس کی ماں کیوں قرار دیا گیا؟

جواب: سلطان آسمانی یعنی خالق باری تعالیٰ ہی نیکی اور سچائی کا سرچشمہ ہے۔، وہ اپنے بندوں کو نیکی صداقت اور سچائی پر عمل پیرا دیکھنا چاہتا ہے۔ عقل و دانش کو ملکہ صداقت زمانی کی ماں کہا گیا، اس لیے کہ عقل و فہم کے استعمال سے ہی نیکی اور سچائی کو فروغ ملتا ہے۔

سوال(۲): سلطان آسمانی نے اپنی بیٹی صداقت زمانی کو کیا حکم دیا اور کیوں؟

جواب: آسمانوں کے سلطان کا یہ حکم تھا کہ دنیا میں جا کر نیکی اور سچائی کو پھیلاؤ۔ کیونکہ بدی کی طاقتیں انسانوں کو گمراہ کر رہی تھیں۔

JOIN FOR MORE!!!

سوال(۳): احمق تیرہ دماغ کو دروغ دیوزاد کا باپ اور ہوس ہوا پرست کو اس کی ماں کیوں کہا گیا؟

جواب: برائیوں میں مبتلا ہونے کا اصل سبب جہالت اور بیوقوفی ہوتا ہے جس کی کامیابی عارضی اور ناکامی زیادہ ہوتی ہے جبکہ نیکی اور صداقت ہمیشہ باقی رہنے والی چیزیں ہیں۔ جھوٹ آسانی سے سامنے آجاتا ہے اور جھوٹا انسان کبھی سرخرو نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے احمق تیرہ کو دروغ دیوزاد کا باپ قرار دیا گیا اور ہوس ہوا پرست کو اس کی ماں کہا گیا کیونکہ وہ ہوس اور لالچ میں مبتلا کر کے انسانوں کو گمراہ کرتی تھی۔

سوال(۴): دروغ دیوزاد سلطان آسمانی کے دربار میں کس طرح پہنچا؟

جواب: دروغ دیوزاد کو سلطان آسمانی کے دربار میں آنے کی اجازت نہ تھی مگر وہ سلطان آسمانی کے دربار میں مسخروں، فحش گوئی کرنے والوں اور ظرافت کی نقالی کرنے والے بھانڈ کے ساتھ پہنچا تھا۔

M.HARIS www.

سوال(۵): رزم گاہ میں ملکہ صداقت کی تصویر کس طرح کھینچی گئی؟

جواب: ملکہ صداقت کی شان اور دبدبہ بادشاہوں جیسا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے آئی تھی اس کے آگے فتح و نصرت کا نور تھا۔ اس کے پیچھے عقل و فہم و ادراک تھا، وہ جہاں قدم روکتی وہ جم جاتا تھا اسے انسان تو کیا فرشتے بھی نہ اُکھاڑ سکتے تھے۔

سوال(۶): رزم گاہ میں روغ دیوزاد کے ساتھ کون کون تھے اور وہ کیا کیا ہتھکنڈے استعمال کرتے تھے؟

جواب: رزم میں جھوٹ اور منافقت کا دیوزاد اپنی شان بڑھانے کے لیے سر پر بادلوں کی پگڑی پہن لیتا تھا۔ وہ فحش گوئی کرنے والوں کو حکم دیتا کہ شیخی اور نمود و نمائش رکھنے والوں کے ساتھ آگے جا کر شور مچانا شروع کر دو۔ وہ دغا اور فریب کو اشارہ کرتا کہ نشانہ لگا کر بیٹھ جاؤ۔ دائیں ہاتھ میں مکاری کی تلوار اور بائیں ہاتھ میں بے حیائی کی ڈھال تھی، اس کے جسم میں غلط تیروں کا ترکش لٹکا ہوا تھا۔ ہوا و ہوس دائیں بائیں ہوتے، وہ پکاہٹ دھرم تھا۔ وہ سامنے سے نہیں بلکہ پیچھے سے وار کرتا تھا۔

سوال(۷): حق و باطل کے معرکے میں فتح کس کو حاصل ہوتی تھی اور کیوں؟

جواب: حق اور باطل کے معرکے میں ہمیشہ کامیابیاں اور فتوحات حق کو نصیب ہوتی ہیں، کیونکہ باطل مٹنے کے لیے اور "حق" پھیلانے کے

لیے ہے اس لیے حق و سچائی کو ہمیشہ فتح ہوتی ہے۔

سوال(۸): تمثیل نگاری کسے کہتے ہیں؟

جواب: صداقت، دروغ، حسد، ہوس، دانشمندی، شیخی، نمود وغیرہ کو جو انسانوں میں پائی جانے والی اچھائیاں اور برائیاں ہیں۔ اس سبق کے مصنف محمد حسین آزاد نے ان اچھائیوں اور برائیوں کو اس طرح پیش کیا کہ یہ خود زندہ انسانوں کی طرح ہوں۔ اس قسم کی مضمون نگاری کو تمثیل نگاری کہتے ہیں۔

ٹھیلے والا شہزادہ

سوال(۱): ٹھیلے والا کون تھا اور اس نے انگریز مجسٹریٹ کے سامنے کیا بیان دیا؟

جواب: ٹھیلے والا مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا بھتیجا تھا۔ اس نے انگریز مجسٹریٹ کے سامنے یہ بیان دیا 1857ء کے غدر کے بعد میں اپنی نابینا ماں کو لے کر دربدر پھرتا رہا۔ دس سال بعد واپس آکر یہ ٹھیلا چلانے کا کام شروع کیا۔ 11 مئی 1917ء کو موٹر والے نے ٹھیلے کو ٹکر ماردی اور مجھے بھی کوڑے سے پیٹا۔ میں نے بھی بدلے میں چابک سے ان کی پٹائی کر دی۔ میں بھی ساٹھ سال پہلے آپ کی جگہ پر بیٹھ کر فیصلے کیا کرتا تھا۔

سوال(۲): انگریز مجسٹریٹ نے اسے کیوں بری کر دیا؟

جواب: انگریز مجسٹریٹ نے شہزادے کا بیان سُن کر اسے بری کر دیا کیونکہ اس نے اپنے دفاع میں حملہ کیا تھا اور گاری میں سوار سوداگر پر دس روپیہ جرمانہ بھی کیا کیونکہ اُس نے نشے میں گاری چلائی تھی۔

سوال(۳): انگریز مجسٹریٹ نے ازراہِ ہمدردی بوڑھے سے کیا کہا اور بوڑھے نے کیا جواب دیا؟

جواب: انگریز مجسٹریٹ نے بوڑھے شہزادے سے کہا تم سرکار سے پنشن کیوں نہیں لیتے اور یہ ٹھیلے کا کام کیوں کرتے ہو تو بوڑھے شہزادے نے جواب دیا میں مزدوری کرنا پسند کرتا ہوں۔ پڑھے لکھے لوگ نوکریوں کی تلاش کرتے رہتے ہیں، ان کے مقابلے میں میری حالت کافی بہتر ہے۔ ٹھیال چلانے میں کوئی برائی نہیں کیونکہ میں ٹھیلے کے بیلوں پر حکومت کرتا ہوں میں کسی کا غلام نہیں ہوں۔

سوال(۴): بوڑھا اپنے ٹھیلے پر اپنے آپ کو ایک طرح سے بادشاہ کیوں محسوس کرتا تھا اور وہ انگریزوں کے دفتروں میں کام کرنے والوں سے اپنے آپ کو بہتر کیوں سمجھتا تھا؟

جواب: بوڑھا شہزادہ ٹھیلے میں جُتے بیلوں کو اپنی مرضی سے چلا کر خود کو بادشاہ محسوس کرتا تھا۔ کہ یہ بیل تو میرے عوام ہیں۔ انگریز کے دفتروں میں کام کرنے والے لوگ غلاموں کی طرح کام کرتے ہیں اور میں ان غلاموں سے بہت بہتر ہوں۔

سوال(۵): بوڑھے شہزادے نے یہ کیوں کہا کہ ہر گزرنے والی بات اور گزرنے والا وقت اور گزرنے والی راحت و تکلیف جھوٹی اور بے اصل ہوتی مگر اس میں عبرت ضرور ہے؟

جواب: بوڑھے نے اپنی ماضی کی شان و شوکت، خوشیاں، اس کے بعد ظلم و ستم، پریشانیوں، تکلیفوں اور مصیبتوں کا ذکر کیا۔ اس وجہ سے اس نے کہا کہ ہر خوشی یا غم اس میں عبرت ضرور ہوتی ہے۔ دوسروں کو ایسے واقعات سے سبق حاسل کرنا چاہیئے۔

تشکیل پاکستان

سوال(۱): شاہ ولی اللہ کی اصلاحی تحریک کا مقصد کیا تھا؟

جواب: مسلمانوں کی مذہبی حالت بہت خراب تھی اور رائج معاشرتی رسموں میں مسلمان اور ہندوؤں میں زیادہ فرق نہیں رہا تھا۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی تحریک کا مقصد مذہبی احیاء اور معاشرے سے ایسی خراب رسموں کا خاتمہ تھا جو تنزلی کا باعث بن رہی تھیں۔

سوال(۲): سرسید احمد خان نے برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں کے لیے جو خدمات انجام دیں وہ تحریر کیجئے۔

جواب: سرسید احمد خان نے مسلمانوں کو نئے زمانے کی ضروریات سے آگاہ کیا جدید علوم کے سیکھنے اور حکومت سے تعاون پر آمادہ کیا، اس سلسلے میں کئی مضامین اور کتابیں تحریر کیں۔ رسالہ تہذیب الاخلاق بھی جاری کیا۔ علی گڑھ کالج قائم کیا۔ مسلمانوں کو تعلیمی ترقی پر آمادہ کیا۔

JOIN FOR MORE!!!

سوال(۳): علامہ اقبال نے مسلمانوں کی بیداری کے لیے کن چیزوں کو اہم قرار دیا؟

جواب: علامہ اقبال نے مسلمانوں کی بیداری کے لیے چار چیزوں کو ضروری قرار دیا:

اول۔ توحید جس پر ایمان عملاً انسان کو خوف ومایوسی سے آزاد کر دیتا ہے۔

دوم۔ رسول اکرم ﷺ سے محبت اور ان کی مکمل تقلید

سوم۔ قرآن کا مطالعہ اور اس کی تعلیمات کی پیروی

چہارم۔ رجائیت یعنی مایوسی اور غم پسندی کو ترک کرکے امید، ہمت، اور جرات کی راہ اختیار کرنا۔

سوال(۴): سرسید کے بعد ان کے جانشینوں نے کیا اہم قومی اور دینی خدمات انجام دیں؟

جواب: سرسید کے بعد ان کے جانشینوں نے ان کا شاندار کام جاری رکھا۔ محسن الملک نے علی گڑھ کالج کو ترقی دی، وقار الملک ایک سیاسی جماعت کی تشکیل میں معاون ثابت ہوئے، حالی کی مسدس نے مسلمانوں میں انقلاب کی لہر دوڑادی، شبلی نے اسلامی تاریخ کے آئینے میں ماضی کی عظمت دکھا کر دلوں کو گرمایا، ڈپٹی نذیر احمد نے اصلاحی ناول نگاری سے معاشرتی برائیوں کی روک تھام کی کوشش کی جبکہ سید امیر علی نے اپنی انگریزی تصانیف کے ذریعے اسلام کا حقیقی روپ پیش کرنے کی کوشش کی۔

M.HARIS www.studyhall.xyz

جدید سائنس اور عصری تقاضے

سوال(۱): سائنس کو ایک تجرباتی علم کن لوگوں نے بنایا؟

جواب: سائنس علم کی اس شاخ کا نام ہے جس نے تجربہ خانوں میں جنم لیا اور تجربہ خانوں میں ہی نشوونما پائی، اس لیے اسے تجرباتی علم کہا جاتا ہے۔ مسلمان سائنس دانوں نے تحقیق اور دریافت کے لیے تجرباتی طریقوں کو اپنایا، ان میں جابر بن حیان، جاحظ، خوارزمی، یعقوب الکندی، رازی، فارابی، زہراوی، ابن الہیثم، البیرونی، ابنِ سینا، محمد خیام، ابن رشد وغیرہ شامل ہیں۔

سوال(۲): یورپی اقوام نے مسلمانوں کے سائنسی علوم سے کس طرح فائدہ اُٹھایا؟

جواب: یورپی اقوام نے سائنس کی چھوڑی ہوئی میراث مسلمانوں سے ہی حاصل کی۔ یورپی طلبہ قریبی مسلم ملک اسپین جاتے وہاں مسلمانوں سے سائنس سیکھتے اور پھر خود اپنے وطن واپس جا کر اسے آگے بڑھاتے، ان لوگوں نے مسلمانوں سائنس دانوں کی کتابوں کے یورپی زبان میں بڑے پیمانے پر ترجمے بھی کرائے، یہ کام اتنا بڑا تھا کہ تین صدیوں میں بھی مکمل نہیں ہوا۔

سوال(۳): سائنسی ذرائع اختیار کر کے انسان نے زمین کے نیچے چھپے ہوئے کون کون سے خزانے معلوم کئے؟

جواب: سائنسی ذرائع اختیار کر کے انسان نے زمین کے نیچے چھپے ہوئے پوشیدہ خزانے دریافت کئے۔ خردبین ایجاد کر کے ان دیکھی مخلوقات کی دنیا دریافت کی جن میں بیماریاں پیدا کرنے والی مخلوقات، بیکٹیریا اور وائرس کی بھی کثیر تعداد ملی۔ اس کے بعد ان کی انسداد کی دوائیں ایجاد کرنا ممکن ہو سکا۔ پھر ایک اور نئی دنیا دریافت ہوئی جو سمندر کے نیچے گہری اور کشادہ گھاٹیوں میں موجود ہے جس میں موجود نباتات اور مخلوقات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ مستقبل کی انسانی خوراک اور دوسری ضروریات کا انحصار ان پر ہو گا۔

JOIN FOR MORE!!!

سوال(۴): سائنس کی ترقی میں حصہ لیان کیوں ضروری ہے؟

جواب: سائنسی ایجادات اور بے پناہ فوائد کی وجہ سے سائنس شوقیہ علم کے بجائے انسان کی لازمی ضرورت بن چکی ہے کیوں کہ سائنس کی وجہ سے انسانوں کی زندگی آرام دہ اور فرحت بخش بن چکی ہے، یہ بیماروں کے لیے صحت کا پیغام ہے، کسانوں کی خوشحالی کی اُمید ہے، صنعتکاروں کے لیے جادو کی چھڑی ہے، بڑھتی ہوئی آبادی کی کفالت کی ضمانت بھی ہے۔

سوال (۵): سائنس کی امکانی ترقیاں پاکستانی نوجوانوں سے کیا تقاضہ کرتی ہیں؟

جواب: سائنس کی امکانی ترقیاں پاکستانی نوجوانوں سے یہ تقاضہ کر رہی ہیں کہ وہ ارادہ کر لیں اور سائنسی تعلیم کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں تو اکیسویں صدی میں وہ دنیا کی سب سے ترقی یافتہ قوموں کی صف میں اپنی جگہ بنا سکتے ہیں۔

M.HARIS

سوال(۶): اگر سائنس کی تمام ترقیاں یک لخت رُک جائیں تو انسانی معاشرے پر کیا اثرات مرتب ہوں گے؟

جواب: اگر سائنس کی تمام ترقیاں یک لخت رُک جائیں تو انسانی معاشرہ صدیوں پیچھے ماضی میں چلا جائے گا۔

سوال(۷): سائنس کا مستقبل کیا ہے؟

جواب: سائنس کی اگلی ترقیاں خود انسان اور حیوانات کو تبدیل کر دیں گی۔ انسان حیاتیات کی مدد سے پودوں اور حیوانات کے تخم میں ہی تبدیلی کر دے گا اور پھر اپنی پسند کے حیوانات اور پودے پیدا کرنے لگے گا۔ زیادہ پیداوار والے پھدار درخت، زیادہ اناج والی فصلیں، زیادہ گوشت اور دودھ دینے والے مویشی، جراثیم سے پاک پودے اور حیوانات اور اس جیسی دوسری دریافتیں، سائنس کے روشن مستقبل کا پتہ دے رہی ہیں۔

ماما عظمت

سوال(۱): مولوی صاحب پر لوگوں کا اتنا قرض چڑھنے کی اصل وجہ کیا تھی؟

جواب: مولوی صاحب پر لوگوں کا اتنا قرض چڑھنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ ان کی غیر موجودگی میں ان کی نوکرانی "ماما عظمت" نے ادھار کے سودوں میں اپنے گھر، بیٹی کے گھر اور محلے والوں کے سودے بھی لکھواتی رہی، جس سے مولوی صاحب کا قرض بہت بڑھ گیا۔

سوال(۲): ماما عظمت کیسی عورت تھی، اس کہانی میں اس کا کیا کردار بیان کیا گیا ہے؟

جواب: "ماما عظمت" ایک چالاک اور عیار عورت تھی۔ اس کے اپنے سادہ لوح مالک کو بیوقوف بنایا اور ان کے کھاتے میں بہت زیادہ قرض ڈال دیا۔

سوال(۳): وہ اپنی بے ایمانی کو چھپانے کے لیے کیا کیا بہانے تراشتی رہی؟

جواب: ماما عظمت اپنی بے ایمانی کو چھپانے کے لیے یہ بہانہ بنایا کہ کسی ایک کا حساب ہو تو بتاؤں مجھے تو زبانی یاد نہیں ہے۔ آپ مجھے ساری رقم دے دیں تاکہ میں ایک ایک کو ادا کر آؤں۔

سوال(۴): اس نے اپنی جان بچانے کے لیے بزاز اور ہزاری مل کو کس طرح ہموار کرنے کی کوشش کی؟

جواب: اس نے اپنی جان بچانے کے لئے بزاز اور ہزاری مل کو اپنے اور اپنی بیٹی کے زیوارت دیئے اور ان کو خاموش رہنے کی تاکید کی۔

سوال(۵): ماما عظمت کے سبق سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے؟

جواب: "ماما عظمت" کے واقعے سے ہم کو یہ سبق ملتا ہے کہ نوکر اور نوکرانیوں پر اندھا اعتماد نہیں کرنا چاہیئے، گھر کے کاموں مین خود بھی دلچسپی لینی چاہیئے تاکہ کوئی ملازم جھوٹ کا سہارا نہ لے سکے۔

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS
www.studypaknet.xyz

نوجوان سپہ سالار کا عزم و حوصلہ

سوال(۱): دریائے اٹک کے آس پاس کے علاقے کی عام صورتحال کیا تھی؟

جواب: دریائے اٹک کے آس پاس کا علاقہ بڑا زرخیز ہے مگر ان دنوں وہاں مسلمان ترک فوج کے حملے کا خطرہ تھا کہ مویشی چرانے والے بھی خوفزدہ تھے کہ کہیں مسلمان فوجی ان کے مویشی پکڑ کر نہ لے جائیں۔

سوال(۲): راجپوتوں سے معرکہ آرائی کے متعلق یحییٰ کی کیا رائے تھی، وہ اپنے نوجوان سپہ سالار کو کیا مشورہ دے رہا تھا؟

جواب: راجپوتوں کے متعلق عام رائے یہ تھی کہ وہ بڑے بہادر، جری اور لڑنے والے ہیں اور ان کی سرکوبی کے لیے حوصلہ مند اور بہادر سلطان ہونا چاہیئے۔

سوال(۳): نوجوان سپہ سالار اپنے جانباز مجاہدوں کا دستہ لے کر کیوں آیا تھا؟

جواب: نوجوان سپہ سالار اپنے جانباز مجاہدوں کو لے کر اس علاقے میں اس لیے آیا تھا کہ وہ مفرور ہندو راجہ کو تلاش کرے، اس سے جنگ

لڑے اور اس کا خاتمہ کرے۔

سوال(۴): ہندو راجہ کے سپاہیوں نے آتے ہی فوراً حملہ شروع کر دیا۔ مسلمانوں کی بھی تلواریں نیاموں سے نکل آئی۔ نوجوان سپہ سالار بھی یہی چاہتا تھا کہ جنگ فوراً شروع ہو جائے۔

جواب: جب ہندوؤں کی مدد لئے دو سپاہی اور آ گئے تو اس موقع پر مسلمان سپاہیوں کے حوصلے پست ہونے لگے۔

سوال(۵): ایک منزل پر مسلمان مجاہدین کے حوصلے کیوں پست ہونے لگے؟

جواب: جب ہندوؤں کی مدد لئے دو سو سپاہی اور آ گئے تو اس موقع پر مسلمان سپاہیوں کے حوصلے پست ہونے لگے۔

سوال(۶): مسلمانوں کے نوجوان سپہ سالار نے لڑائی کا نقشہ کس طرح پلٹ دیا؟

جواب: اس موقع پر مسلمانوں کے نوجوان سپہ سالار نے پر جوش تقریر کر کے جذبہ جہاد کو بلند کر دیا۔ اس سے ان سپاہیوں کا حوصلہ بڑھا اور لڑائی کا نقشہ پلٹ گیا اور مسلمانوں کو فتح ہو گئی۔

JOIN FOR MORE!!!

آزادی کی راہ میں

سوال(۱): انگریزوں کے سلسلے میں لڑکی کے باپ کا اصل رویہ کیا تھا؟

جواب: انگریزوں کے سلسلے میں لڑکی کے باپ کا رویہ نفرت آمیز تھا مگر حالات سے مجبور ہو کر وہ انگریزوں کی نوکری کرنے پر بھی مجبور تھے۔

سوال(۲): انگریز افسر نے ان کی محنت اور مہمان نوازی کا کیا صلہ دیا؟

جواب: انگریز افسر نے ان کی محنت اور مہمان نوازی کے صلے میں ان کی معمولی سی غلطی کو بھی برداشت نہ کیا جس پر عالیہ کے ابّا غصہ میں آ گئے اور انہوں نے اس انگریز افسر کو زخمی کر دیا۔

M.HARIS www.studypak.xyz

سوال(۳): چپڑاسی نے جو کچھ بتایا اس سے اس دور کے عام مسلمانوں کے کن خیالات اور جذبات کا پتہ چلتا ہے؟

جواب: اس دور کے عام مسلمان انگریزوں کی حکمرانی کو پسند نہیں کرتے۔ جلد غصہ میں آ جاتے۔ موقع ملتے ہی اپنی بے عزتی کا بدلہ ضرور لیتے۔

سوال(۴): لڑکی کے ماموں جان کا روّیہ مسلمانوں کے کس گروہ کی نمائندگی کرتا ہے؟

جواب: لڑکی کے ماموں جان کا رویہ مسلمانوں کے ایسے گروہ سے مطابقت کر رہا تھا جو انگریزوں کے وفادار اور تابعداری کرتے تھے۔

بائیسکل کی تعلیم

سوال(۱): موصوف کے بقول دنیا میں لوگوں کے کیا کیا شوق ہوتے ہیں اور ان کے لیے وہ کیا کرتے ہیں؟

جواب: موصوف کے بقول دنیا میں لوگوں کے بے شمار شوق ہوتے ہیں، خواہ وہ بائیسکل چلانے کا ہو، خان بہادر بن جانے کا یا گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کا شوق۔ لوگ اپنے شوق کی تکمیل کے لیے ہر جائز وناجائز طریقہ کو اختیار کرتے ہیں۔

سوال(۲): جو صاحب یہ قصہ بیان کر رہے ہیں، ان کو بائیسکل چلانے کا شوق کیوں ہوا؟

جواب: انہیں اپنے ہم عمر دوستوں اور بڑے لوگوں کو بائیسکل چلاتے دیکھ کر خود بھی شوق پیدا ہوا کہ وہ بھی ان کی طرح بائیسکل چلائیں۔

سوال(۳): انہوں نے اپنا یہ شوق پورا کرنے کے لیے کیا کیا؟

جواب: انہوں نے پہلے تو گھر والوں سے ضد کی کہ وہ انہیں سائیکل دلائیں پھر وہ اپنے ایک بزرگ مہمان کی سائیکل اُٹھا کر رفوچکر ہو گئے۔

JOIN FOR MORE!!!

سوال(۴): ہمیں اس سبق سے کیا رہنمائی حاصل ہوتی ہے؟

جواب: ہمیں اس سبق سے یہ رہنمائی حاصل ہوتی ہے کہ اپنے شوق کی تکمیل کے لیے بلاوجہ ضد نہیں کرنی چاہیئے۔

میبل اور میں

سوال(۱): میبل اور مصنف میں دوستی کی کیا وجوہات تھیں؟

جواب: میبل اور پطرس بخاری میں دوستی کی وجوہات یہ تھیں کہ دونوں کی دلچسپیاں ایک جیسی تھیں دونوں مصوری اور موسیقی کے شوقین تھے اور کتابوں کے مطالعے کے عادی تھے۔

M.HARIS www.studypak.xyz

سوال(۲): اس دوستی اور ہم آہنگی کے باوجود ان کی سوچ میں کیا اہم فرق تھا؟

جواب: ان دونوں کی دوستی اور ہم آہنگی زیادہ تھی۔ دونوں مرد اور عورت کی مساوات کے قائل تھے مگر اپنے طرزِ عمل میں دونوں میں احساس برتری نمایاں تھی۔

سوال(۳): وہ ایک عرصے تک ایک دوسرے سے جھوٹ کیوں بولتے رہے؟

جواب: میبل اور پطرس بخاری ایک عرصے تک اپنی اپنی برتری کو منوانے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیتے رہے۔

بردبار اور دانشمند

سوال(۱): مضمون نگار نے الو کو بردبار اور دانشمند کیوں کہا ہے؟

جواب: مضمون نگار ڈاکٹر شفیق الرحمٰن نے "الو" کو بردبار اور دانشمند اس لیے کہا ہے کہ اکثر لوگ "الو" کو عقلمندی کی علامت کہتے ہیں کیونکہ اس کا انداز بردبار اور دانشمند لوگوں جیسے ہوتا ہے یعنی وہ خاموش رہتا ہے، ویرانوں کو پسند کرتا ہے۔ ملنا جلنا بھی پسند نہیں کرتا۔

سوال(۲): "وہ کھنڈروں میں رہتا ہے لیکن کھنڈر بننے کی وجوہات اور ہوتی ہیں" اس فقرے میں ہم انسانوں پر کیا طنز کیا گیا ہے؟

جواب: اس فقرے میں انسانوں پر طنز کیا گیا کہ انسانوں کی ناقدری کی وجہ سے بستیاں اُجڑ جاتی ہیں۔ لالچ، ہوس اور طاقت کے چکر میں تباہی بربادی ہوتی ہے اور آباد شہر ویران کھنڈر میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

سوال(۳): بعض لوگ کبھی مسکراتے، "اس سے وہ دوسروں پر کیا رعب ڈالنا چاہتے ہیں؟"

جواب: ایسے لوگ اپنے اس طرز عمل سے دوسروں کے مقابلے میں خود کو بردبار، سنجیدہ اور عقلمند ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

سوال(۴): الو کو نحوست کی نشانی سمجھنا کہاں تک درست ہے؟

جواب: "الو" کے معاملے میں مغربی ممالک کے افراد اسے عقلمندی کی نشانی سمجھا جاتا ہے جبکہ مشرق میں لوگ نحوست قرار دیتے ہیں جو کہ غلط ہے۔ اسلام کے نزدیک تمام چیزوں کا خالق اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس کی تخلیق کردہ چیزوں میں کوئی عیب، برائی نکالنا سخت گناہ سمجھا جاتا ہے اور کسی چیز سے خوش بختی یا نحوست وابستہ کر لینا بھی غلط ہے۔ کیونکہ یہ چیزیں توہم پرستی میں شمار کی جاتی ہیں۔ اسلام میں توہم پرستی کی سخت ممانعت ہے۔

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS WWW.HARISSTUDY.XYZ

سوال(۵): سبق کو غور سے پڑھیے، مصنف نے الو کے حوالے سے انسانی معاشرے کی کن برائیوں پر طنز کیا ہے؟

جواب: اس سبق کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد انسانوں کے معاشرے میں موجود برائیوں میں اور الوؤں کے معاشرے کی خصوصیات میں مماثلت نظر آتی ہے۔ یعنی تمام انسان ایک جیسی فطرت نہیں رکھتے، ان کی پسند و ناپسند الگ الگ ہے، انسان اپنے آپ کو نمایاں رکھنا چاہتا ہے، اپنے آپ کو پسند کرانا چاہتا ہے، وہ خود غرض بھی ہوتا ہے۔ اکثر لوگ خاموش رہ کر اور تنہائی پسند بن کر بردبار اور دانشمند کہلانا پسند کرتے ہیں۔ بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت میں آج بھی لاپرواہی برتی جاتی ہے۔ لوگوں سے تعلقات رکھنے کو بُرا سمجھا جاتا ہے۔ انسانی معاشرے میں توہم پرستی بھی عروج پر نظر آتی ہے۔

ایک شام ماضی کی محرابوں میں

سوال(۱): حضرت یحیٰ علیہ السلام کا مزار کہاں ہے؟ اور لوگ وہاں اکثر کیا کرتے ہیں؟

جواب: ملک شام کے دار الحکومت دمشق کی جامع مسجد میں حضرت یحیٰ علیہ السلام کا مزار موجود ہے۔ اکثر لوگ اس مزار کے چاروں طرف اعتکاف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

سوال(۲): جامع مسجد کے مشرقی منارے کے متعلق کیا روایت ہے؟

جواب: جامع مسجد دمشق کے مشرقی منارے سے متعلق یہ روایت ہے کہ جب دنیا میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دوبارہ نزول ہو گا تو وہ اسی منارے پر اتارے جائیں گے۔

سوال(۳): سلطان صلاح الدین ایوبی کی تربت دیکھ کر ابنِ انشاء کے کیا تاثرات تھے؟

جواب: دمشق کی جامع مسجد میں سلطان صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ کے مزار پر مصنف ابنِ انشاء کے تاثرات یہ تھے کہ موجودہ دور میں بھی

اس مسلمان جرنیل کی شدید ضرورت ہے کیونکہ فلسطین کے رہنے والے دربدر ہو گئے ہیں۔ فلسطین کو آزاد کرانے کے لیے موجودہ دور میں بھی سلطان صلاالدین ایوبی کی ضرورت ہے۔

سوال(۴): "سوق حمیدیہ" کیا چیز ہے؟ اور ابنِ انشاء نے یہاں کا نقشہ کس طرح کھینچا ہے؟

جواب: "سوق" کا مطلب بازار ہے۔ "حمیدیہ" بازار کا نام ہے۔ یہ دمشق کا مشہور بازار ہے، اس کی چھت کو اب لوہے کی چادروں سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔ بازار سے منسلک ایک گلی میں پرانی محرابیں نظر آنے لگتی ہیں اور قدیم مدرسہ ناصریہ کا قدیم دروازہ بھی موجود ہے۔

سوال(۵): دمشق کی پرانی محرابوں کو دیکھ کر ابنِ انشاء صاحب کو تاریخ کے کون کون سے دور یاد آ گئے؟

جواب: دمشق کی پرانی محرابوں کو دیکھ کر ابنِ انشاء صاحب کو ہلاکو خان اور تیموریہ دور کی خونریز جنگیں یاد آ گئیں جن سے دمشق میں بڑی تباہی و بربادی ہوئی تھی۔

سوال(۶): ابنِ انشاء کے اس سفر نامے کی ہمارے لئے کیا اہمیت ہے؟

جواب: ابنِ انشاء اردو زبان کے ایک ایسے ادیب ہیں، جو اپنے سفر ناموں میں اپنے ہلکے پھلکے انداز میں تاریخی واقعات کی جھلک دکھاتے ہیں کہ پڑھنے والا ماضی کی محرابوں میں خود ان کے ساتھ چلتا پھرتا ہوا محسوس کرتا ہے۔

JOIN FOR MORE!!!

میکسیکو سٹی اور میں

سوال(۱): میکسیکو سٹی میں کس منظر سے یہ احساس ہوتا ہے کہ مشرقیت قریب آ گئی ہے؟

جواب: میکسیکو شہر میں مصنفہ کو لوگوں کے کالے بالوں، گندمی رنگت اور سیاہ اور بھوری آنکھوں سے لگا کہ یہ کوئی مشرق کا ملک ہے۔ اس کے وعلاوہ یہاں کی بدانتظامی، بے ترتیبی، لاپرواہی اور غربت بھی مشرقی ملکوں جیسی نظر آتی ہے۔

M.HARIS BASIM www.studypak.xyz

سوال(۲): میکسیکو کے لوگ کس مزاج کے ہوتے ہیں؟

جواب: میکسیکو کے رہنے والے بڑے خوش مزاج واقع ہوئے ہیں۔ محنتی اور جفاکش بھی ہیں، شرمیلے بھی ہیں، اجنبیوں کو دیکھ کر مسکراتے ہیں۔

سوال(۳): میکسیکو کے بازاروں کی کیا خصوصیات ہیں؟

جواب: میکسیکو میں بے روزگاری بہت ہے جس کا اثر وہاں کے بازاروں میں نظر آتا ہے یعنی ایک معمولی تھیلا اُٹھانے کے لیے چار چار مزدور تیار ملتے ہیں۔ فقیر بھی شور شرابہ کئے بغیر خاموشی سے بھیک مانگتے ہیں۔ بوڑھی عورتیں لاٹری کے ٹکٹ بیچتی نظر آتی ہیں جبکہ بوڑھے جوتوں پر پالش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

سوال(۴): میکسیکو سٹی کی آب و ہوا بڑی پُر بہار اور خوشگوار ہے، وضاحت کیجئے۔

جواب: میکسیکو سٹی سطح سمندر سے سات ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے کہ نیم برفانی شہر ہے۔ یہاں خوبصورت جھیلیں ہیں، جن میں دیدہ زیب

کشتیاں تیر رہی ہوتی ہی، دلکش مناظر ہیں، پھولوں سے سجی ہوئی وادیاں ہیں، اس شہر کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر ہسپانوی فاتح، "کورتے" نے اس کو نئی دنیا کے "وینس" کا لقب دیا تھا۔

سوال(۵): میکسیکو سٹی کے لوگوں کے کھانوں میں اور ہمارے مشرقی کھانوں میں کیا اہم خصوصیات نظر آتی ہیں؟

جواب: میکسیکو کے لوگ کھانوں کے معاملے میں مشرق جیسے ہی نظر آتے ہیں۔ مشرقی لوگوں کی طرح راہ چلتے "بھُٹے" کھانے میں کسی تکلف کا مظاہرہ نہیں کرتے۔

سوال(۶): میکسیکو سٹی کی تعمیر و ترقی میں کن لوگوں نے اہم کردار ادا کیا ہے؟

جواب: میکسیکو سٹی کی بنیاد "اژتک قبائل" کے سرداروں نے رکھی جو خوبصورتی کو پسند کرتے تھے، اسی وجہ سے جھیلوں کے کنارے محل جیسے مکانات اور تکون عبادت گاہیں تعمیر کیں۔ ہسپانوی فاتح "کورتے" اور اُس کے بعد آنے والے حکمرانوں نے اٹلی، فرانس اور اسپین سے ماہر تعمیرات بنا کر عمارتیں بنوائیں۔ فرانسیسی بادشاہ مکسی ملین کی ملکہ نے اس کی عظیم شاہراہ تعمیر کرائی جو "ریفارما" کے نام سے مشہور ہوئی، موجودہ دور میں وزیر تعمیرات نے اس شہر کے آثار قدیمہ کی طرف توجہ دی تو دوسری جانب اور جدید تقاضوں سے بھرپور بستیوں کی تعمیرات کیں۔

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS www.studyhall.xyz

خطوطِ غالب

سوال(۱): مندرجہ ذیل فقروں کے مفہوم کی وضاحت کیجیے۔

(الف) یہ ایک شیوہ فرسودہ ابنائے روزگار کا ہے۔

وضاحت: یہ زمانے کا پرانا دستور ہے کہ موت کے وقت کے سب رشتہ دار صبر کی تلقین کرتے ہیں۔

(ب) اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ "بے سروپا" کس کو کہتے ہیں تو میں کہوں گا مرزا یوسف کو!

وضاحت: مرزا غالب نے یہ جملہ اس لیے لکھا کہ مرزا یوسف کا ایک بیٹا اور باپ انتقال کر گئے، اس لیے ان کو "بے سروپا" یعنی بے یارو مددگار اور بے آسرا کہا۔

سوال(۲): مرزا غالب نے میر مہدی مجروح کو جو خط لکھا ہے، ان میں کون سے دو خاص اُمور کا ذکر کیا ہے؟

جواب: مرزا غالب نے میر مہدی مجروح کو جو خط تحریر کیا تھا، ان میں اپنی پنشن کے ملنے کا حال اور اپنی کتاب کے چھپنے کی روداد شامل ہے۔

سوال(۳): غالب نے مرزا یوسف کے والد کے انتقال پر جو تعزیت کی ہے، اس میں ان کی شوخی طبع کس طرح جھلکتی ہے؟

جواب: مرزا غالب کی تحریروں میں بے تکلفی اور ظرافت کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں مزاحیہ رنگ دلچسپی کا سبب بنتا ہے، مثلاً مرزا یوسف کے والد کے انتقال پر اس طرح تعزیت کر رہے ہیں کہ یہ دنیا کا پرانا دستور بن گیا کہ ہر مرنے والے پر اس کے رشتہ داروں کی صبر کی تلقین کریں گویا وہ زمانے کے اس تعزیت کے انداز پر طنز کر رہے ہیں، اسی طرح ان کے باپ اور بیٹے کے مرنے پر انہیں "بے سروپا" کا خطاب بھی دیتے نظر آرہے ہیں۔

سوال(۴): کہا جاتا ہے کہ مرزا غالب نے خط لکھنے کا ایک نیا پیرایہ اختیار کیا اور مراسلے کو مکالمہ بنادیا، بتایئے کہ کہاں تک درست ہے؟

جواب: یہ بلکل صحیح ہے۔ غالب نے پہلی بار اردو زبان میں طرزِ تحریر اختیار کیا، جس میں خط لکھنے والا اور پڑھنے والا آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر

رہے ہوں، غالب نے گفتگو کا انداز شامل کر کے خطوط نویسی میں ایک نیا رنگ پیدا کیا یعنی مراسلے (خط) کو مکالمہ (بات چیت) بنا دیا۔

خطوطِ اکبر

سوال(۱): اکبر الہ آبادی نے حبیب الرحمٰن شیر وانی کو جو خط تحریر کیا، ان میں کن باتوں کا ذکر کیا؟

جواب: اکبر الہ آبادی نے حبیب الرحمٰن شیر وانی کے خط میں ان کی ندوۃ العلماء لکھنؤ کی وابستگی کی تعریف کی ہے اور جو کتاب انہوں نے بھیجی تھی، اس کو بھی سراہا ہے۔

سوال(۲): اکبر الہ آبادی نے سید افتخار حسین کے نام جو خط تحریر کیا، اس میں کس بات پر اپنی مسرت کا اظہار کیا؟

جواب: اکبر الہ آبادی نے سید افتخار حسین کے نام جو خط تحریر کیا اس میں ان کی اعلیٰ عدالت کے رجسٹرار کی حیثیت سے ترقی پر خوشی کا اظہار کیا۔

JOIN FOR MORE!!!

سوال(۳): اس خط میں اکبر نے اپنی صحت اور دلی کیفیت کے متعلق جو لکھا ہے اسے بیان کیجئے۔

جواب: اکبر الہ آبادی نے اپنے اس خط میں اپنی صحت اور دلی کیفیات اس طرح ظاہر کیں، کہ میری عمر 75 سال کی ہو گئی، مختلف امراض کی وجہ سے اعصاب کی کمزوری کا شکار ہوں۔ موت کا وقت قریب آگیا ہے، اپنی لمبی عمر پر اکثر ہنسی آجاتی ہے۔

خطِ اقبال

سوال(۱): علامہ اقبال نے دہلی کو اسلامی شان و شوکت کا قبرستان کیوں کہا ہے؟

جواب: علامہ اقبال نے دہلی کو اس وقت دیکھا جب انگریزوں نے قبضہ کرنے کے بعد اسلامی شان و شوکت کی چیزوں اور عمارتوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ دہلی جہاں مغلیہ سلطنت کی شان و شوکت تھی۔ علامہ اقبال کے نزدیک اب اجڑے ہوئے قبرستان کا نظارہ پیش کر رہی تھی۔

M.HARIS BASIM www.studypak.xyz

سوال(۲): علامہ اقبال دہلی کس مقصد سے گئے تھے؟

جواب: علامہ اقبال نے حج بیت اللہ کا ارادہ کیا تھا، اسی وجہ سے دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاء کی زیارت سے اپنے اس سفر کا آغاز کیا۔

سوال(۳): حضرت محبوب الٰہی کے مزار مبارک کے متعلق علامہ اقبال کے کیا تاثرات تھے؟

جواب: علامہ اقبال کے تاثرات یہ تھے، اللہ اللہ حضرت محبوب الٰہی کا مزار بھی عجیب جگہ ہے، بس یہ سمجھ لیجئے کہ دہلی کی پُرانی سوسائٹی حضرت کے قدموں میں مدفون ہے۔

سوال(۴): علامہ اقبال نے خواجہ حسن نظامی کو خوش قسمت کیوں کہا؟

جواب: علامہ اقبال نے خواجہ حسن نظامی کو خوش قسمت اس لئے کہا کہ وہ دہلی جیسی خاموش اور عبرت انگیز جگہ میں قیام رکھتے ہیں۔

سوال(۵): علامہ اقبال نے کس کے متعلق کہا کہ وہ گنجِ معانی مدفون ہے جس پر دلّی کی خاک ہمیشہ ناز کرے گی؟

جواب: علامہ اقبال نے مرزاغالب کے مزار پر کھڑے ہو کر یہ جملہ ادا کیا کہ وہ گنجِ معانی مدفون ہے، جس پر دلّی کی خاک ہمیشہ ناز کرے گی۔

سوال(۶): علامہ اقبال کی آنکھیں کس بات پر پُرنم ہو گئی تھیں؟

جواب: علامہ اقبال کی آنکھیں اس وقت پُرنم ہو گئیں جب مرزاغالب کے مزار پر گانے والے لڑکے نے غالب کا یہ شعر پڑھا۔

وہ بادہ شبانہ کی سرمستیاں کہاں اُٹھیے! بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

سوال(۷): دلّی میں علامہ اقبال نے اور کن کن مزاروں پر حاضری دی؟

جواب: دہلی میں علامہ اقبال نے محبوبِ الٰہی رحمہ اللہ کے مزار کے علاوہ مرزاغالب شہنشاہِ ہمایوں اور دار اشکوہ کے مزارات پر بھی حاضری دی۔

JOIN FOR MORE!!!

سوال(۸): بمبئی شہر کے متعلق علامہ اقبال نے کن تاثرات کا اظہار کیا ہے؟

جواب: بمبئی شہر کے متعلق علامہ اقبال نے ان تاثرات کا اظہار کیا، بمبئی بڑا عجیب شہر ہے، بازار کشادہ، ہر طرف پختہ، سربفلک عمارتیں ہیں کہ دیکھنے والے کی نگاہ ان سے خیرہ ہو جاتی ہے، بازاروں میں گاڑیوں کی آمد و رفت اس قدر ہے کہ پیدل چلنا محال ہو جاتا ہے۔ یہاں ہر چیز مل سکتی ہے، یورپ، امریکا کے کارخانوں کی کوئی چیز طلب کرو، فوراََ ملے گی، ہاں البتہ ایک چیز ایسی ہے جو اس شہر میں نہیں مل سکتی یعنی فراغت۔

سوال(۹): فرانسیسی جہاز کی کن خصوصیات سے علامہ اقبال متاثر ہوئے؟

جواب: فرانسیسی جہاز میں صفائی اور عمدہ انتظامات پر علامہ اقبال بہت متاثر ہوئے۔

سوال(۱۰): جب جہاز سرزمینِ عرب کے قریب پہنچا تو علامہ اقبال کی دلی کیفیت کیا تھیں؟

جواب: جب جہاز سرزمینِ عرب کے قریب پہنچا تو علامہ اقبال کی دلی کیفیت اس شعر سے عیاں ہوتی نظر آتی ہے۔

اللہ رے خاکِ پاک، مدینہ کی آبرو خورشید بھی گیا تو ادھر سر کے بل گیا

M.HARIS www.studypk.xyz

سوال(۱۱): علامہ اقبال کے خط کی جن خوبیوں نے آپ کو متاثر کیا ہو، ان پر روشنی ڈالیے؟

جواب: علامہ اقبال کے خط کی نمایاں خوبیوں میں روانی، سادگی اور عمدہ اظہارِ بیاں موجود ہے۔ کیفیات کے اظہار میں بھی قدرت حاصل ہے، تاریخ کو اصلاحِ مستقبل کے لیے بیان کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کی شان و شوکت، عروج و زوال کی داستان کی جھلک بھی تو اُن کے خط میں نمایاں ہے۔

JOIN
FOR
MORE!!!
M.H
www.studypak.xyz

طریقۂ جواب سوال نمبر ۶: تعریفات

موزوں طریقہ: مندرجہ بالا تعریف کو تین حصوں پر مشتمل ہونا چاہیے۔

اوّل: تعریف: ۲ نمبر

دوم: شعری مثال: ۱ نمبر

سوم: شعری مثال کی وضاحت: ۱ نمبر

تعریف ذکر کر کے اس کی ایک شعری مثال دینا اور پھر اس مثال کی وضاحت کرنا نہایت ضروری ہے۔ اگر مثال ذکر کی گئی لیکن اس کی وضاحت نہ کی گئی تو نمبر منہا ہوں گے۔

جوابی خاکہ

تعریف:

شعری مثال:

وضاحت:

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS BASIM
www.studypak.xyz

گرامر کی اصطلاحات

(۱) مصرع:

مصرعے کے لغوی معنی ہیں "کواڑ"، یعنی دروازے کا ایک پٹ۔ شعر کی ایک سطر مصرع کہلاتی ہے۔ ایک شعر میں دو مصرعے ہوتے ہیں۔ دو پٹ مل کر ایک دروازہ بنتا ہے اسی طرح دو مصرعے مل کر ایک شعر بنتا ہے۔

مثال:

ے پیوستہ رہِ شجر سے امید بہار رکھ

ے گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں

ے بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ے شرم تم کو مگر نہیں آتی

ے نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم

(۲) شعر:

لفظ شعر "شعور" سے لیا گیا ہے۔ دراصل شعر وہ موزوں کلام ہے جو شاعر نے قصداً کیا ہو اور خیالات و جذبات کے اظہار کے لیے مناسب الفاظ سے آراستہ ہو۔ شعر دو مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

(۳) ردیف:

ردیف کے لغوی معنی ہیں **گھڑ سوار کے پیچھے بیٹھنے والا**۔ شعری اصطلاح میں ردیف سے مراد وہ لفظ یا الفاظ کا مجموعہ ہے جو غزل یا نظم کے ہر شعر کے آخر میں قافیے کے بعد مکرر آئیں اور بالکل یکساں ہوں۔

مثال(۱):

جذبۂ شوق کدھر کو لئے جاتا ہے مجھے

پردۂ راز سے کیا تم نے پکارا ہے مجھے

اس شعر میں **"ہے مجھے"** ردیف ہے کیونکہ یہ قافیہ کے بعد دہرایا جا رہا ہے اور تبدیل نہیں ہو رہا۔

مثال(۲):

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے

آخر اس درد کی دوا کیا ہے

اس شعر میں **"کیا ہے"** ردیف ہے۔

(۴) قافیہ:

قافیہ کے لغوی معنی ہیں **ہم آواز الفاظ**۔ شعری اصطلاح میں قافیے سے مراد وہ ہم آواز الفاظ ہیں جو غزل یا نظم کے ہر شعر کے آخر میں ردیف سے پہلے استعمال ہوں۔ غزل کے مطلع میں دونوں مصرعوں میں قافیہ ہوتا ہے اور باقی اشعار کے مصرعۂ ثانی میں قافیہ پایا جاتا ہے۔

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS BASIM
www.studypak.xyz

مثال(۱):

جذبۂ شوق کدھر کو لئے جاتا ہے مجھے
پردۂ راز سے کیا تم نے پکارا ہے مجھے

اس شعر میں **جاتا** اور **پکارا** قافیہ ہیں۔

مثال(۲):

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

اس شعر میں **ہوا** اور **دوا** قافیہ ہیں۔

(۵) صنعت تضاد:

اس صنعت کو صنعت تقابُل بھی کہتے ہیں۔ صنعت تضاد شاعری میں اس صفت کو کہتے ہیں جس کے ذریعے ایک شعر میں دو یا دو سے زائد ایسے الفاظ استعمال کئے جائیں جو اپنے مفہوم کے لحاظ سے ایک دوسرے کی ضد ہوں تو یہ خوبی صفتِ تضاد کہلاتی ہے۔ مثلاً: زمین اور آسمان اندھیرا اور اُجالا۔

JOIN FOR MORE!!!

مثال(۱):

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عُمر یونہی تمام ہوتی ہے

اس شعر میں **صبح** اور **شام** متضاد الفاظ ہیں اس لئے اس شعر میں صنعت تضاد استعمال کی گئی ہے۔

مثال(۲):

پھول محبت کے مشکل ہیں
کانٹے ہیں آساں سفر پر

اس شعر میں **پھول و کانٹے** اور **مشکل و آسان** آپس میں متضاد الفاظ ہیں۔

M.HARIS BASIM www.studypak.xyz

(۶) مطلع:

مطلع لفظ طلوع سے تعلق رکھتا ہے جس کے معنی ہیں **"طلوع ہونے کی جگہ"**۔ شعری اصطلاح میں غزل کے پہلے شعر کو مطلع کہا جاتا ہے۔ جس طرح سورج کے طلوع ہونے سے دن کا آغاز ہوتا ہے بالکل اسی طرح مطلع سے غزل کا آغاز ہوتا ہے۔ عام طور پر مطلع کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں۔ بعض اوقات غزل کے دوسرے شعر میں بھی یہی خوبیاں ہوتی ہیں اسے **"حُسنِ مطلع"** کہتے ہیں۔

مثال(۱):

ہے غلط گر گمان میں کچھ ہے
تجھ سوا بھی جہان میں کچھ ہے؟

مثال(۲):

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

(۷) مقطع:

مقطع لفظ قطع سے تعلق رکھتا ہے جس کے معنی توڑنا یا کاٹنا کے ہیں۔ شعری اصطلاح میں غزل کے آخری شعر کو مقطع کہا جاتا ہے۔

چونکہ مقطع پہ غزل کا اختتام ہوتا ہے اسی وجہ سے اسے مقطع کہا جاتا ہے۔ مقطع میں عام طور پر شاعر اپنا شعری نام بھی استعمال کرتا ہے جسے تخلص کہا جاتا ہے۔

مثال(۱):

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

مثال(۲):

وقت اچھا بھی آئے گا ناصرؔ
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

(۸) صفتِ تلمیح:

تلمیح کے لغوی معنی ہیں اِشارہ کرنا۔ شعری اصطلاح میں تلمیح سے مراد ہے کہ کلام کے دوران کسی تاریخی، سیاسی، اخلاقی یا مذہبی واقعے یا قرآنی آیت کی طرف اشارہ کیا جائے۔ تلمیح کے استعمال سے شعر کے معنوں میں وُسعت اور حسن پیدا ہوتا ہے۔ مطالعہ شعر کے بعد پورا واقعہ قاری کے ذہن میں تازہ ہو جاتا ہے۔

مثال(۱):

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نا ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

اس شعر میں اُس واقعے کی طرف اشارہ ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہِ طور پر چڑھ کر اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی خواہش کی تھی۔ اس خواہش کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے تجلّی ظاہر کی جس کی تاب نہ لاتے ہوئے آپ علیہ السلام بے ہوش ہوگئے اور کوہِ طور جل کر سیاہ ہو گیا۔

مثال(۲):

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

مندرجہ بالا شعر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ بادشاہ نمرود آپ علیہ السلام کو آگ میں جلا دینے کی دھمکی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے آگے سجدہ کرو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام غیر اللہ کے سامنے سجدہ کرنے کے بجائے آگ میں کود پڑتے ہیں اور یہ آگ آپ علیہ السلام کے لئے گلشن بن جاتی ہے۔

(۹) صفتِ مبالغہ:

مبالغہ کے لغوی معنی ہیں حد سے بڑھنا۔ شعری اصطلاح میں مبالغہ اس صفت کا نام ہے جس کے ذریعے کسی بات کو بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر بیان کیا جائے۔ اگر مبالغہ صحیح طور پر استعمال کیا جائے تو شعر کا حسن نکھر جاتا ہے۔

مثال(۱):

مینہ تو بوچھار کا دیکھا ہے برستے تم نے؟
اسی انداز سے تھی اشک فشانی اس کی

اس شعر میں میر نے رونے کو بارش کے مماثل قرار دینے کے لئے مبالغہ استعمال کیا گیا ہے جو درحقیقت ناممکن ہے۔

JOIN FOR MORE!!!

مثال(۲):

کل رات ہجرِ یار میں رویا میں اس قدر
چوتھے فلک پہ پہنچا تھا پانی کمر کمر

اس شعر میں شاعر نے آنسوؤں کے لئے مبالغہ استعمال کیا ہے اور ایسی بات بیان کی ہے جو حقیقتاً ممکن نہیں۔

(۱۰) تشبیہ:

تشبیہ کا تعلق لفظ مشابہت سے ہے جس کے معنی ہیں کسی خصوصیت میں ایک جیسا ہونا۔ اصطلاح میں تشبیہ سے مراد ہے کہ دو مختلف چیزوں کو کسی مشترکہ صفت کی بنیاد پر ایک دوسرے کی مانند قرار دیا جائے۔ اس سے کلام میں حسن، جدت اور نکھار پیدا ہو جاتا ہے۔

ارکانِ تشبیہ:

اراکینِ تشبیہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ **مشبّہ** : جس شے یا شخص کو تشبیہ دی جائے اسے **"مشبّہ"** کہتے ہیں۔

۲۔ **مشبّہ بہ** : جس شے یا شخص سے تشبیہ دی جائے اسے **"مشبّہ بہ"** کہتے ہیں۔

۳۔ **حرفِ تشبیہ** : تشبیہ دینے کے لئے جو حرف استعمال ہوتا ہے وہ **"حرفِ تشبیہ"** کہلاتا ہیں۔

۴۔ **وجہِ تشبیہ** : مشترک خوبی جو دونوں میں موجود ہو، یعنی جس کی وجہ سے تشبیہ دی جا رہی ہو اسے **وجہِ تشبیہ یا وجہِ شبہ** کہتے ہیں۔

مثال(۱):

مندرجہ ذیل شعر میں **آنسو** کو دریا سے تشبیہ دی ہے۔

امڈی آتی ہیں آج یوں آنکھیں
جیسے دریا کہیں مچلتے ہیں

اس شعر کے ارکانِ تشبیہ یہ ہیں۔

مشبّہ: آنسو، مشبّہ بہ: دریا، حرفِ تشبیہ: جیسے، وجہ تشبیہ: زیادتی بہاؤ۔

مثال(۲):

نازکی اس کی لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

اس شعر میں میرؔ محبوب کے ہونٹوں کو گلاب کی پنکھری سے تشبیہ دے رہے ہیں۔ ارکانِ تشبیہ یہ ہیں:

مشبّہ: محبوب کا لب، مشبّہ بہ: گلاب کی پنکھڑی، حرفِ تشبیہ: کی سی، وجہ تشبیہ: نازکی / گلابی رنگت۔

(۱۱) استعارہ:

استعارہ کے لغوی معنی ہیں ادھار لینا۔ شعری اصطلاح میں استعارہ وہ صفت ہے جس کے تحت کسی لفظ کو اس کے حقیقی معنوں سے ہٹ کر کسی اور شے سے مشابہت کی وجہ سے اس کے مجازی معنوں میں استعمال کیا جائے۔ جیسے بچے کو چاند یا بہادر شخص کو شیر کہہ دینا۔

اجزائے استعارہ:

استعارہ کے اجزاء درج ذیل ہیں۔

۱۔ **مستعار لہٗ** : وہ شخص یا چیز جس کے لیے کوئی لفظ مستعار (ادھار) لیا جائے۔

۲۔ **مستعار منہ** : وہ شخص یا چیز جسے مستعار (ادھار) لیا گیا ہو۔

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS www.studypak.xyz

۳۔ وجہ استعارہ : وہ مشترک خوبی جو **مستعار لہٗ** اور **مستعار منہ** دونوں میں پائی جاتی ہو۔

مثال(۱):

پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا
شاید کہ مرا حال اسے یاد نہ آیا

اس شعر میں صیاد اپنے حقیقی معنوں سے ہٹ کر استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد محبوب ہے، محبوب کے لیے صیاد کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔ اس شعر کے اجزائے استعارہ یہ ہیں:

مستعار لہٗ: محبوب، مستعار منہ: صیاد، وجہ استعارہ: ظلم وستم

مثال(۲):

مرے خورشید کہیں تو بھی اٹھا اپنی نقاب
بہر نظارہ تڑپتی ہے نگاہِ بیتاب

اس شعر کے پہلے مصرعے میں استعارہ استعمال کیا گیا ہے اور محبوب کے لئے خورشید (سورج) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

(۱۲) سہل ممتنع:

شعر میں کسی بات یا خیال کو سادہ ترین الفاظ میں اس طرح بیان کرنا کہ وہ بات نثر میں بھی اتنی سادگی اور صفائی سے پیش نہ کی جاسکے شاعرانہ اصطلاح میں "سہل ممتنع" کہلاتا ہے۔

مثال(۱):

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مثال(۲):

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

(۱۳) صنعت تعلّی:

جب شاعر کسی شعر میں اپنے یا اپنی شاعری کے بارے میں مبالغہ آرائی سے کام لے تو شاعرانہ اصطلاح میں اس عمل کو صنعت تعلّی کہا جاتا ہے۔

مثال(۱):

پھولے گا اس زبان میں گلزارِ معرفت
یاں میں زمینِ شعر میں وہ تخم بو گیا

مثال(۲):

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

(۱۴) صفتِ تجنیس:

کلام میں دو یا دو ایسے الفاظ ذکر کرنا جن کا تلفظ ایک جیسا ہو لیکن معانی مختلف ہوں، اسے صفتِ تجنیس کہا جاتا ہے۔

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS www.studypak.xyz

مثال(۱):

جلتے ہیں جبریل کے پر جس مقام پر
اس کی حقیقتوں کے شناسا تم ہی تو ہو

اس شعر کے پہلے مصرعے میں لفظ "پر" دو دفعہ مذکور ہے اور دونوں مقامات پہ اس کے معنی مختلف ہیں۔

مثال(۲):

نہیں حق سے کچھ اس محبت کو بہرہ
کہ جو تم کو اندھا کرے اور بہرا

اس شعر کے پہلے مصرعے میں "بہرہ" اور دوسرے مصرعے میں "بہرا"، کا تلفظ ایک جیسا ہے لیکن معانی مختلف ہیں۔

JOIN
FOR
MORE!!!
M.HARIS BASIM
www.studypak.xyz

محاورات

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS BASIM
www.studypak.xyz

اور

اصنافِ سخن

محاورات

محاورات	معانی	جملے
آنکھیں کھل جانا	عبرت حاصل ہونا	استاد کی نصیحتیں سن کر تمام طلبہ کی آنکھیں کھل گئیں۔
آنکھیں موند لینا	آنکھیں بند کر لینا/مر جانا	ہر انسان کو والدین قدر جان لینی چاہیے، اس سے پہلے کہ وہ آنکھیں موند لیں۔
آنکھوں میں خون چڑھ جانا	غصہ آنا	خالد کے دوست نے اسے گالی دی تو اس کی آنکھوں میں خون چڑھ گیا۔
آفتاب پر خاک ڈالنا	ناممکن کام کرنا	مسلمانوں کو میدانِ جنگ میں شکست دینا آفتاب پر خاک ڈالنا ہے۔
اپنے حال میں مست ہونا	ہر حال میں خوش رہنا/ اپنے آپ میں مگن رہنا	پاکستان کے اربابِ اقتدار اپنے حال میں مست ہیں، انھیں اہلِ وطن کی کچھ فکر نہیں۔
بے باک ہو جانا	بے خوف ہونا/ نڈر ہونا	آج کی نوجوان نسل اس درجہ بے باک ہو چکی ہے کہ اسے قانون تو کیا خدا کا بھی خوف نہیں۔
بخت سو جانا	قسمت خراب ہونا	جو لوگ محنت نہیں کرتے ان کا بخت سو جاتا ہے۔
بہروپ بدلنا	بھیس بدلنا	پرانے مسلمان بادشاہ بہروپ بدل کر مسلمانوں کے احوال جانا کرتے تھے۔
پیچ و تاب کھانا	بے چین ہونا	شادی کی تقریب میں فضول رسومات دیکھ کر میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔
تن بدن میں آگ لگنا	سخت غصہ آنا	فیل بچے کا نتیجہ دیکھ کر والدین کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔
ترس کھانا	رحم کرنا/رحم آنا	غریبوں اور مفلوک الحال لوگوں پر ترس کھانا ہر مسلمان کا اخلاقی فریضہ ہے۔
تین پانچ کرنا	جھگڑا کرنا/دھوکا دینا	سنو! مجھ سے زیادہ تین پانچ کرنے کی ضرورت نہیں۔
جی جل جانا	غصہ آنا	حامد کی زبان سے اپنے استاد کی برائی سن کر میرا جی جل گیا۔
چاروں طرف اندھیرا چھا جانا	ہر طرف اندھیرا چھا جانا/ پریشانی ہونا	اپنے شوہر کی وفات کی خبر سن کر سعیدہ کے چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔
خاک میں ملانا	ضائع کرنا	تمہاری لاپرواہی نے میری ساری محنت خاک میں ملا دی۔
دیوار بن جانا	رکاوٹ بننا	مسلمانوں کو اپنے دشمن کے راستے کی دیوار بن جانا چاہیے۔
رام کرنا	راضی کرنا/منا لینا	کچھ لوگ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے ہر شخص کو رام کر لیتے ہیں۔
رخ کرنا	توجہ کرنا	انسان کو کسی بھی حالت میں برائیوں کی طرف رخ نہ کرنا چاہیے۔
زخموں پر نمک چھڑکنا	تکلیف پر تکلیف دینا	تم نے گڑے مردے اکھاڑ کر مرے زخموں پر نمک چھڑک دیا۔
زبانی جمع خرچ کرنا	صرف باتیں ہی باتیں کرنا	آج کل بہت سے تعلیمی ادارے صرف زبانی جمع خرچ کر رہے ہیں۔
زندہ در گور کرنا	سخت مصیبت میں مبتلا کرنا	تم نے مجھ پر چوری کا الزام لگا کر مجھے زندہ در گور کر دیا۔
سبز باغ دکھانا	دھوکہ دینا/ جھوٹی امیدیں دلانا	ناکامی کے دلدل میں پھنسے انسان کو سبز باغ نہیں دکھانا چاہیے۔

سپید وسیاہ میں دخل ہونا	پورا پورا اختیار ہونا	حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی کائنات کے سپید وسیاہ کا مالک ہے۔
سٹی گم ہونا	گھبرانا/ بوکھلانا	والدہ کی طبیعت کی ناسازی دیکھ کر اس کی سٹی گم ہو گئی۔
قہقہہ لگانا	زور سے ہنسنا	نماز کی حالت میں قہقہہ لگانے سے نماز اور وضو دونوں ٹوٹ جاتے ہیں۔
طاق نسیاں ہونا	بھول جانا	ماضی کے ناخوشگوار واقعات کا طاق نسیاں ہو جانا بھی اک نعمت ہے۔
کام تمام کرنا	مار ڈالنا/ ہلاک کرنا	احمد نے ایک ہی وار میں سانپ کا کام تمام کر دیا۔
گھر پورا کرنا	گھر کی ضرورتیں پوری کرنا	کم آمدنی والے لوگوں کے لیے گھر پورا کرنا دشوار ہو گیا ہے۔
گزر اوقات کرنا	زندگی گزارنا/ گزارہ کرنا	آج کل مہنگائی کی وجہ سے گزر اوقات کرنا مشکل ہو گیا ہے۔
لینا دینا	لین دین/ حساب کتاب	شعب ابی طالب میں قریش نے بنو ہاشم کے ساتھ ہر طرح کا لینا دینا بند کر دیا تھا۔
ہاتھ ڈالنا	دخل دینا/ کام اپنے ذمے لینا	ملازم پیشہ لوگ کاروبار میں ہاتھ ڈالنے سے ڈرتے ہیں۔
ہاتھ پھیلانا	دستِ سوال دراز کرنا/ مانگنا	اسلام نے دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے سے منع کیا ہے۔
ہاتھوں کے طوطے اڑنا	سخت گھبرا جانا/ بدحواس ہونا	کرایہ دیتے وقت اپنی کٹی جیب دیکھ کر اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS BASIM
www.studypak.xyz

اصنافِ سخن

(۱) مضمون:

کسی موضوع کو دلیلوں، مثالوں اور حوالوں سے تشریح و توضیح کے ساتھ مناسب ترتیب اور موزوں الفاظ میں پیش کرنا مضمون کہلاتا ہے۔ مضمون کئی طرح کے ہو سکتے ہیں، جیسے کہ ادبی مضامین، اخلاقی مضامین اور تاریخی مضامین وغیرہ۔

مضمون کی اقسام:

نفسِ مضمون کے لحاظ سے مضمون کی تین اقسام ہو سکتی ہیں:

1. بیانیہ: سوانح، تاریخی واقعات، حادثات وغیرہ۔
2. فکریہ: فکری اور استدلالی موضوعات، اخلاقیات، مباحث وغیرہ۔
3. تعریفیہ: کسی جگہ یا چیز یا مناظرِ قدرت سے متعلق۔

مضمون کے مدارج:

مضمون ہمیشہ تین حصوں پر مشتمل ہوتا ہے:

1. تمہید: مضمون کی تمہید نہایت مختصر اور جامع ہونی چاہیے۔
2. نفسِ مضمون: اس حصے کو تمام مضمون میں مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔
3. خاتمہ: اختتامیہ نہایت مؤثر اور دل پذیر ہونا چاہیے۔

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS
www.studypark.xyz

(۲) ناول:

ناول اطالوی زبان کے لفظ "Novella" سے نکلا ہے۔ اردو میں ناول انگریزی کے وسیلے سے آیا ہے۔ اس کے معنی نیا اور عجیب کے ہیں۔ لیکن صنفِ ادب میں ناول ان قصوں کو کہا جاتا ہے جن میں "داستان" کی طرح فرضی اور مافوق الفطرت واقعات پیش کرنے کے بجائے انسانی زندگی میں روزانہ پیش آنے والے معاملات اور واقعات کو دلچسپ انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ ناول کی اگر جامع تعریف کی جائے تو وہ کچھ یوں ہو گی کہ:

"ناول ایک نثری قصہ ہے جس میں پوری ایک زندگی بیان کی جاتی ہے۔"

ناول کے عناصرِ ترکیبی میں کہانی، پلاٹ، کردار، مکالمے، زماں و مکاں، اسلوب، نکتہ نظر اور موضوع وغیرہ شامل ہیں۔ اردو نثر کو ناول نگاری سے روشناس کرانے کا سہرا ڈپٹی نذیر احمد کے سر ہے جنھوں نے "مراۃ العروس، توبۃ النصوح، ابن الوقت اور فسانہ مبتلا" جیسے اصلاحی ناول لکھے۔

(۳) سفر نامہ:

لفظ سفر نامہ عربی زبان سے ماخوذ لفظ "سفر" کے ساتھ فارسی لفظ "نامہ" لگانے سے مرکب "سفر نامہ" بنا۔ "سفر" کوچ کرنے اور اپنے مقام سے کسی اور جگہ جانے کو کہتے ہیں اور "نامہ" خط کو کہا جاتا ہے، جس کے معنی روزنامچہ یا ڈائری کے ہیں۔

سفر نامہ کا مفہوم یہ ہے کہ دورانِ سفر مسافر جن حالات سے دوچار ہوتا ہے اور جو کوائف اس کو پیش آتے ہیں انھیں وہ صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتا ہے، دوسروں کو اپنے حالات سے باخبر کرتا ہے، کبھی اپنے حالاتِ سفر کو جمع کرتا ہے اور اس کو شائع کر دیتا ہے۔ اردو کا سب سے پہلا باقاعدہ سفر نامہ یوسف خان کمبل پوش کا "تاریخِ یوسفی" معروف بہ "عجائبات فرنگ" ہے۔

سفر نامے کے مدارج:

عموماً سفر نامہ کے تین مراحل ہوتے ہیں:

1. انتخاب واقعات کہ کون سے واقعات بیان کئے جائیں اور کسے نظر انداز کر دیا جائے۔
2. واقعات کی پیش کشی کہ کس طرح واقعے کو پیش کیا جائے۔
3. تیسرا مرحلہ زبان و بیان کا ہے، زبان و بیان، خیال و واقعات سے مناسبت رکھتے ہوں، اسلوب میں تازگی و شگفتگی ہو، اگر سفر نامہ ادب و انشاء سے خالی ہو تو وہ صرف ایک سفری تحریر ہو گی، سفر نامہ شمار نہیں ہو گا۔

(۴)خطوط:

خط کو مکتوب بھی کہا جاتا ہے۔ مکتوب جو لوگ ایک دوسرے سے فاصلوں پر رہتے ہیں، تبادلہ ءخیال کے لیے اور خیریت جاننے کے لیے بے چین رہتے ہیں۔ ماضی میں نظروں سے دور رہنے والوں کے آپسی تبادلہ ءخیال کا ایک ہی ذریعہ خط تھا۔ مختلف النوع جذبات، احساسات، خیالات اور اطلاعات تحریر کر کے ترسیل کا انتظام کرنا مکتوب نگاری کی خصوصیات ہیں۔

خط لکھنے والے کو مکتوب نگار اور جس کے نام خط لکھا جائے اسے مکتوب الیہ کہا جاتا ہے۔ خط کی تین قسمیں ہوتی ہیں:

1۔ نجی خطوط 2۔ کاروباری خطوط 3۔ سرکاری خطوط

JOIN FOR MORE!!!

خط کے حصے:

عموماً ایک خط مندرجہ ذیل حصوں پر مشتمل ہوتا ہے:

1. مقام روانگی اور تاریخ
2. القاب
3. آداب و تسلیمات
4. خط کا مضمون
5. اختتامِ مکتوب
6. مکتوب نگار کا نام اور پتہ
7. مکتوب الیہ کا پتہ

M.HARIS BASIM www.studyfan.xyz

(۵)حمد:

حمد ایک عربی لفظ ہے، جس کے معنی "تعریف کرنے" کے ہیں۔ اصطلاح میں حمد اس نظم کو کہتے ہیں جس میں اللہ کی صفات اور عظمت و قدرت کا بیان ہوتا ہے اور اس کی ہمہ پہلو تعریف کی جاتی ہے۔ خدا کی حمد و ثناء اسی قدر مختلف و متنوع ہے جس قدر یہ کائنات وسیع ہے۔ حمد باری تعالیٰ کے لیے کوئی خاص وزن یا بحر مقرر نہیں، یہ کسی بھی وزن میں بیان کی جاسکتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ:

- تعریف رسمی نہ ہو بلکہ عشق خداوندی میں ڈوب کر کہی جائے۔
- الفاظ پاکیزہ اور شستہ ہوں۔
- ادب و احترام کا خاص لحاظ رکھا جائے۔
- حمد و ثناء کے ساتھ ساتھ خیر و عافیت مانگی جائے۔

حمد اردو شاعری کی قدیم ترین صنف ہے۔ حمد باری تعالیٰ ہر زبان میں اور ہر مذہب میں پائی جاتی ہے۔

(۶)نعت:

نعت عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لفظی معنی تعریف بیان کرنے کے ہیں۔

پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مدحت، تعریف و توصیف، شمائل و خصائص کے نظمی اندازِ بیاں کو نعت یا نعت خوانی یا نعت گوئی کہا جاتا ہے۔ عربی زبان میں نعت کے لیے لفظ "مدحِ رسول" استعمال ہوتا ہے۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں بہت سے صحابہ کرام نے نعتیں لکھیں اور یہ سلسلہ آج تک جاری و ساری ہے۔ نعت لکھنے والے کو نعت گو شاعر جبکہ نعت پڑھنے والے کو نعت خواں یا ثناء خواں کہا جاتا ہے۔ حمد کی طرح نعت کی بھی کوئی خاص ہیئت مقرر نہیں ہے البتہ نعت گو شاعر کے لیے ضروری ہے کہ:

- تعریف رسمی نہ ہو بلکہ عشق رسول ﷺ میں ڈوب کر کہی جائے۔
- الفاظ پاکیزہ اور شستہ ہوں۔
- ادب و احترام کا خاص لحاظ رکھا جائے۔
- غلو سے کام نہ لیا جائے۔

نعت بھی اردو شاعری کی قدیم ترین صنف ہے۔ تقریباً تمام شعراء نے مدحت رسول ﷺ بیان کی ہے۔ مولانا ظفر علی خان کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے جنھیں "نعت گو شاعر" کہا جاتا ہے۔

JOIN FOR MORE!!!

(۷)غزل:

غزل اس آواز کو کہا جاتا ہے جو ہرن کے گلے سے اس وقت نکلتی ہے جب وہ شیر کے خوف سے بھاگ رہی ہوتی ہے۔ قدیم زمانے میں عورتوں سے باتیں کرنے کو غزل کہا جاتا تھا۔ اصطلاحِ شاعری میں غزل سے مراد وہ صنفِ نظم ہے جس کا ہر ایک شعر الگ مضمون کا حامل ہو اور اس میں عشق و عاشقی کی باتیں بیان ہوئی ہوں خواہ وہ عشق حقیقی ہو یا عشق مجازی۔ لیکن آج کل غزل میں عشق و عاشقی کے علاوہ دنیا کا کوئی بھی موضوع زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ اس کا آغاز فارسی زبان سے ہوتا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں اسکے عربی زبان سے تعلق سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ عربی صنف قصیدہ میں موجود تشبیب سے ہی غزل کی ابتداء ہوئی۔

غزل کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف یا صرف ہم قافیہ ہوتے ہیں اور باقی اشعار میں سے دوسرا مصرع قافیہ میں پہلے شعر کی پابندی کرتا ہے۔ آخری شعر میں عام طور پر شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے، اسے مقطع کہا جاتا ہے۔ غزل کے اشعار میں موضوع کے حوالے سے کوئی ربط نہیں ہوتا اور ہر شعر کا موضوع اور مطلب الگ الگ ہوتا ہے۔

M.HARIS

(۸)نظم:

نظم ایک نہایت بسیط و وسیع اصطلاح ہے۔ اس کے لغوی معنی "موتی پرونا، آراستہ کرنا" وغیرہ ہیں۔ اصطلاحاً نظم ایسی صنفِ سخن ہے جو کسی بھی موضوع کو تسلسل سے بیان کرتی ہے جس میں موضوع یا عنوان کی تفصیل ہوتی ہے۔ یہ کسی خاص موضوع پر لکھی جاتی ہے۔

اس لحاظ سے نظم کا میدان غزل سے زیادہ وسعت رکھتا ہے۔ غزل کا ایک شعر ایک ہی جذبہ کو بیان کرتا ہے مگر نظم میں موضوع کی پوری وضاحت ہوتی ہے۔ نظم وہ صنفِ سخن ہے جس کی مثالیں دکن کے پہلے صاحبِ کلیات شاعر قلی قطب شاہ سے لے کر عہد جدید تک کثرت سے ملتی ہے۔ نظیرؔ اکبر آبادی نے جدید نظم نگاری کی ابتدا کی لیکن اس کو ترقی اور استحکام محمد حسین آزادؔ، حالیؔ، اسماعیل میرٹھی وغیرہ کے ہاتھوں ملا۔

نظم کی اقسام:

نظم کی مختلف اقسام ہیں۔ جن میں:

مرثیہ مثنوی مسدس مخمس

آزاد نظم گیت قصیدہ رباعیات وغیرہ شامل ہیں۔

مشہور نظمیں:

اردو میں بہت سی نظمیں مشہور ہیں لیکن مندرجہ ذیل نظمیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

- آدمی نامہ، ہنس نامہ (نظیرؔ اکبر آبادی)
- شکوہ، جواب شکوہ (ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؔ)
- مسدس مدوجزرِ اسلام (الطاف حسین حالیؔ)
- شاہنامۂ اسلام (حفیظؔ جالندھری)

(۹) مرثیہ:

لفظ مرثیہ عربی لفظ 'رثا' سے مشتق جس کے معنی ہیں کسی کی وفات پر رنج و غم ظاہر کرنا اور رونا۔ اردو شاعری کی ایک صنف کی حیثیت سے کسی بھی عزیز کی وفات پر اظہار غم سے متعلق نظم کو مرثیہ کہا جا سکتا ہے۔

مرثیہ کی صنف عربی سے فارسی اور فارسی سے اردو میں آئی۔ اُردو میں مرثیہ کی ابتداء دکن سے ہوئی۔ اردو کا سب سے پہلا مرثیہ گو شاعر دکنی شاعر ملا وجہی کو سمجھا جاتا ہے۔ لکھنؤ میں اس صنف کو مزید ترقی ملی اور میر انیسؔ اور میر دبیرؔ جیسے شعراء نے مرثیہ کو اعلیٰ مقام عطا کیا۔ اردو اور فارسی میں مرثیہ کی صنف زیادہ تر اہل بیت یا واقعہ کربلا کے لیے مخصوص ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بھی بہت سی عظیم شخصیات کے مرثیے لکھے گئے ہیں۔

مرثیہ کے اجزاء:

بنیادی طور پر ایک روایتی مرثیہ اپنی ترکیب میں مندرجہ ذیل اجزاء کا حامل ہوتا ہے۔

۱۔ تمہید ۲۔ چہرہ ۳۔ سراپا ۴۔ رخصت ۵۔ آمد
۶۔ رَجز ۷۔ جنگ ۸۔ شہادت ۹۔ دعا

ہیئتِ مرثیہ:

مرثیہ کی صنف کو شعری ہیئت کے لحاظ سے قطعات، مسدّس اور مخمس کی صورت میں لکھنے کا رواج دبستانِ لکھنؤ کے مشاہیر نے قائم کیا تھا۔ میر انیس کی ولادت سے پہلے اُن کے والد کے ایک ہم عصر شاعر میر ضمیر کے ایک مسدس میں یہ دعویٰ موجود ہے کہ مرثیہ کو مروّجہ ہیئت میں لکھنے کی طرح انہوں نے ڈالی۔

☆......☆......☆

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS
www.studypak.xyz

JOIN FOR MORE!!
M.H
www.studypak.xyz

طریقۂ جواب سوال نمبر ۹: مصنف کے طرزِ تحریر کی خصوصیات

۱۵ نمبر کے اس سوال کے جواب کے لیے صدرِ ممتحن کے ہدایت ناموں کو پیشِ نظر رکھا جائے تو اُن کا حاصل درج ذیل ہو گا:

(الف) عمدہ تمہید:

(ب) دس سے بارہ خصوصیات، تکرار نہ ہو، ہر خصوصیت کی وضاحت کے لیے مناسب الفاظ (مگر شعری مثال کی طرز پر نثری ٹکڑے تحریر کرنے کی ضرورت نہیں)

(ج) تین، چار مستند ناقدین کی آراء۔

جوابی خاکہ

ابتدائیہ:

______

______

______

کلام کی خصوصیات:

۱۔ ______

______

______

______

۲۔ ______

______

______

______

۳۔ ______

______

______

ناقدین کی آراء:

۱) ______

"______"

۲) ______

"______"

۳) ______

"______"

JOIN FOR MORE!!!

نثر نگاری پر تبصرہ

مولانا محمد حسین آزاد

حالاتِ زندگی:

آزاد ۱۸۲۳ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد باقر تھا جن کے استاد ذوق سے بہت قریبی تعلقات تھے۔ آزاد نے ان کی ہی زیرِ نگرانی تربیت پائی۔ ان کے والد محمد باقر نے دہلی میں اردو کا سب سے پہلا اخبار نکالا تو تعلیم و تربیت اور ذوق کی شاگردی نے آزاد کو اور پختہ کر دیا۔

طرز تحریر کی خصوصیات:

اردو نثر نگار میں آزاد ایک بلند اور منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ایک صاحب طرز انشاء پرداز ہیں ان کی تحریر میں بلا کی سادگی، بے تکلفی انگریزی کی صاف گوئی، فارسی کی شیرینی، حسن اور خوبصورتی پائی جاتی ہے۔ ان کی نثر میں موسیقیت پائی جاتی ہے۔ وہ الفاظ اور محاورہ کے استعمال میں توازن اور تناسب کا خیال رکھتے ہیں۔ ان کی تحریریں تصنع اور تکلف سے پاک ہیں۔ ان کی طبیعت میں ندرت طرازی ہے۔ لطیف تشبیہات اور استعارے ان کی تحریر کے حسن کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ آزاد کے طرزِ نگارش کی ایک اہم خصوصیت ہے کہ ان کی تحریر پہلو دار ہوتی ہے۔

(۱) تذکرہ نگاری:

آب حیات میں آزاد نے شعر کی زندگی اور ان کی شاعری پر روشنی ڈالی وہ تذکرہ سے زیادہ تاریخ ہے۔ آب حیات اردو زبان اور شاعری کا اہم ماخذ ہے اور اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے پہلی بار زبان کے مزاج اور اس کی قدیم تاریخ کا سراغ لگانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

(۲) ندرتِ خیال:

اردو میں تمثیل نگاری کی طرف بہت توجہ دی گئی ہے۔ اس کے جو نمونے ملتے ہیں ان میں مندرجہ ذیل شامل ہیں:

☆ قصہ گل بکاولی ☆ سب رس ☆ گلزار ابراہیم ☆ جہادِ اکبر

یہ تمام فارسی تمثیلات سے مشابہ اور مماثلت رکھتی ہیں۔ موضوعات کے اعتبار سے بھی ان میں کوئی فرق نہیں ہے سب ہی میں تصوف اور متعلقات تصوف کو تمثیلاً بیان کیا گیا ہے۔ آزاد نیرنگِ خیال اردو کی پہلی تمثیل ہے جس کا موضوع تصوف نہیں ہے بلکہ اس میں دیگر مباحث اور مسائل کو حسین اور دلکش انداز پیش کیا گیا ہے۔

(۳) بحیثیت مؤرخ:

"دربارِ اکبر" عہد اکبری کی تاریخ ہے۔ جس میں بادشاہ کی ذاتی، درباری، آئینی اور ملکی حالات، سلطنت کے خاص امراء و عمائدین اور علماء وغیرہ کے حالات بڑی تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ آزاد نے اکبر کے دین الٰہی اور علماء کی توہین کو بہت سراہا ہے اس کے علاوہ ان کی زبان کی رنگینی اور تخیل کی پرواز نے دربارِ اکبر کو تاریخ سے زیادہ افسانہ بنا دیا ہے۔

(۴) سخن دانِ فارس:

آزاد کی اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے میں فارسی زبان کی اصل ساخت کو بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں ایران کی آب و ہوا اور وہاں کی تہذیب و تمدن، شاعروں اور مصنفوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے اردو میں اس موضوع پر کوئی کتاب موجود نہ تھی لیکن اس میں بھی

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS...
www.studyplan...

آزاد کی رنگینیٔ تحریر موجود ہے۔

(۵) انگریزی الفاظ:

آزاد نے جہاں اپنی تحریروں میں عربی، فارسی اور ہندی کے الفاظ بیان کئے ہیں وہاں انگریزی سے بھی بے تکلف فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے لیکن وہ بلاضرورت نہ انگریزی الفاظ استعمال کرتے ہیں نہ عربی، بلکہ اس خوبصورتی سے استعمال کرتے ہیں کہ وہ اردو زبان کے الفاظ ہی معلوم ہوتے ہیں اور پڑھتے وقت کیف سرور محسوس ہوتا ہے۔ بقول رام بابو سکینہ:

"آزاد کی نثر میں بھاشا کی سادگی، انگریزی کی صاف گوئی اور فارسی کا حسن موجود ہے۔"

(۶) لفظی صنعت گری:

خوبصورت تشبیہات، لطیف استعارے اور موسیقیت سے بھرے جملے اس قدر حقیقت کا ثبوت بن کر سامنے آتے ہیں کہ آزاد کو لفظی صنعت گری کا خاص مقام حاصل ہے۔

"مشرق کا شہسوار ستاروں کی فوج کو شکست دے کر شعاع کا نیزہ ہاتھ میں لئے نکلا۔"

(۷) تخیل کا غیر معتدل استعمال:

آزاد کی بڑی کمزوری تخیل کا غیر معتدل اور بے جا استعمال ہے۔ وہ ہر بات کو شاعرانہ انداز میں بیان کرکے تخیل کے زور سے طلسماتی بنا دیتے ہیں۔ اس پڑھنے والے کو لطف تو ضرور آتا ہے مگر بعض اوقات وہ حقیقت سے بہت دور جا پہنچتا ہے۔

(۸) تمثیل نگاری:

ان کے اسلوب کی ایک نمایاں خصوصیت تمثیل نگاری ہے۔ آزاد کو اردو کا سب سے بڑا تمثیل نگار گردانا جاتا ہے۔ آزاد کی تمثیل نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے حالی نے لکھا ہے:

"ہمارے ملک میں موجودہ حالت میں نیرنگ خیال ایک ایسا نمونہ ہے کہ اگر میری رائے غلط نہیں تو زمانہ آئندہ اس کی قدر نہیں بلکہ پیروی کرے گا"

JOIN FOR MORE!!!

(۹) مرقع نگاری:

آزاد مرقع نگاری میں کمال رکھتے ہیں جو خیال ان کے ذہن میں آتا ہے وہ سلسلہ وار تصویر کے روپ میں آتا ہے۔ مرقع کشی کے اس شوق نے ایک وطیرہ کی شکل اختیار کرلی تھی وہ اس انداز سے چھوٹے چھوٹے چبھتے ہوئے فقرے تراشتے ہیں کہ ان کو "آزرِ سخن" کا لقب زیب دیتا ہے۔ ان کی بت تراشی کے نمونے 'آب حیات' اور 'نیرنگ خیال' میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر سید عبد اللہ:

"آزاد بحیثیت مرقع نگار اردو کے اولین آدمی ہیں اور ممتاز ترین بھی۔"

(۱۰) مشکل پسند:

آزاد کی تحریر پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کافی مشکل پسند ہیں۔ وہ اپنی تحریر کو تمثیل نگاری اور تخیل کے استعمال کے ذریعے مشکل بناتے ہیں جس کو سمجھنا آسان نہیں ہوتا۔

"شام نے آکر اندھیرے کی سپر بیچ میں رکھ دی۔"

(۱۱) دیگر زبانوں کے الفاظ:

محمد حسین آزاد کی تحریروں میں عربی اور فارسی کے ساتھ ساتھ انگریزی کے الفاظ بھی بکثرت ملتے ہیں لیکن ان الفاظ سے تحریر میں کوئی مشکل

پیدا نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ تحریر کے حسن میں اضافہ ہوجاتاہے۔ اس سے عربی، فارسی اورانگریزی زبانوں پر ان کے عبور کا اظہار ہوتا ہے۔ آزاد کی تحریر کی یہ بڑی خوبی ہے کہ ان زبانوں کے الفاظ کا استعمال انھوں نے اس انداز سے کیا کہ وہ غیر ضروری نہیں لگتے بلکہ لازمی محسوس ہوتے ہیں۔

ناقدین کی آراء:

☆.... شبلی نعمانی نے آزاد کو اردوئے معلی کا ہیر و کہاہے اور آزاد کے انتقال پر شبلی نے ان کو خدائے اردو کہہ کر یاد کیا:

"وہ تحقیق کا مردِ میدان نہیں تاہم ادھر ادھر کی گپیں ہانک دیتاہے تو وحی معلوم ہوتی ہیں۔"

☆....ڈاکٹر سید عبد اللہ کہتے ہیں:

"سر سید سے معقولات الگ کر لیجئے تو کچھ نہیں رہتے، نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے۔ شبلی سے تاریخ لے لیجئے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے، حالی بھی جہاں تک نثر نگاری کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ لیکن آقائے اردو یعنی پروفیسر آزاد ایسے انشاء پرداز ہیں جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں۔"

☆.... بقول حالی: ؎

تاریخ وفات اس کی جو پوچھے کوئی حالیؔ
کہہ دو کہ ہوا خاتمہ اردو کے ادب کا

☆....رام بابو سکسینہ محمد حسین آزاد کی تحریر پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

"آزاد اپنے زمانے کے بے مثال انشاء پرداز تھے۔ جس چیز نے ان کو زندہ اور جاوید کر دیا وہ ان کا خاص طرزِ تحریر ہے"۔

☆....ڈاکٹر اسلم فرّخی اپنے مقالے میں لکھتے ہیں

"آزاد نے الفاظ کے آب و رنگ سے جو تصویریں آراستہ کی ہیں وہ اتنی پُر کار اور دلآویز ہیں کہ اردو نثر میں ان کی نظیر کہیں اور نہیں ملتی"

☆......☆......☆

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS
www.studypak.xyz

علامہ شبلی نعمانی

تعارف:

مشرقی یوپی کے ضلع اعظم گڑھ کے ایک معمولی گاؤں میں ۱۸۶۷ء میں وہ بچہ پیدا ہوا جسے آگے چل کر شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ شبلی نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی اور مزید تعلیم کا شوق انھیں ملک کے مختلف مقامات پر لے گیا۔

شبلی نے مختلف موضوعات پر کثیر تصانیف چھوڑی ہیں، جن میں سے مشہور ترین یہ ہیں:

(۱) المامون (۲)الغزالی (۳)شعر العجم (۴)سیرۃ النبی ﷺ (۵)الفاروق

اس کے علاوہ فارسی اور اردو کے مجموعہ ہائے کلام، مضامین و مقالات کی کئی جلدیں اور دو ایک عربی تصانیف بھی ان کی یادگار ہیں۔

طرزِ تحریر:

انیسویں صدی اردو زبان کی بقاء اور زندگی کا پیغام لے کر آئی۔ اس صدی میں بڑے بڑے شاعر ادیب اور انشاء پرداز پیدا ہوئے۔ غالب، مومن، ذوق اور انیس وغیرہ نے اردو زبان کی آبیاری کی انہی کے ساتھ ساتھ اردو کے عناصر خمسہ سر سید، نذیر احمد، آزاد، حالی اور شبلی نے

آنکھیں کھولیں۔ جنھوں نے اپنی فطری صلاحیتوں اور خداداد ذہانت سے اردو کو تاج محل سے زیادہ حسین و جمیل بنادیا ان میں سے ہر ایک شخص ایک ادبی اکیڈمی سے کم نہیں ہے۔ لیکن شبلی میں جو ہمہ گیر ادبی صلاحیتیں اور خصوصیات جمع ہیں وہ کسی اور میں نہیں ہیں۔ وہ بیک وقت بے مثال ادیب، سوانح نگار، محقق، فلسفی، نقاد اور شاعر تھے۔ ان کی تحریر کی اولین صفت قوت اور جوش ہے جو ان کے احساس کمال اور احساس عظمت کی پیداوار ہے۔ ان کے یہاں سنجیدگی کے ساتھ دلکشی اور شگفتگی بھی ہے ان کی نثر کی ایک خصوصیت یہ اس میں فکری قوت اور منطقی استدلال کے ساتھ ساتھ لطف واثر بھی پایا جاتا ہے۔

طرزِ تحریر کی خصوصیات:

علامہ شبلی نعمانی کے طرزِ تحریر کی نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں :

(۱) تنقید:

شبلی کا انداز تنقید اگرچہ مشرقی ہے مگر انھوں نے جدید تنقیدی نظریات سے بھی روشنی حاصل کی۔ اس طرح ان کی تنقیدوں میں مشرقی اور جدید تنقید کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے جس سے ایک خاص توانائی پیدا ہو گئی ہے۔ وہ جو بات بھی کہتے ہیں وہ بڑی مدلل اور واضح ہوتی ہے۔ استدلال کے اعتبار سے وہ سرسید کے مانند ہیں اور تحریروں میں ادبی چاشنی پیدا کرنے میں مولانا آزاد کے مشابہ ہیں۔

JOIN FOR MORE!!!

(۲) مقصدیت:

شبلی کا دور چونکہ مسلمانوں کے سیاسی اور دینی زوال کا دور تھا اس لیے ان کی تحریروں میں اسلاف کے دینی، سیاسی اور تہذیبی کارناموں کا تعارف ہے۔ وہ مشاہیر کے کارنامے بیان کر کے مسلمانوں میں از سرِ نو نئی جمعیت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ مقصدیت کی یہ روح ان کی تحریروں میں نمایاں طور پر موجود ہے۔

(۳) عالمانہ شان:

شبلی کی نثر میں خود نگری، احساس برتری، علمی رفعت و بصیرت اور گرم جوشی کی خصوصیات خاص طور پر نمایاں ہیں۔ اسی بنا پر وہ اپنے قاری کو اپنی بلند ذہنی سطح سے مخاطب کرتے ہیں اور اس میں بھی علمی بصیرت کی وہی روشنی پیدا کرنا چاہتے ہیں جس سے وہ خود بہرہ یاب ہیں۔

(۴) ادبی لہجہ:

شبلی کی تاریخی اور تنقیدی تحریروں میں بھی ادبی رچاؤ پایا جاتا ہے۔ وہ خشک سے خشک موضوع اور ٹھوس علمی مسائل کو بھی شگفتہ ادبی زبان میں ادا کرتے ہیں۔

(۵) تحقیقی رنگ:

شبلی کی تحریروں میں ایک خاص محققانہ شان پائی جاتی ہے۔ ان کی تصانیف سے ان کے عمیق مطالعے، تحقیقی اسلوب اور علمی بصیرت کا بھرپور تاثر ملتا ہے۔ انھوں نے اپنی تاریخی، تنقیدی اور ادبی تصانیف میں اپنی تحقیقی کاوش کا حق پوری طرح ادا کیا۔

(۶) شاعرانہ اسلوب:

شبلی اپنی نثر میں تاثیر کا عنصر پیدا کرنے کے لیے شاعرانہ زبان استعمال کرتے ہیں۔ خوبصورت الفاظ، ہلکے پھلکے محاورے اور حسین ترکیبیں ان کی نثر میں شگفتگی اور رعنائی پیدا کر دیتی ہیں۔ تحریر میں ادبی حسن پیدا کرنے کیلیے بعض اوقات موزوں اشعار سے بھی کام لیتے ہیں۔

(۷) ایجاز و اختصار:

شبلی اپنی تحریروں میں بے معنی طوالت سے گریز کرتے ہیں اور لمبی سے لمبی بات کو بھی بڑے اختصار اور جامعیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے اور مختصر جملوں میں بلاغت کی شان پائی جاتی ہے۔ یہ خصوصیات پیدا کرنے کے لیے وہ شاعرانہ عامات سے بھی کام لیتے ہیں۔

(۸) طنزیہ انداز:

شبلی کی طنز میں ایک ایسا تیکھا پن ہے کہ جس سے قاری میں ایک چونکا دینے والی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ طنز کرتے ہوئے شائستگی کا دامن نہیں چھوڑتے، اسی لیے ان کی طنز تیز ہونے کے باوجود گراں نہیں گزرتی۔

(۹) شگفتگی:

شبلی کی زبان اور تحریر شگفتہ ہے۔ ان کی ہر طرح کی تحریروں میں ادبی شان نمایاں ہے۔ ان کی تحریر کا تعلق تاریخ سے ہو یا تنقید سے، ادب سے ہو یا سوانح سے، سب میں چاشنی، شگفتگی اور سلاست پائی جاتی ہے۔

(۱۰) استعارات کا استعمال:

شبلی اپنی نثر نگاری میں استعارات اور تشبیہات کا استعمال کرتے ہیں، اشارے اور کنایے سے بہت کام لیتے ہیں اور ایسے الفاظ و تراکیب کا انتخاب کرتے ہیں جن میں موسیقی پائی جاتی ہے۔

ناقدین کی آراء:

☆....ڈاکٹر سید شاہ علی کہتے ہیں:

"شبلی نعمانی کے طرزِ تحریر میں آزاد کا شگفتہ انداز اور حالی کے سنجیدہ اور مدلل انداز کی جھلک نظر آتی ہے"۔

☆....مفتی انتظام اللہ شہابی کہتے ہیں:

"شبلی نے کمالات اور علوم و فنون کو اپنی ذات میں جمع کر لیا تھا"۔

☆....ڈاکٹر عبارت بریلوی کہتے ہیں:

"جدید تنقید کی ابتداء حالی، شبلی اور آزاد کے ہاتھوں پیش کیے ہوئے ان کے تنقیدی خیالات و نظریات سے ہوتی ہے جو حالات کا تقاضا تھا"۔

مولانا عبدالحلیم شرؔر

حالاتِ زندگی:

شرر ۱۸۶۰ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے والد کا نام حکیم تفضل حسین تھا جو عربی اور فارسی کے بہت بڑے عالم تھے۔ شرر اردو ادب کے ایک منفرد ادیب ہیں۔ آپ نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا اور ادب کی مختلف اصناف میں قسمت آزمائی کی، لیکن سب سے زیادہ شہرت اور انفرادی مقام شرر کو اسلامی تاریخی ناول نگاری میں حاصل ہوا۔ شرر کو اسلامی تاریخی ناول نگاری کا بانی سمجھا جاتا ہے۔

تصانیف:

شرر کی تصانیف بے شمار ہیں۔ کل تصنیفات 102 کے لگ بھگ ہیں جن میں تاریخی ناول، سوانح عمریاں، تاریخی کتب، خیالی مضامین، ڈرامے اور آزاد نظمیں وغیرہ سب شامل ہیں۔ مشہور تاریخی ناول حسب ذیل ہیں:

- فلورا فلورنڈا
- منصور موہنا
- فردوس بریں
- ایام عرب
- فتح اندلس وغیرہ

طرزِ تحریر کی خصوصیات:

شرر کی تحریر میں سادگی اور روانی ہے اس میں دلکشی اور شگفتگی ہے وہ بے تکلف اور بے تکان لکھتے ہیں لیکن روانی میں کوئی فرق نہیں آتا کبھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ لکھنے والے کو الفاظ کی تلاش ہے۔ ان کی تحریر اونچ نیچ سے پاک ہے وہ ہر بات ایک ہی لہجہ میں کہتے ہیں۔ شرر نے

انگریزی انشاء پردازی کے حسین بندھنوں کو اردو میں داخل کیا۔ گو انھوں نے تشبیہات اور استعارے اپنے ہی استعمال کئے ہیں۔ شرر نے اپنی خیالی مضامین میں جو انگریزی ادیبوں کا رنگ اختیار کیا ہے، اور خیالی مضامین میں جو خیال آفرینیاں کی ہیں اور زبان اختیار کی ہے اس کی نسبت سب کو اتفاق ہے کہ یہ اردو کا جدید رنگ ہے۔ عبدالحلیم شرر کے طرزِ تحریر کی نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں :

(۱) بحیثیت ناول نگار:

شرر نے اپنی ناول نگاری کی ابتداء دلچسپ انداز سے کی تھی۔ انھوں نے مسلمانوں کے ماضی کو زندہ کرنے اور اسلاف کی تاریخ بیان کرنے کے لئے ناول کا سہارا لیا اپنی شہرت اور عوام کی پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے خیالی اور معاشرتی کے مقابلوں میں تاریخی ناولوں کی طرف خاص توجہ دی ہے۔

شرر کے ناول کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں خصوصی طور پر اسلامی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اس لئے وقت کے ساتھ ساتھ ان کے ناول میں خیال آرائی کا رنگ چڑھتا گیا اور انھوں نے آسان الفاظ میں واقعات کو دلکش بنانی کی کوشش کی ہے۔

(۲) کردار نگاری:

شرر نے اپنے کرداروں کا ایک ہی رخ پیش کیا ہے۔ اگر کوئی شخص بہادر ہے تو صرف اس کی شجاعت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی چالباز اور بدنیت ہے تو اس کی زندگی کا یہی رخ دکھادیا جاتا ہے۔ وہ کسی کردار کی مکمل خوبیوں اور برائیوں کو ظاہر نہیں کرتے۔ ان کے تمام کردار ایک ہی رنگ اور ایک ہی طریقے سے گفتگو کرتے ہیں ان کا مختلف انداز نہیں اس سے ان کی انفرادی خصوصیت ختم ہو جاتی ہے۔ فنی خامیوں کے باوجود شرر کے ناول بہت مشہور ہوئے۔

(۳) مقالات و مضامین:

شرر کے مضامین کا مجموعہ آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ مضامین مختلف موضوعات پر لکھے گئے ہیں۔ جب میں شاعرانہ، عاشقانہ، تاریخی، جغرافیائی اقوام کے تذکرے اور مختلف ممالک وشہروں کے حالت شامل ہیں۔ ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اسی طرح انھوں نے دنیا کی مشہور عورتوں اور مردوں کے حالات بھی لکھے۔ ادب اور تحقیقی مسائل، قوم وملت اور تاریخی واقعات پر بھی خیال آرائی کیے ان کے مقالات میں " دنیا آدھی رات "اور " آنے والی گھڑی "شامل ہیں۔

(۴) سوانح نگاری:

شرر نے تاریخی مضامین کے علاوہ کئی تاریخی کتابیں بھی لکھی ہیں جن میں تاریخی سندھ اور عصر قدیم شامل ہیں۔ سوانح حضرت بغدادی اور ابو بکر شبلی وغیرہ بھی لکھیں۔ شرر نے چند ڈرامے بھی لکھے۔ جن میں مندرجہ ذیل شامل ہیں :

(۱) شہید وفا (۲) نیکی کا پھل (۳) عظمتِ شرر

(۵) انگریزی الفاظ کا استعمال:

سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء کی تحریروں میں انگریزی الفاظ کا استعمال بہت کثرت سے ہوا ہے۔ شرر کے طرزِ نگارش میں بھی ان کے دبستاں کی بعض باتیں غیر محسوس طور پر داخل ہو گئیں۔ چنانچہ شرر کے ہاں بھی کہیں کہیں انگریزی الفاظ کا استعمال ملتا ہے جو ناگوار نہیں گزرتا۔

(۶) جدت پسندی:

شرر جدت پسند ادیب تھے۔ پامال راستوں پر چلنا انھیں پسند نہ تھا۔ لہٰذا مضامین میں بھی وہ صرف پہلی باتوں کو روایت کر دینے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ تحقیق وجستجو سے اصل حقائق تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مضامین میں نئے نئے عنوانات تلاش کیے جس پر پہلے کسی نے قلم نہیں اٹھایا۔

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS

(۷) سلاست وروانی:

شرر کے بیشتر موضوعات علمی اور تاریخی تھے تاہم ان کا اسلوب اس قدر شگفتہ ہے کہ کہیں مشکل نویسی اک احساس نہیں ہوتا۔ ان کی تحریریں رواں دواں ہیں۔ یہ خصوصیت دراصل شرر کی کمال مشاقی اور اظہار و بیان پر ان کی کامل دسترس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

(۸) رومانیت:

شرر کو رومانی دبستان کا بانی کہا جاتا ہے۔ رومان میں حسن و عشق کے قصے ہوتے ہیں۔ جذب و تخیل کی کار فرمائی ہوتی ہے اور یہی چیز ہمیں شرر کے ہاں بھی ملتی ہے۔ ان کے اکثر و بیشتر ناول حسن و عشق کے موضوع کے گرد گھومتے ہیں۔

(۹) مکالمہ نگاری:

شرر اپنے ناولوں میں مکالمہ نگاری سے بھی کام لیتے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کے مکالموں میں جان نہیں۔ مزید برآں ان کے مکالمے بڑے طویل ہوتے ہیں جن سے قاری جلد اکتا جاتا ہے۔

(۱۰) مدعا نویسی:

شرر ایک مقصدی ادیب ہیں۔ وہ سرسید کے مقتدی نہ سہی معتقد ضرور تھے۔ تاریخ ناول لکھنے سے ان کا مدعا یہ تھا کہ عیسائی اور انگریز مصنفین نے صلیبی جنگوں پر خامہ فرسائی کرتے وقت مسلمانوں کا کردار جو مسخ کر کے دنیا کو دکھایا ہے اس کا ازالہ کیا جائے چنانچہ شرر نے اپنے ناولوں اور مختلف مضامین کے ذریعے مسلمانوں کی دینی، تہذیبی اور معاشرتی اصلاح کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کی عظمت رفتہ کی تصویر دکھا کر ابھارنے کی کوشش کی ہے۔

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS BASIM

ناقدین کی آراء:

☆.... آل احمد سرور کہتے ہیں:

"شرر کو اردو ناول نگاری کا "والٹر اسکاٹ" کہا جاتا ہے"۔

☆.... ڈاکٹر ابو اللیث کہتے ہیں:

"شرر کے ناول بھی تاریخی ہیں لیکن ان کا مقصد بھی مسلمانوں کو ان کے ماضی کی داستانیں سنا کر عزم و استقلال جرات و جواں مردی، دلیری اور ثابت قدمی کی ترغیب دینا ہے"۔

☆......☆......☆

سرسید احمد خان

وہ ذاتِ باکمال کہ سید کہیں جسے — مصلح تھا، مجتہد تھا زمانہ شناس تھا
اس نے دیا ہے نثر کو اسلوبِ نو وسیم — دنیا جانتی ہے ادب کی اساس تھا

حالاتِ زندگی:

سرسید ۱۸۱۷ء میں دہلی کے ایک نہایت قدیم مہذب اور علمی خاندان میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام میر متقی تھا جو ایک درویش منش بزرگ تھے۔ والدہ خواجہ میر درد جیسے صوفی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ لڑکپن اور جوانی میں نہ صرف اس عہد کی فارسی، عربی اور دیگر علوم کی اچھی تعلیم پائی بلکہ وقت کے نامور عالموں اور ادیبوں کی صحبت سے بھی فیض یاب ہوئے۔ غالب، مؤمن، ذوق، صہبائی اور شیفتہ جیسے باکمال لوگوں سے سرسید کا تعلق عقیدت مندانہ تھا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد سر سید انگریزی حکومت کے ملازم ہو گئے۔ محکمۂ قانون کے مختلف عہدوں پر فائز رہے اور ملک کے مختلف مقامات پر ان کا تبادلہ ہوتا رہا۔

تصانیف:

سر سید کی تصانیف میں:

(۱) آثار الصنادید　(۲) اسبابِ بغاوتِ ہند　(۳) خطباتِ احمدیہ　(۴) تاریخ بجنور

(۵) آئینِ اکبری　(۶) جلاء القلوب　(۷) علی گڑھ انسٹیٹوٹ　(۸) تہذیب الاخلاق

اسلوب تحریر:

سر سید احمد خان کو جدید اردو کا بانی کہا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے قلم کے ذریعے اپنی خوابیدہ قوم کو ترقی کی راہیں اختیار کرنے پر آمادہ کیا۔ آپ کی تحریر ہیر رانجھا اور شیریں فرہاد کے قصے کہانیوں پر مشتمل ہونے کے بجائے ہمیشہ بامقصد اور انقلابی رہی۔ آپ کے اسلوبِ تحریر کی نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں:

(۱) سادہ نگاری:

سر سید سے پہلے اردو نثر بھی شاعری کی طرح بوجھل ہو رہی تھی۔ ادائے مطالب میں تشبیہات اور استعارات کا رواج عام تھا۔ سر سید نے نثر کو تکلفات اور بے جا طوالت سے پاک کر کے سادہ مگر سنجیدہ انداز بخشا اور خشک قسم کے علمی، ادبی، دینی اور معاشرتی مسائل کو ایسے سادہ اور رواں انداز میں بیان کیا کہ پڑھنے والا اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا۔

(۲) عامیانہ پن:

سر سید کی تحریر میں کہیں کہیں زبان کا پرانا پن پایا جاتا ہے۔ کبھی کبھی اسلوب میں ڈھیلا پن بھی آ جاتا ہے۔ بعض اوقات وہ قواعدِ زبان کی پابندی بھی بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ عامیانہ الفاظ کا استعمال بھی ان کے ہاں ملتا ہے۔

(۳) انگریزی الفاظ کا استعمال:

سید صاحب کی تحریر میں بعض دفعہ انگریزی الفاظ کی بھرمار بھی ذوقِ سلیم پر گراں گزرتی ہے۔ وہ ان الفاظ کو جو عام فہم اور عوام کی زبان پر جاری ہوں صحیح لفظوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ اسی لئے ان کی تحریروں میں ادبی حسن کی کمی ہے۔

(۴) سائنسی اندازِ تحریر:

سر سید نئے طرزِ تحریر کے حامل اور جدیدیت کے قائل تھے۔ ان کا طرزِ تحریر سائنٹیفک ہے۔

(۵) قوتِ استدلال:

سر سید احمد نے اپنی تحریروں میں جذبات سے زیادہ عقل کو متاثر کیا ہے۔ وہ ہر قسم کے علمی، اخلاقی، دینی اور معاشرتی مضامین جذباتی عنصر کو کم رکھتے ہیں بلکہ استدلالی انداز میں دلیل سے وزن پیدا کرتے ہیں اور منطقی ربط کے ساتھ اپنی بات آگے بڑھاتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنی بات مربوط انداز میں صاف ستھرے طریقے سے ادا کرتے ہیں۔

(۶) ادبی چاشنی:

موضوع کتنا بھی علمی، فکری اور تحقیقی ہو سر سید صاحب اپنے طرزِ تحریر سے اسے دلچسپ اور پر لطف بنا دیتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں خشکی اور بے لطفی نہیں بلکہ ان کے زبان و بیان میں ایک ادبی چاشنی کی حلاوت موجود رہتی ہے۔ اس طرح قاری پوری دلچسپی کے ساتھ ان کی تحریروں کا مطالعہ کرتا ہے۔

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS www.smartnotes.xyz

(۷) مقصدیت:

سرسید ادب کو زندگی کا خادم سمجھتے ہیں۔ اس لئے محض عبارت آرائی اور انشاء پردازی کبھی ان کا مقصد نہیں بنتی چنانچہ ان کا علمی و فکری اسلوب تحریر تنقید نگاری کے لئے نہایت مناسب اور موزوں ہے۔ جس طرح وہ ایک متوازن نقاد تسلیم کئے جاتے ہیں اسی طرح ان کا طرزِ تحریر بھی متوازن اور معتدل ہوتا ہے اور مقصدیت کی شان رکھتا ہے۔

(۸) بے ساختگی و برجستگی:

سرسید صاحب نے اکثر علمی، فکری اور تنقیدی موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور اس کے لئے انشاء پردازانہ اسلوب تحریر کے بجائے بے ساختہ سادہ اور برجستہ بات کہنا زیادہ مناسب ہوتا ہے۔ چنانچہ سید احمد صاحب کے ہاں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ وہ لفظی شان و شکوہ دکھانے کے بجائے اصل توجہ اس بات پر دیتے ہیں کہ ان کی بات بہتر طور پر قاری کی سمجھ میں آسکے۔

(۹) ذہنی انقلاب:

سرسید نے اپنی مضمون نگاری کے ذریعے برصغیر کے روایتی سماج میں طاری جمود کو توڑا اور ایک عظیم ذہنی انقلاب برپا کردیا۔ سرسید کو علی گڑھ سے بے حد لگاؤ تھا سرسید نے اپنے رفقاء کی مدد سے اردو زبانِ ادب کے ذریعے قومی شعور بیدار کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ بقول مولانا الطاف حسین حالی:

JOIN FOR MORE!!!

"سرسید کی مثال اس مضطرب شخص کی سی ہے جس کے گھر میں آگ لگی ہو اور وہ اسے بجھانے کیلئے ہمسایوں کو پکارے، ایسی حالت میں خوبصورت جملوں کا ہوش کیسے رہ سکتا ہے۔"

(۱۰)طویل طویل جملے:

سرسید کی تحریر میں ایک نمایاں اور انفرادی کمزوری یہ ہے کہ وہ بہت طویل طویل فقرے لکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی تحریر میں الجھاؤ پیدا نہیں ہوتا اور دلچسپی برقرار رہتی ہے:

"بڈھا نہایت غمگین ہے مگر اس کا غم اندھیرے گھر پر ہے نہ اکیلے پن پر اور نہ اندھیری رات اور بجلی کی کڑک اور آندھی کی گونج پر اور نہ برس کی اخیر رات پر"

(۱۱)قیامِ پاکستان کی راہ ہموار کرنا:

ایک ادیب، مصنف اور جدید نثر کے بانی ہونے کی حیثیت سے ان کا شمار ہندوپاک کی غیر فانی شخصیات میں ہوتا ہے۔ ان کے عہد میں مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ مملکت کا تصوّر تو موجود نہ تھا لیکن بعد میں علیحدہ وطن کے حصول کے لیے جو تحریک شروع ہوئی۔ اس کے لیے راہنماؤں کو ایک تیار قوم ملی۔ اس قوم کی تعمیر میں سرسید کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لیے بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ان کے بارے میں تحریر کردہ ایک مضمون میں لکھا کہ "قصرِ پاکستان کی پہلی اینٹ اسی پیرِ مرد نے رکھی تھی"۔

ناقدین کی آراء:

- سرسید خان کے بارے میں مولانا الطاف حسین حالی کہتے ہیں کہ:

"سرسید جدید اردو نثر کے مورث اعلیٰ ہیں۔"

- ڈاکٹر سید عبداللہ کہتے ہیں:

"سرسید کی نثر سے اردو اسلوب نثر کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔"

- بابائے اردو مولوی عبدالحق سرسید کے بارے میں کہتے ہیں:

"اس نے ایک مایوس اور افسردہ قوم میں ایک نئی روح پھونک دی اور ایسا قوی جذبہ قومی پیدا کیا جو اب تک کام کر رہا ہے۔"

- ڈاکٹر احسن فاروقی کہتے ہیں:

"سر سید ایک مصلح قوم تھے۔انھوں نے نثر نگاری کے ذریعے قومی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا"۔

- ڈاکٹر حامد حسن قادری لکھتے ہیں:

"سر سید کو ہر موضوع کو قوّت وقدرت کے ساتھ بیان کرنے کا ملکہ حاصل تھا"۔

- ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کہتے ہیں:

"انہوں نے وہ تحریک شروع کی جس کی موجودہ شکل آج پاکستان کی صورت میں نظر آتی ہے۔"

حرف آخر:

غرض کہ سر سید اردو زبان و ادب کا اتنا بڑا نام ہے کہ کوئی ادبی تاریخ ان کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ قوم کے غم سے ان کا دل سر شار تھا اور ان کا وجود "کام اور کام سے لگن" کی ایک بھرپور مثال تھا۔

میر کا یہ شعر انہی جیسے لوگوں کیلئے کہا گیا ہے:

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر چلو یاں کہ بہت یاد رہو

☆......☆......☆

خواجہ الطاف حسین حالؔی

تعارف:

خواجہ الطاف حسین اردو ادب و سخن میں ایک ایسا نام ہے جس کے احسانات کی بدولت جدید اردو عالمی معیار کے سفر پر گامزن ہو گئی۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جس نے ادب و سخن دونوں میں بھرپور خامہ فرسائی کی اور اہل دنیا سے داد و تحسین وصول کی۔ اسی کی کاوشوں کی بدولت بر صغیر پاک و ہند میں علم و عمل کے چراغ روشن ہوئے اور بصیرتوں کو زندگی کا سراغ ملا۔ اردو علم و ادب کا ہر شعبہ اس کا ممنوع احسان ہے۔ شاعری ہو یا نثر، تنقید ہو یا تحقیق ہر پہلو میں حالی ہی کو معیار سمجھا جاتا ہے۔

طرزِ تحریر:

الطاف حسین حالی کی نثر نگاری کی خصوصیات درج ذیل ہیں:

(۱) مقصدیت:

حالی نے ہمیشہ مقصدیت کو اولین ترجیح دی اور اپنی تحریروں سے اصلاح معاشرہ کی کاوشیں کیں۔ آپ نے ادب و سخن کو زندگی کا حقیقی ترجمان بنا ڈالا کیونکہ آپ کے نظریہ کے مطابق ایسا ادب بے ادبی ہے جو ترجمانِ حیات نہ ہو۔ مثال کے طور پر وہ رقم طراز ہیں:

"میں نے جو کچھ لکھا اس کا منشاء وہ ضرورت وہ مصلحت ہے جس کے سبب سے بھولے کو راہ بتائی جاتی ہے اور مریض کو دوائے تلخ کی ترغیب دی جاتی ہے۔" (مقالات حالی)

(۲) سادگی و سلاست:

حالی کی تحریریں سادہ اور سلیس جملوں پر مشتمل ہوتی ہیں، جن میں مدعا انتہائی شائستہ پیراؤں میں بیان کیا جاتا ہے۔ حوالہ جاتی مضامین ہوں، سوانح نگاری ہو یا تنقید کا سخت میدان، ان کی بات سیدھا اور واضح مفہوم رکھتی ہے۔

JOIN FOR MORE!!! www.studypak.xyz

(۳) تنقید نگاری:

اردو دنیائے ادب میں باضابطہ تنقید نگاری کا آغاز حالی کی آمد سے ہوا۔ آپ نے اپنی بیشتر تحریروں میں تنقید کا سہارا لیا۔ آپ نے کبھی حقیقت کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا اور تحریر اور کردار کو داغدار ہونے سے ہمیشہ بچایا۔

آپ کی وہ کتاب جس میں آپ نے اپنی تنقیدی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا **"مقدمہ شعر و شاعری"** کے نام سے مشہور ہے۔

(۴) سوانح نگاری:

خواجہ الطاف حسین حالی جدید سوانح نگاری کے موجد ہیں۔ موجد ہونے کے باوجود آپ نے اس صنفِ ادب کی معراج کو چھویا اور بہترین نمونہائے تحریر پیش کئے۔ آپ کے چند مشہور سوانح درج ذیل شخصیتوں پر مبنی ہیں:

- ✓ شیخ سعدی (حیات سعدی)
- ✓ مرزا غالب (یادگارِ غالب)
- ✓ سر سید احمد خان

(۵) حسنِ تخیل:

خواجہ الطاف حسین حالی کے نثر پاروں میں تخیل کی کارفرمائی موجود ہے جو ان تحریروں میں شاعرانہ دل کشی کا واحد سبب ہے۔ یہ تخیل ان کے جذبات کا آئینہ دار ہے۔ مثال کے طور پر وہ رقم طراز ہیں:

"جس طرح تلوار کی کاٹ درحقیقت اس کی باڑھ میں نہیں بلکہ سپاہی کے کرخت ہاتھ میں ہے، اس طرح کلام کی تاثیر اس کے الفاظ میں نہیں بلکہ متکلم کی سچائی، اس کے نڈر دل اور بے لاگ زبان میں ہے۔"

(۶) تنوع مضامین:

حالی وہ پہلے فرد ہیں جنھوں نے اردو میں ادبی، سائنسی، تنقیدی و شاعرانہ مباحث بہت کامیابی سے پیش کیے۔ ان کی تحریروں میں حیرت انگیز تنوع پایا جاتا ہے اور ہر موضوع کا رنگ ملتا ہے۔ آپ کے بارے لکھا گیا:

"عملی نظریات اور اظہارِ حقائق کے لئے حالی کے نثر سے بہتر پیرائیہ بیان اردو میں نہیں ہے۔"(ڈاکٹر سید عبداللہ)

(۷) انگریزی الفاظ کا استعمال:

سر سید احمد خان کی طرح حالی کی تحریروں میں بھی جابجا انگریزی الفاظ کا استعمال ملتا ہے۔ آپ مقصدیت پر زور دیتے ہوئے بعض اوقات شعوری

طور پر بھی یہ الفاظ استعمال کر جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ لکھتے ہیں:

"مگر ایک مور لسٹ شاعران سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہے۔ جس کے لٹریچر کی عمر پچاس برس سے زائد نہیں۔ جس کی گرامر آج تک اطمینان کے قابل نہیں بنی۔"

(۸) استدلال:

حالی کی نثر میں سر سید کی عقلیت پسندی اور استدلال کا رنگ بھی نمایاں ہے۔ وہ اپنی بات کی صداقت منوانے کے لیے منطق اور دلیل آرائی سے کام لیتے ہیں۔

(۹) دھیما پن:

حالی کے اسلوب میں شبلی کی طرح جوشِ بیان اور خطیبانہ بلند آہنگی نہیں ہے اور نہ ہی وہ آزاد کی طرح نثر میں شاعری کرنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ ان کی نثر کے لہجے میں وہی دھیما پن، ملائمت، سادگی اور نرمی ہے جو ان کے مزاج کا حصہ ہے۔

JOIN FOR MORE!!!

(۱۰) صحت زبان:

حالی اگر چہ پر شکوہ زبان نہیں لکھتے مگر ان کی تحریریں بڑی صاف اور پاکیزہ ہوتی ہیں۔ وہ صحت زبان، روزمرہ اور محاورہ کی درستی کا خاص اہتمام کرتے ہیں۔ ہمیں ان کی تحریروں میں بیان کی صداقت، زبان کی صحت اور صفائی بیان کا ایک جچا تلا انداز ملتا ہے۔

(۱۱) بے ساختگی:

عناصرِ خمسہ میں سے صرف حالی واحد نثر نگار ہیں جن کی تحریروں میں بے ساختگی اور بے تکلفی ہے۔ مگر یہ بے ساختگی ان کی تحریر کا حُسن بننے کے بجائے عیب بن جاتی ہے۔ وہ روانی میں نہ پیراگرافوں کا خیال رکھتے ہیں نہ جملوں کی طوالت کو دھیان میں لاتے ہیں۔ جس سے ان کی تحریر میں بے ربطی پیدا ہو جاتی ہے۔

ناقدین کی آراء:

- ”حالی کے یہاں سرسید سے بھی زیادہ جچا تلا اندازِ فطرت پرستی نظر آتا ہے۔“ (پروفیسر آل احمد سرور)
- ”حالی کا اسلوبِ تحریر بہت صاف اور سادہ ہے۔“ (ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی)
- ”حالی نے اپنے قدم ادبی سرمائے کو پرکھنے اور اس میں اچھے کو برے سے الگ کر لینے کے راز بتائے۔“ (پروفیسر احتشام حسین)
- ”حالی سے اردو ادب میں ایک نئی ریلزم یا واقفیت کی ابتداء ہوئی۔“ (مجنوں گورکھپوری)
- ”حالی کا انداز تحریر سادہ اور سلیس ہے وہ زبان سے زیادہ مطلب پر توجہ دیتے ہیں اور آرائش زبان کو ثانوی حیثیت دیتے ہیں۔“ (ڈاکٹر وحید قریشی)
- ”حالی جیسے بھی ہیں انھیں جدید گروہ کی لائق فخر پیشوائی کے لیے چھوڑ دیجیے“۔ (مہدی اِفادی)
- ”حالی اپنی شاعری اور نثر دونوں کے اعتبار سے اردو کے عظیم ادیبوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔“ (ڈاکٹر سید عبد اللہ)

☆.....☆.....☆

JOIN FOR MORE!!!

ڈپٹی نذیر احمد دہلوی

حالاتِ زندگی:

ڈپٹی نذیر احمد ڈیہڑ ضلع بجنور میں ۱۸۳۰ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مولوی سعادت علی تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد کے گھر پر ہی حاصل کی۔ کم عمری میں ہی وہ بجنور سے دہلی چلے آئے جہاں ایک مسجد کے مدرسے میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا گھرانہ مذہبی علوم اور تصوف میں بڑا مشہور تھا۔ انھوں نے عربی کی تعلیم اپنے والد سے ہی حاصل کی۔ نذیر احمد بنیادی طور پر ایک مولوی تھے جس کا رنگ ان کی تحریروں میں جا بجا ملتا ہے اور بعض اوقات تو وہ ناول کی کہانی میں بھی خطیبانہ انداز کرتے ہوئے وعظ و نصیحت کرتے نظر آتے ہیں۔ دینی ادب کے سلسلہ میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ قرآن حکیم کا بامحاورہ ترجمہ ہے۔

نذیر احمد کو اردو ادب میں ناول نگاری کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ کیوں کہ اردو میں وہ پہلے شخص ہیں جس نے ناول کے انداز میں کتابیں لکھیں۔ ناول انگریزی ادب کی ایک صنف ہے اور انگریزی سے ہی یہ صنف اردو میں آئی۔

مشہور ناول:

(۱) مرآۃ العروس (۲) بنات النعش (۳) توبۃ النصوح (۴) ابن الوقت

طرزِ تحریر:

نذیر احمد کا اسلوب بیان ان کے رفقاء سے الگ ہے۔ وہ خالص دلی زبان لکھتے ہیں ان کا طرزِ بیان صاف واضح اور زور دار ہوتا ہے۔ عربی اور فارسی مقولے اور اصطلاحات کو اپنی عبارتوں میں انتہائی خوبصورتی سے استعمال کرتے ہیں۔ انگریزی الفاظ سے بھی جابجا کام لیتے ہیں۔ جس سے تحریر میں کوئی حسن پیدا نہیں ہوتا۔ انھوں نے تشبیہ اور استعارہ سے بھی کام لیا ہے۔ عورتوں کی زبان لکھنے پر ان کو عبور حاصل ہے۔ محاورے کے استعمال کا ان کو شوق ہے۔ ان کے یہاں عوامی اور علمی دونوں قسم کے محاورے ملتے ہیں۔

طرزِ تحریر کی نمایاں خصوصیات:

ڈپٹی نذیر احمد کے طرزِ تحریر کی نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں:

(۱) ناول نگاری کے بانی:

نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں۔ اپنی بیٹی کو پڑھانے کے لئے جو کتاب لکھی تھی وہ **"مرآۃ العروس"** کے نام سے شائع ہوئی۔ وہ اردو کا پہلا ناول کہلایا۔ نذیر احمد سے پہلے اردو ادب میں ان کے برابر ترجمانِ زندگی نہیں گزرا۔ رفقائے سرسید میں جس شخص کو ہم سب سے زیادہ عام لوگوں کے قریب پاتے ہیں وہ نذیر احمد ہیں جن کی زندگی عوام ہی کے ماحول سے ابھری ہے۔

JOIN FOR MORE!!!

(۲) مقصدیت:

نذیر احمد کے بھی وہی رجحانات اور تصورات تھے جو سرسید اور ان کے دوسرے رفقاء میں پائے جاتے ہیں۔ دبستان سرسید کے ہر شخص کا مقصد قوم کی اصلاح اور ترقی تھا۔ نذیر احمد کی تمام تصانیف میں یہی مقصد کارفرما نظر آتا ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کی معاشرت، بودوباش، تعلیم نسواں، بچوں کی تعلیم وتربیت، عورتوں کی گھریلو زندگی کی اصلاح اور مغربی تہذیب کی اندھی تقلید وغیرہ کو اپنی تصانیف کا موضوع بنایا ہے۔ نذیر احمد ہی سے اردو میں زندگی پر تنقید کا آغاز ہوتا ہے۔ جس سے انھوں نے مسلمانوں کے متوسط گھرانوں کی اصلاح کا کام لیا۔

(۳) کردار نگاری:

نذیر احمد کے ناولوں میں زندگی کے نقوش پہلی دفعہ نمایاں دکھائی دیئے ہیں۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں انسانی کردار پیش کئے ہیں۔ گو یہ مثالی کردار ہیں، لیکن ان کے ناول اردو کے اولین ناول تھے۔ اس لئے ان میں ترقی یافتہ ناولوں کی خوبیاں تلاش کرنا بے کار ہے۔ مرآۃ العروس کے زنانہ کرداروں میں سچائی نہ پیدا ہو سکی۔ مردانہ کردار بھی کوئی جاندار نہیں ہیں لیکن یہ بات عجیب ہے کہ ان کے بعض کرداروں کے محبوب نہ ہونے کے باوجود بہترین کردار ہیں۔ توبتہ النصوح کا کلیم نذیر احمد کا لافانی کردار ہے۔ اس کی تخلیق میں انھوں نے اپنی ہنر مندی کا ثبوت دیا ہے

(۴) مکالمہ نگاری:

نذیر احمد ناولوں میں مکالمہ کا انداز قدیم داستانوں سے الگ ہے اور انہی کے ہاتھوں اردو میں اس کی بنیاد بنی ہے۔ مکالمہ کا یہ انداز انگریزی میں ڈرامے کا ہے۔ نذیر احمد کے مکالموں میں کردار کا حقیقی رنگ جھلکتا نظر آتا ہے اور انھوں نے ان کے جذبات واحساسات، ان کے لاشعوری کیفیات اور تصورات کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ ان کے مکالموں میں دہلی کے گلی کوچوں کی ٹکسالی زبان اور عورتوں کی بامحاورہ زبان ملتی ہے اور اس زبان پر ان کو مکمل عبور حاصل ہے۔ انھوں نے مکالمہ کے ذریعے اپنے نظریات کا اظہار کیا ہے۔ عورتوں کے مکالمے کے تو وہ بادشاہ ہیں۔

(۵) ترجمہ نگاری:

نذیر احمد نے ناول اور دوسری تصانیف کے علاوہ ترجمے بھی کئے ہیں۔ حکومت کے ایماء پر انھوں نے قانون انکم ٹیکس اور انڈین پینل کوڈ کا ترجمہ تعزیراتِ ہند کیا جو آج بھی مروّج ہے۔ لیکن ان کی سب سے بڑی مذہبی خدمت اور ناولوں کے بعد سب سے عظیم کارنامہ قرآن مجید کا ترجمہ ہے۔

(۶) حقیقت پسندی:

نذیر احمد کے ناول اردو میں اس اعتبار سے ایک نیا تجربہ ہیں کہ ان میں پہلی مرتبہ محض دلچسپی اور تفریح کے مقصد کو نظر انداز کر کے ایک مسئلہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ مسئلہ ایک سماجی اور تہذیبی مسئلہ ہے۔ اس سے پہلے کہانیوں میں مافوق الفطرت عناصر کی بھرمار ہوتی تھی مگر انھوں نے قصوں اور کہانیوں سے اس عنصر کو خارج کیا اور خالصۃً عوامی موضوعات کو شامل کیا۔

(۷) ظرافت:

نذیر احمد زاہدِ خشک نہیں بلکہ ایک زندہ دل انسان تھے۔ ان کی تحریر میں شوخی و ظرافت کا عنصر بھی نمایاں ہے لیکن ان کی ظرافت حد اعتدال سے آگے نہیں بڑھتی، وہ تبسم تو بن جاتی ہے مگر قہقہے سے گریز کرتی ہے۔ بقول رام بابو سکسینہ:

"ان کی ظرافت بہت ہلکی اور لطیف ہوتی ہے اور اس میں پھکڑپن مطلق نہیں ہوتا۔"

(۸) محاورات کا استعمال:

نذیر احمد کو محاوروں کے استعمال کا خبط ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں کسی نہ کسی طرح کوئی نہ کوئی محاورہ ٹھونس دیتے ہیں۔ حتی کہ ترجمہ قرآن میں بھی وہ اس محاورہ بندی سے باز نہیں آئے جس کی وجہ سے مطلب کچھ کا کچھ ہو گیا۔ بقول فرحت اللہ بیگ:

"محاوروں کی بھرمار سے متعلق اکثر ان سے میرا جھگڑا ہوتا تھا۔ میں ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ آپ کسی نہ کسی طرح محاورہ کو کسی نہ کسی جگہ پھنسا دینا چاہتے ہیں خواہ اس کی گنجائش ہو یا نہ ہو۔"

JOIN FOR MORE!!!

(۹) پندو موعظت:

پندو موعظت نذیر احمد کے ناولوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ انھیں ناول نگار سے زیادہ واعظ کہا گیا ہے۔ انھوں نے اپنے قصوں سے دین داری، خدا پرستی اور اصلاح معاشرت کا کام لیا ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبد اللہ:

"انھوں نے وعظ اور ناول دونوں سے فائدہ اٹھایا۔ تقریر اور تحریر دونوں کے ذریعہ انھوں نے اپنے عقائد کی تبلیغ کی۔"

(۱۰) جزئیات نگاری:

نذیر احمد کو جزئیات نگاری میں کمال حاصل ہے۔ ان کا قلم ہر چیز کو سمیٹتا چلا جاتا ہے۔ ان کے بیان میں ہر چیز سما جاتی ہے۔ اس دور کی ذہنیت، سماجی تصورات اور معاشی نظریات کے جتنے نمونے نذیر احمد کے ناولوں میں ہیں اور کہیں نہیں ملتے۔ بقول ڈاکٹر سید عبد اللہ:

"نذیر احمد کی قوت مشاہدہ تیز تھی اور انھیں جزئیات پر بڑا عبور حاصل تھا۔"

(۱۱) روشن خیالی:

ڈپٹی نذیر احمد کا تعلق سر سید کی تحریک سے تھا۔ جس کا مقصد مسلمانوں کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا تھا۔ وہ خود بھی ایک روشن خیال اور جدید فکر رکھنے والے شخص تھے اور چاہتے تھے کہ پوری قوم وقت کے جدید تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھال لے تاکہ دنیا کی دوسری قوموں کے ساتھ قدم ملا کر چل سکے۔ اسی لیے ان کی تحریروں میں روشن خیالی اور جدیدیت کا عنصر ملتا ہے۔

ناقدین کی آراء:

☆.... ڈاکٹر سید عبد اللہ کہتے ہیں:

"نذیر احمد کی قوت مشاہدہ تیز تھی اور انھیں جزئیات پر بڑا عبور حاصل تھا۔"

☆.... فرحت اللہ بیگ کہتے ہیں:

"محاوروں کی بھرمار سے متعلق اکثر ان سے میرا جھگڑا ہوتا تھا۔"

☆....رام بابو سکسینہ کہتے ہیں:

"ان کی ظرافت بہت ہلکی اور لطیف ہوتی ہے اور اس میں پھکڑ پن مطلق نہیں ہوتا۔"

☆....ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کہتے ہیں:

"ڈپٹی نذیر احمد کا اسلوب ایک عالمانہ شان رکھتا ہے لیکن وہ عظ کا دفتر کھول دیتے ہیں۔"

☆....پروفیسر آل احمد سرور کہتے ہیں:

"ان کے ناول بڑے شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ یہ الماریوں میں نہیں چھوٹے بڑے کے دل میں محفوظ ہیں۔"

☆....مہدی افادی کہتے ہیں:

"زمانہ کتنی ہی ترقی کرے اس علم کے پتلے کو پھر پیدا نہیں کر سکتا جس کا کوئی رونگٹا بیکار نہیں تھا۔"

احمد شاہ پطرس بخاری

JOIN FOR MORE!!!

ایک تعارف:

سیّد احمد شاہ بخاری خالص مزاح کے علم بردار قلم کار ہیں۔ آپ نے اس مشکل ترین صنفِ ادب میں خامہ فرسائی کی اور قارئین سے زبردست دادِ تحسین وصول کی۔ آپ نے اپنے مضامین میں مزاح نگاری کو نہایت خوبصورت انداز میں استعمال کیا۔ آپ کی ذہانت کی عکاس آپ کی وہ تحریریں ہیں جن میں واقفیت، حسنِ تعمیر، علمی ظرافت، زیرِلب تبسم، شوخی، طنز اور مزاح کا بھرپور عکس نظر آتا ہے۔ پطرس کے زورِ قلم کا کُل اثاثہ ۱۵۵ صفحات کا کتابچہ المعروف بہ مضامینِ پطرس ہے۔ ان چند مضامین نے اردو ادب کی صنفِ مزاح میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور پطرس اس حلقے میں سب سے ممتاز ہو گئے۔ اُن کے قلم کی تخلیق دائمی شہرت اور عظمت کا سبب بنی اور انھوں نے اپنے ہم عصر مزاح نگاروں کے درمیان ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا۔

بقول آل احمد سرور:

"پطرس نے بہت تھوڑے مضامین لکھے، مگر پھر بھی ہماری چوٹی کے مزاح نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ اتنا تھوڑا سرمایہ لے کر بقائے دوام کے دربار میں بہت کم لوگ داخل ہوئے ہیں۔"

طرزِ تحریر کی خصوصیات:

پطرس کے طرزِ تحریر کی خصوصیات درج ذیل ہیں۔

(۱) اسلوب کی شگفتگی:

پطرس بخاری زبان و بیان کی سادگی سے کام لیتے ہوئے الفاظوں سے اس طرح کھیلتے ہیں کہ ان کو دل سے داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ سادگی، صفائی، روانی، محاورات کے برجستہ استعمال اور شگفتگی کی بدولت اُن کے مضامین میں ایک کشش ہے۔ آپ کی تحریروں کے مطالعے کے بعد ایسا لگتا ہے گویا اپنے کسی دوست سے نہایت بے تکلفانہ انداز میں ہمکلام ہیں۔

(۲) ظرافت کی خصلت:

پطرس کے مضامین میں جو مزاح نظر آتا ہے وہ خالصتاً مزاح ہے۔ اس میں بدتمیزی، طنز، تمسخر اور عامیانہ پن جیسی اصناف سے زبردستی ہنسانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ آپ کی نگارش میں مزاح و شوخی کی آفاقی خصلت ہے جو ہر موڑ پر نظر آتی ہے۔ آپ نے شرارت کے سلیقے کو برقرار رکھتے ہوئے ظرافت کے میدان کو وسیع و غیر محدود کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر وہ ہاسٹل میں پڑھنا میں لکھتے ہیں:

"اب قاعدے کی رو سے ہمیں بی۔اے کا سرٹیفکیٹ مل جانا چاہیے تھا۔ لیکن یونیورسٹی کی اس طِفلانہ ضد کا کیا علاج کہ تینوں مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا ضروری ہے۔"

(۳) واقعہ نگاری:

واقعہ نگاری پطرس کے نگارش کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ وہ لفظوں کے انتخاب اور فقروں کی ترتیب کا حسن استعمال کرتے ہوئے مضحکہ خیز واقعات کی تصویر کشی ایسی مہارت اور خوبصورتی سے کرتے ہیں کہ چشم تصور اُن کو ہو بہو اپنے سامنے محسوس کرتی ہے۔ مثال کے طور پر "مرحوم کی یاد میں" کے اس اقتباس میں وہ حُسنِ انتخاب سے ایک مزاح آمیز ماحول پیدا کرتے ہیں:

تمام بوجھ دونوں ہاتھوں پر تھا جو ہینڈل پر رکھے تھے اور برابر جھٹکے کھا رہے تھے۔ اب میری حالت تصور میں لائیں تو معلوم ہو گا جیسے کوئی عورت آٹا گوندھ رہی ہے۔

(۴) عکسِ زندگانی:

مصنف نے معاشرے اور روز مرّہ زندگی کا بھرپور تجزیہ کیا ہے اور اِس جائزے سے انسانی زندگی کے نازک، لطیف اور نرم و ملائم پہلوؤں پر قلم اُٹھایا ہے۔ آپ کی تحریروں میں پیش کئے گئے کرداروں اور واقعات کا تعلق کسی خاص معاشرے سے نہیں، بلکہ آپ نے تمام تہذیبوں میں پائی جانے والی یکساں صفات کی عکاسی کی ہے۔ اسی لئے پطرس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ:

پطرس نے اپنی ظرافت کا مواد زندوں سے لیا ہے۔

(۵) تحریف (Parody):

احمد شاہ پطرس بخاری نے اپنی تحریروں میں تحریف نگاری کو نہایت مہارت سے پرو کر ایک انوکھی خوبصورتی پیدا کر دی ہے۔ آپ نے اس مشکل فن سے شوخ اور ظریف رنگ پیدا کیا اور قارئین کے لئے ہنسنے کے دلکش مواقع پیدا کئے ہیں۔

مثال کے طور ایک مصنف نے لکھا ہے:

"بچہ انگوٹھا چوس رہا ہے اور باپ اُسے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا ہے۔"

پطرس اس کو یوں بیان کرتے ہیں:

"باپ انگوٹھا چوس رہا ہے، بچہ حسبِ معمول آنکھیں کھولے پڑا ہے۔"

(۶) مغربی ثقافت کا رنگ:

احمد شاہ بخاری چونکہ بین الاقوامی کانفرنسوں میں پاکستان کی نمائندگی کرتے رہے ہیں اس لئے اُن کا مغربی ادب کا بھرپور مطالعہ تھا۔ انھوں نے مغربی مزاح نگاری کا گہرا تجزیہ کیا اور اُس کی تمام تر خوبصورتی اور لطافتوں کو سمیٹ کر مشرقی رنگ میں ڈھالا۔ آپ کے مضامین میں جو ثقافتِ مغرب کا رنگ نظر آتا ہے وہ قاری کو ذرا بھی گراں نہیں گزرتا اور نہ کسی تحریر کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔

(۷) کردار نگاری:

پطرس کے طرزِ تحریر میں ایک اور خوبی پائی جاتی ہے کہ وہ کرداروں کے ذریعے ایک لطف اندوز ماحول پیدا کرتے ہیں۔ انسانی فکر و شعور کے تمام پہلوؤں پر مکمل عبور رکھتے ہوئے آپ اس طرح اپنے مضمون کو جملہ بہ جملہ تخلیق کرتے ہیں کہ مطالعہ کرنے والا شخص ایک مزاح آمیز ماحول میں گم ہو جاتا ہے اور بے اختیار مسکرا دیتا ہے۔

(۸) اِختصار و جامعیت:

پطرس کے مختلف مضامین ایک کامل اور ماہر ادیب کے فنون کی عکاسی کرتے ہیں۔ آپ اپنی بات کہنے پر مکمل عبور رکھتے ہیں اور بڑے

سے بڑے موضوع کو نہایت مختصر، جامع ور دل نشین انداز میں رقم کر دیتے ہیں۔ آپ کا حسنِ انتخاب ہی وہ وجہ ہے جس کی بدولت آپ کا سرمایہ ادب لافانی بن گیا۔ مثال کے طور پر "ہاسٹل میں پڑھنا" میں انھوں نے ایک جملے سے کیا بات کہہ ڈالی:

"ہم پہ تو جو ظلم ہوا سو ہوا، یونیورسٹی والوں کی حماقت ملاحظہ فرمائیے، کہ ہمیں پاس کر کے اپنی آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ ہاتھ سے گنوا بیٹھے۔"

(۹)لطیف طنز:

پطرس معمولی سے معمولی بات میں بھی مزاح کا پہلو نکال لیتے ہیں مگر بظاہر نہ وہ خود ہنستے ہیں اور نہ وہ دوسروں کو ہنسانے پر مجبور کرتے ہیں بلکہ وہ اس احساس کو ابھارتے ہیں جو قہقہے لگانے پر مجبور کرتا ہے۔ ان کے مغربی کتب کے مطالعے نے ان کی ظرافت میں ایک رکھ رکھاؤ پیدا کر دیا ہے۔

(۱۰)موضوعات:

پطرس کے موضوعات بالکل سیدھے سادے اور روزمرہ زندگی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اس سادگی میں پرکاری اور متانت ہوتی ہے اور ہم بڑی دلچسپی سے انھیں پڑھتے ہیں وہ بڑی کامیابی سے ہماری زندگی کے پنہاں گوشوں کو اپنی ذہانت اور ظرافت کی چاشنی کی مدد سے ہماری نظروں کے سامنے لاتے ہیں۔

JOIN FOR MORE!!!

ناقدین کی آراء:

مختلف نقاد پطرس کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں اور اپنے اپنے انداز میں پطرس کی تعریف بیان کرتے نظر آتے ہیں۔

☆.... حکیم یوسف حسن خان پطرس کے بارے میں کہتے ہیں:

"اگر میں یہ کہ دوں تو بے جا نہ ہو گا کہ ہندوپاکستان کے تمام مزاحیہ کتابوں کو ترازو کے ایک پلڑے میں ڈالا جائے اور پطرس کے مضامین دوسرے پلڑے میں رکھے جائیں تو پطرس کے مضامین بھاری رہیں گے۔"

☆.... غلام مصطفی تبسم لکھتے ہیں:

"بخاری کی نظر بڑی وسیع اور گہری ہے اور پھر اُسے بیان پر قدرت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کا مزاح پڑھنے والوں کی دل میں شگفتگی پیدا کر دیتا ہے۔"

M.HARIS BASIM www.studypak.xyz

☆.... ڈاکٹر خورشید السلام کا بیان ہے کہ:

"اُن کے اندازِ فکر اور طرزِ بیان میں انگریزی ادب کا اثر موجود ہے اور اندازِ بیان میں تخیّل کا عمل فرحت اللہ سے زیادہ قریب ہے۔"

☆.... ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی لکھتے ہیں:

"پطرس بھی رشید صدیقی کی طرح بلا کے ذہین ہیں اور ان کے ذہن کی یہ تیزی اور طراری ان کے ہر مضمون سے ظاہر ہے۔"

☆.... ڈاکٹر وزیر آغا کہتے ہیں:

"پطرس بخاری اردو میں خالص مزاح کے سب سے بڑے عَلَم بَردار ہیں۔ ان کی نگارشات خالص تخلیقی ادب کا درجہ رکھتی ہیں"۔

☆.... نظیر صدیقی کہتے ہیں:

"پطرس طنز و مزاح نگار ہوتے ہوئے ایک انشائیہ نگار بھی تھے"۔

حاصلِ تحریر:

اردو ادب کے گلشنِ مزاح میں پطرس نے جو پھول کھلائے ہیں اُن کی خوشبو آج تک علم دوست لوگوں کے اذہان کو مہکا رہی ہے۔ آپ نے چند مضامین میں مزاح نگاری کے جو جوہر دکھائے وہ دادِ تحسین کا باعث بنے اور آپ کو شہرت کی معراج تک لے گئے۔ آپ کا ہر مضمون قابلِ قدر ہے اور مزاح نگاری کی نئی نئی جہتوں سے روشناس کراتے ہوئے مسکراہٹوں کے مواقع پیدا کرتا ہے۔ احمد شاہ پطرس بخاری اس شعبہ ادب میں ہمیشہ ممتاز رہیں گے اور اُن کا نام تاقیامت زندہ رہے گا۔

خواجہ حسن نظامی

ایک تعارف:

رقصاں ہے لفظ لفظ میں اِک موجِ زندگی بخشا ہے اُس نے نثر کو صد کیفِ نغمگی

خواجہ حسن نظامی حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ میں 25 دسمبر 1878ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم سید امام، درگاہ سے وابستہ تھے۔

خواجہ علی حسن نظامی اردو انشاء پردازی کے ایک مشہور و معروف ادیب گزرے ہیں۔ اُن کے دلچسپ اور اثر انگیز افسانے اُن کی شہرت کا باعث بنے۔ علم دوست شخصیتوں نے علی حسن کے سفرناموں، افسانوں اور مضامین کو اپنے کتب خانوں کی زینت بنایا اور بہت کم عمر میں ہی وہ ایک صاحبِ طرز نثر نگار کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے۔ انھوں نے معمولی مضامین خوبصورت اور دِل نشین انداز میں رقم طراز کئے اور اردو نثر کو جدت کی راہ پر گامزن کر دیا۔ آپ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے علامہ اقبال فرماتے ہیں:

"اگر میں خواجہ حسن نظامی جیسی نثر لکھنے پر قدرت رکھتا ہوتا تو کبھی شاعری کو اظہارِ خیال کا ذریعہ نہ بناتا۔ بلاشبہ اردو نثر نگاروں میں خواجہ حسن نظامی کی ذات قابلِ قدر ہے اور وہ ایک منفرد رنگ کے مالک ہیں۔"

چند تصنیفات:

دہلی کا آخری سانس	بیگمات کے آنسو	بہادر شاہ کا مقدمہ	آپ بیتی
بیوی کی تعلیم	اولاد کی شادی	غدرِ دہلی کے افسانے	خاک بیتی
اوس	شہزادی کی بپتا	طمانچہ بر رخسار یزید	میلادنامہ

طرزِ تحریر کی خصوصیات:

خواجہ حسن نظامی کے طرزِ تحریر کی خصوصیات درج ذیل ہیں:

(۱) سادگی و سلاست:

خواجہ حسن نظامی زبان و بیان کی سادگی سے کام لیتے ہیں اور نہایت سہل زبان کو استعمال کرتے ہوئے بڑے مشکل مطالب بیان کر جاتے ہیں۔ عام فہم الفاظ کے خوبصورت استعمال کی بدولت اُن کے نثر کی خوبصورتی برقرار رہتی ہے اور بوجھل پن محسوس نہیں ہوتا۔ بقول رام بابو سکسینہ:

"خواجہ صاحب کی تحریریں نہایت سادہ، سلیس اور دلکش ہوتی ہیں۔"

(۲) شوخی و ظرافت:

زبان کی چاشنی اور چٹکلوں سے خواجہ حسن نظامی نے اپنی تحریروں میں مزاح کا رنگ پیدا کیا ہے۔ وہ جب کبھی مزاح کی چٹکی لیتے ہیں تو عام اور سیدھی بات کو گلاب کی سی رعنائی بخش دیتے ہیں۔ اُن کے مضامین میں عباراتِ ظرافت، شوخی اور لطافت کی چاشنی سے معمور نظر آتی

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS

ہیں۔مثال کے طور پر وہ اپنے ایک مضمون پیاری ڈکار میں لکھتے ہیں:

"یہ نئے فیشن کے مچھر کو زور سے ڈکار نہیں لینے دیتے ہیں۔کہتے ہیں کہ ڈکار لینے لگے تو ہونٹوں کو بھینچ لو اور ناک کے نتھنوں سے اُسے چُپ چاپ اُڑادو۔آواز سے ڈکار لینی بڑی بدتمیزی ہے۔"

(۳) ندرتِ موضوعات:

خواجہ صاحب کا کمالِ فن اُس وقت عروج پر نظر آتا ہے جب آپ کے انوکھے اور اچھوتے مضامین نظر سے گزرتے ہیں۔انھوں نے نہایت انوکھے موضوعات پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے اپنی مہارت کی معراج کو پایا اور بڑی خوبصورتی سے اِن مضامین کو پُر کیف بنا دیا۔ایک مضمون گلاب تمھارا کیکر ہمارا میں لکھتے ہیں:

آخر یہ میاں گُلاب کس مرض کی دوا نہیں۔پیٹ میں درد ہو تو گل قند کھلاؤ، ہیضہ ہو جائے تو گلاب پلاؤ اور اگر مر جاؤ تو قبر پر چڑھاؤ۔

(۴) عارفانہ وصوفیانہ طرزِ بیان:

ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ حسن علی ایک صاحبِ دل صوفی بھی تھے۔رشد و ہدایت کی مسند انھیں ورثے میں ملی تھی۔وہ اپنے خیالات کو قلم بند کرتے ہوئے معرفت الٰہی کے رنگ میں بڑی خوبصورتی سے پرو دیتے ہیں۔اسلوب میں والہانہ جوش اور ایک سچے عاشق کے دل کی صدا سنائی دیتی ہے۔

بقول رام بابو سکسینہ:

"خواجہ صاحب کی کتاب کرپشن بیتی کو اہلِ اسلام اور خاص کر اربابِ تصوّف نے بہت پسند کیا۔"

(۵) محاورات واختصار پسندی:

نثر نگار کے مضامین کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آپ کی تحریروں میں فقرات مختصر اور جامع ہوتے ہیں۔آپ آزاد کی طرح چھوٹے مگر با

محاورہ جملے ترتیب دیتے ہیں جن میں روانی اور لطافت کا عنصر نمایاں طور پر پایا جاتا ہے۔آپ کی تحریروں میں تسلسل کا دارومدار انھیں مختصر، سادہ و شیریں جملوں پر ہے۔

(۶) جذبات نگاری:

خواجہ حسن نظامی کی تحریریں انسانی زندگی کے سچے واقعات کی عکاس ہیں۔آپ اِن واقعات کو ترتیب دیتے ہوئے جذبات کے اظہار کا بھرپور خیال رکھتے ہیں۔مطالعہ کرنے کے بعد قاری کے دل و ذہن پر متاثر کن اثر باقی رہتا ہے جو قاری کے دلی جذبات سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔بیگمات کے آنسو میں وہ لکھتے ہیں:

"مجھے بخار چڑھ رہا ہے۔میری پسلیوں میں شدت کا درد ہو رہا ہے۔مجھے سردی لگ رہی ہے۔میری ماں مجھ سے بچھڑ گئی ہے اور بابا حضرت جلاوطن ہو گئے۔میں اینٹ پر سر رکھے لیٹی ہوں۔میرے بدن میں کنکر چبھ رہے ہیں۔بابا اٹھو! کب تک سو گے؟"

(۷) ٹکسالی زبان:

خواجہ حسن نظامی دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں پروان چڑھے اسی لئے ان کی تحریروں کی زبان خالص دہلی کی ٹکسالی زبان ہے۔وہ اہل زبان کے روزمرے اور محاورے کو بڑی بے ساختگی سے استعمال کرتے ہیں۔

(۸) خوشگوار طنز:

خواجہ صاحب کی تحریروں کا مقصد ماضی کی تہذیبی اور معاشرتی اقدار کی بازیافت ہی نہیں بلکہ مستقبل کی تعمیر و تشکیل بھی ہے۔اسلئے ان کی تحریروں میں خوشگوار طنز پایا جاتا ہے جو قاری کو لمحہ فکریہ مہیا کرتا ہے۔

JOIN FOR MORE!!!

(۹)جدت پسندی:

حسن نظامی اپنی جدت کی بناء پر مشہور ہیں۔ ان کی تحریروں میں بھی جدت کا رنگ نمایاں ہے اور خاص طور پر ان کی تحریروں کے عنوانات تو بہت ہی انوکھے ہوتے ہیں مثلاً فرام قبلہ ٹو شملہ، جھینگر کا جنازہ، مچھر کا اعلانِ جنگ، اینٹ چونے کا وصال، چٹکیاں اور گدگدیاں وغیرہ۔

(۱۰)جنگِ آزادی کے واقعات:

خواجہ حسن نظامی نے 1857ء کی جنگِ آزادی کے واقعات پر تحریریں لکھیں اور تاریخی حقیقتوں کو افسانے کے رنگ میں پیش کیا۔ اس سے ان کا مقصد صرف اس کیفیت کا بیان ہے جس سے مغلوں کی نئی نسل کو زوال حکومت کے بعد دوچار ہونا پڑا اور ان مظالم کو آشکارا کرنا تھا جو انگریزی تسلط کے بعد مسلمانوں کو برداشت کرنا پڑے۔

ناقدین کی آراء:

☆....علامہ اقبال نے فرمایا:

"میں شعر کہنا چھوڑ دیتا اگر مجھے حسن نظامی جیسی تحریر پر قدرت ہوتی"۔

☆....علامہ شبلی نعمانی کہتے ہیں:

"خواجہ صاحب نثر میں ایسی بے نظیر شاعری کرتے ہیں جس کا اثر آج کل کی نظموں میں بھی بہت کم پایا جاتا ہے"۔

☆....رام بابو سکسینہ کہتے ہیں:

"خواجہ حسن نظامی صوفی صحافی ہونے کی وجہ سے بااثر شخصیت کے مالک تھے"۔

☆....صلاح الدین احمد کہتے ہیں:

"خواجہ صاحب کو رنج والم کے مضامین بیان کرنے کا جو سلیقہ ہے اُس میں علامہ راشد الخیری کے علاوہ اُن کا کوئی ہم پلہ نہیں۔"

☆....بابائے اردو مولوی عبدالحق بیان کرتے ہیں:

"اگر تم صاف ستھری اور نکھری ہوئی اردو پڑھنا اور سیکھنا چاہتے ہو تو خواجہ صاحب کی تحریر پڑھو۔ زبان کے مزے کے ساتھ دلّی کی کیفیات اور جذبات کا لطف بھی آئے گا۔"

☆....ڈاکٹر کلیم الدین احمد کہتے ہیں:

"خواجہ صاحب کا اصل رنگ، خواجہ صاحب کی اصلی اہمیت اُن کی انشاء ہے۔ وہ نہایت ہی سادہ اور پُر تکلف طرز میں لکھتے ہیں۔"

☆.....☆.....☆

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS www.studypak.xyz

ابنِ انشاء

تعارف:

ابنِ انشاء اردو ادب کے ان چند مخصوص لوگوں میں سے ایک ہیں جو شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی۔ انھوں نے غزلیں، نظمیں اور گیت لکھے۔ شاعری میں ان کا ایک مخصوص انداز ہے۔ وہ کبھی کبیر داس کا لہجہ اختیار کرتے ہیں اور انسان دوستی کا پرچار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ایک انسان کو دوسرے انسان سے محبت کا سبق دیتے ہیں۔ کہیں اپنے اشعار میں زندگی کی اداسیوں، محرومیوں اور دکھوں کا میر تقی میر کی طرح

اظہار کرتے ہیں اور کہیں نظیر اکبر آبادی کی طرح علاقائی اور عوامی انداز اختیار کرتی ہیں اور بڑی سادگی، روانی اور عوامی زبان میں عوام کے احساس کو اردو ادب کا جامہ پہناتے ہیں۔

نثر کے میدان میں انھوں نے طنز نگاری کا انداز اختیار کیا۔ طنز میں مزاح کی آمیزش نے ان کی تحریروں کو زیادہ پر اثر بنا دیا۔ عوام سے قریب ہونے کے لئے انھوں نے اخبارات میں کالم نویسی کا آغاز کیا، سفر نامے لکھے، اس طرح اپنے مشاہدات اور تجربات کو طنز و مزاح کے پیرائے میں بیان کر کے شہرت حاصل کی۔ اردو ادب کی ان مختلف اصناف میں ابنِ انشاء نے بڑا نام کمایا۔ بنیادی طور پر ان کی شہرت ایک سفر نامہ نگار اور مزاح نگار کی سی ہے۔

مشہور تصانیف:

شعری کلام

1. چاند نگر (پہلا مجموعہ)
2. اس بستی کے اک کوچے میں (دوسرا مجموعہ)
3. چینی نظمیں

نثری تصانیف

اردو کی آخری کتاب	خمار گندم	چلتے ہو تو چین کو چلئے
آوارہ گرد کی ڈائری	دنیا گول ہے	ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں

JOIN FOR MORE!!!

طرزِ تحریر کی خصوصیات:

ابنِ انشاء کے طرزِ تحریر کی نمایاں خصوصیات ذیل میں درج ہیں۔

(۱) تسلسلِ مشاہدہ:

سفر نامہ چونکہ چشم دید واقعات پر مشتمل ہوتا ہے اس لئے اس میں شروع سے آخر تک تسلسل کا ہونا ضروری ہے۔ ابنِ انشاء کے سفر ناموں میں یہ خوبی نظر آتی ہے کہ وہ اپنے مشاہدات کو باہم گڈمڈ نہیں کرتے وہ بڑے سلیقے سے مختلف وقعات کو ایک کڑی میں پروتے ہیں۔ ہر مشاہدہ کو علیحدہ علیحدہ بیان کرتے ہیں۔ وہ تسلسل کے ساتھ ایک منظر کے بعد دوسرا منظر سامنے لاتے ہیں۔ اس طرح ان کا سفر نامہ مشاہدات اور تجربات کا ایک رنگین دفتر بن جاتا ہے۔ وہ تیکھے طنز اور شائستہ مسکراہٹوں سے اپنی تحریر کو اور زیادہ پر اثر بنا دیتے ہیں۔

(۲) طنز و مزاح کی آمیزش:

ابنِ انشاء اپنی تحریروں میں طنز و مزاح کو بڑے دلکش پیرائے میں استعمال کرنے کا فن جانتے ہیں اس لئے ان کے سفر ناموں میں طنز و مزاح کی آمیزش سے دلچسپی اور شگفتگی پیدا ہو گئی ہے۔ وہ جملوں اور فقروں میں طنز کی کیفیت شامل کر کے واقعات کے تانے بانے کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ قاری کا انہماک بڑھتا چلا جاتا ہے اور پھر مزاح کی باتیں مان کر اور پر لطف اور دلکش بنا دیتی ہے۔

(۳) مشاہدات میں قاری کی شمولیت:

یوں تو سفر نامہ ذاتی مشاہدات اور تجربات کو تحریر کرنے کا نام ہے لیکن سفر نامہ کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ لکھنے والا اپنے مشاہدات کو اس طرح پیش کرے کہ قاری کی نگاہوں کے سامنے بھی وہ مناظر آجائیں اور وہ بھی خود کو ہمسفر محسوس کرے۔ یہی وجہ ہے کہ قاری پوری سفر میں ان کا ہمسفر ہوتا ہے اور جو کچھ وہ محسوس کرتے ہیں وہی قاری بھی محسوس کرتا ہے۔

(۴) منظر کشی:

سفر نامے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ واقعات کے بیان کے ساتھ ماحول کی منظر کشی بھی کی جائے جو کچھ دیکھا جائے۔ کیونکہ کائنات میں

ہر طرف فطرت کے مناظر پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کا پر اثر بیان دل و دماغ کو متاثر کرتا ہے۔ وہ مناظر کی اس طرح تصویر کشی کرتے ہیں کہ کوئی بات رہ نہیں جاتی اور جس منظر سے کوئی خاص تاثر پیدا کرنا ہوتا ہے تو وہ اپنے مخصوص انداز اور تخیل کی رنگ آمیزی سی اسے اور بھی پر اثر اور نمایاں کر کے پیش کرتے ہیں اور قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے گویا وہ بھی اس منظر کو دیکھ رہا ہے یا خود وہاں موجود ہے۔

(۵) طنز و مزاح میں متانت:

ابنِ انشاء چونکہ اپنی تحریروں کو طنز و مزاح سے پر اثر بنانے کے عادی ہیں۔ اس لئے ان کی ہر تحریر میں ان کا یہ رنگ جھلکتا ہے۔ ان کے سفر نامے ان کے اس اندازِ تحریر کی واضح مثالیں ہیں۔ متانت اور سنجیدگی کے ساتھ طنز و مزاح کے میدان میں قدم رکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ابنِ انشاء کے یہاں طنز و مزاح کی یہی خوبی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ان کے مزاج کی شگفتگی اور لہجے کی متانت کے سبب مزاح کی کیفیت زیرِ لب تبسم تک رہتی ہے قہقہوں میں تبدیل نہیں ہوتی۔

(۶)سادگی و عام فہمی:

ابنِ انشاء کی زبان سادہ اور عام فہم ہے وہ نہایت سادہ انداز میں اپنی بات بیان کر دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کے پیشِ نظر عام قاری ہے جو ان کی تحریروں کو پڑھے گا۔ اس لئے وہ اس بات کا بطور خاص خیال رکھتے ہیں کہ بات سادہ اور پر اثر انداز میں کہی جائے۔ ان کی منفرد تحریر خود منہ سے بولتی ہے کہ اس کے خالق ابنِ انشاء ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی شاعری اور مضامین آج بھی عوام اور خواص میں مقبول ہیں۔

JOIN FOR MORE!!!

(۷)جزئیات نگاری:

ابن انشاء آنکھ بند کر کے سفر نامہ نہیں لکھتے بلکہ کھلی آنکھوں سے اپنے تمام احساسات کے ساتھ ان چیزوں کو دیکھتے اور تجزیہ کرتے ہیں

جو دورانِ

سفر انھیں در پیش ہوتی ہیں اور پھر نہایت تفصیل کے ساتھ قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

(۸)کالم نگاری:

ابن انشاء نے کالم نگاری کا آغاز روزنامہ "امروز" سے کیا۔ 1955ء میں مولانا چراغ حسن حسرت کے انتقال کے بعد ان کا کالم کراچی سے کئی سال تک ابن انشاء لکھتے رہے۔ 1965ء میں انجام میں "باتیں انشاء جی کی" کے عنوان سے لکھنا شروع کیا اور یہ سلسلہ ان کے آخری ایام تک چلتا رہا۔ ان کے کالموں نے ان کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔ ان کا طنز و مزاح اور شگفتہ نثر نگاری بے حد مقبول اور معروف ہوئی۔

(۹)تراجم:

ابن انشاء ایک بہترین اور کامیاب مترجم بھی تھے۔ انھوں نے بہت سی نثری اور منظوم کتابوں کا اردو میں شاندار ترجمہ کیا۔ یوں تو انشاء جی نے بہت کتابوں کے اردو میں ترجمے کئے مگر ان میں بہت زیادہ مقبول اور مشہور یہ ہیں:

ا۔ جان سٹین کے مشہور ناول "دی مون از ڈاؤن" کا اردو ترجمہ "شہر پناہ" کے نام سے کیا۔

۲۔ ایڈ گر ایمن پو کی پر اسرار کہانیوں کا اردو ترجمہ "اندھا کنواں" کے نام سے کیا۔

۳۔ امریکی مصنف او ہنری کی بیس کہانیوں کا اردو میں ترجمہ "لاکھوں کا شہر" کے نام سے کیا۔

۴۔ ولہیم بش کی روسی کہانی "شلجم کیسے اکھڑا" کو بھی اردو کا جامہ پہنایا۔

(۱۰)بچوں کیلئے کتابیں:

ابن انشاء کو بچوں سے بہت پیار تھا۔ انھوں نے بچوں کیلئے نظمیں لکھنے کا سلسلہ شروع کیا جن کی پہلی کتابی صورت "بلو کا بستہ" اور دوسری نظمیں تھی۔ یہ کتاب 1957ء میں شائع ہوئی۔ 29 نظموں پر مشتمل اس خوبصورت کتاب کا تعارف نامہ بابائے اردو مولوی عبد الحق نے تحریر کیا

اور ابن انشاء کی اس کاوش کو سراہا۔ ابن انشاء بچوں کیلئے وقتاً فوقتاً نظموں اور منظوم کہانیوں کے گلدستے پیش کرتے رہے۔ ان کہانیوں کی زبان نہایت سلیس اور اندازِ بیاں نہایت شگفتہ ہے۔

ناقدین کی آراء:

☆.... ان کی موت پر سید ضمیر جعفری کے تاثرات سے ان کا مقام اور مرتبہ عیاں ہوتا ہے:

"ابن انشاء چل بسے۔ چاند نگر کی روشنی دوستوں سے روٹھ گئی اور اردو کا عظیم بنجارہ اپنی عمر کی پونجی لٹا کر کوچ کر گیا۔ اردو نثر میں شگفتگی کا سدابہار آبشار تھم گیا۔"

☆.... مشہور صحافی جناب نصر اللہ خان اپنی کتاب "کیا قافلہ جاتا ہے" میں ابن انشاء کے بارے میں لکھتے ہیں:

"انشاء جی صحافی سے زیادہ ادیب تھے۔ وہ اخبار کے کالم نویس اتنے نہیں تھے جتنے اخبار کے ادبی مزاح نگار تھے۔"

حرفِ آخر:

ابن انشاء کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ اپنے عہد کے بلند پایہ مصنف، شاعر، مزاح نگار، مترجم اور اعلیٰ علمی شعری اور ادبی روایات کے وارث تھے۔ المختصر یہ کہ ابن انشاء نے اپنی تحریروں کے ذریعے دنیائے ادب میں ایک معتبر مقام حاصل کیا۔ ان کی تحریریں، مضامین، سفر نامے اور شاعری آج بھی ادب کے قاری کے لیے دلچسپی و مسکراہٹ بکھیرنے کا سامان مہیا کرتی ہے۔ وقت نے انھیں مہلت نہ دی مگر پھر بھی انھوں نے جو کچھ بھی لکھا بہت خوب اور بہت عمدہ لکھا۔

☆......☆......☆

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS BASIM
www.studypak.xyz

شاعری پر تبصرہ

JOIN FOR MORE!!!
www.studypak.xyz
M.H

طریقۂ جواب سوال نمبر ۸: شاعر کے طرزِ تحریر کی خصوصیات

۱۵ نمبر کے اس سوال کے جواب کے لیے صدرِ ممتحن کے ہدایت ناموں کو پیشِ نظر رکھا جائے تو اُن کا حاصل درج ذیل ہو گا:

(الف) عمدہ تمہید۔

(ب) دس سے بارہ خصوصیات، تکرار نہ ہو، ہر خصوصیت کی وضاحت کے لیے مناسب شعر۔

(ج) تین، چار مستند ناقدین کی آراء۔

جوابی خاکہ

ابتدائیہ:

کلام کی خصوصیات:

۱۔----------

شعر: --

۲۔----------

شعر: --

ناقدین کی آراء:

۱) -------------

"--"

۲) -------------

"--"

۳) -------------

"--"

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS
www.studypak.xyz

شاعری پر تبصرہ

میر تقی میر

تعارف:

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہر گز تا حشر جہاں میں میرا دیوان رہے گا

اس عظیم شاعر کا نام محمد تقی اور تخلص میر تھا۔ ۱۷۲۳ء میں اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید عبد اللہ تھا لیکن وہ علی متقی کی عرفیت سے مشہور ہیں۔ میر کی شاعرانہ تعلّی اپنی جگہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ میر کو اس دور کے شعراء اور نقادوں نے خدائے سخن تسلیم کیا۔

JOIN FOR MORE!!!

مشہور تصانیف:

میر تقی میر کی غزلوں کے چھ (۶) دیوان ہیں۔ آپ نے "ذکرِ میرؔ" کے نام سے آپ بیتی بھی لکھی۔

میر تقی میر کے محاسن کلام:

میر تقی میر کے نمایاں محاسن کلام درج ذیل ہیں:۔

(۱) سوز و گداز:

میر کا عہد افراتفری کا دور تھا۔ اگر میر میں زمانے کی چوٹ کھانے اور زخم سہنے کی عادت نہ ہوتی تو زمانے کی بھیانک آندھی کے سامنے ان کی شخصیت اور شاعری کا چراغ گل ہو جاتا اس لئے میر کی رام کہانی اس عہد کی داستان معلوم ہوتی ہے۔ میر کی تنہائی پسندی اور خلوت نشینی انھیں اپنے عہد اور ماحول کی ترجمانی سے باز نہ رکھ سکی۔ اس عہد کی افراتفری، ذہنی انتشار، سکون کی تلاش، شرفاء کی پریشان حالی اور معاش کی قلت کی جیتی جاگتی تصویریں ہمیں ان کے کلام سے ملتی ہیں۔

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے، صبح ہوئی آرام کیا
مجھ کو شاعر نہ کہو میر صاحب کہ میں نے
درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

(۲) تصور عشق:

میر کی دنیا میں عشق کی حکمرانی ہے جس میں ان کے خاندان کی تہذیب اور معاشرتی روایات کو بڑا دخل ہے ان کو شروع ہی سے عشق و محبت کی تعلیم دی گئی تھی۔ عکس کلام پیشِ نظر ہے:

اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے اک درد جگر میں ہوتا ہے
ہم راتوں کو اٹھ کر روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے
دل تڑپے ہے جان کھپے ہے، حال جگر کیا ہوگا
مجنوں مجنوں لوگ کہے ہیں مجنوں کیا ہم سا ہوگا

(۳) دردوالم:

غم انسانی زندگی کا لازمی جزو ہے۔ انسانیت غم سے اور زیادہ سنورتی ہے یہ غم ہی ہے جس نے میر کی شاعری میں حسن، موسیقیت، معصومانہ تخیل اور روانی و تاثر پیدا کر دیا ہے۔

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح
تو کب تک میرے منہ کو دھوتا رہے گا
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ
ہے نام مجلسوں میں میرا میر بد دماغ

(۴) جذبات کی قربانی:

جب میر اپنے احساسات اور تاثرات کو صفائی اور درد انگیزی کے ساتھ بیان کرتے ہیں تو ان کے اشعار میں ایسا ترنم پیدا ہوتا ہے گویا ان کی روح موسیقی میں آ بسی ہے وہ الفاظ میں ایسا جادو بھر دیتے ہیں جس سے دل پر چوٹ سے لگتی ہے۔ میر نے اپنے غم انگیز وجدان سے ایک الگ دنیا تعمیر کی ہے جو اپنی عظمت اور رنگ روپ کے اعتبار سے بالکل نئی ہے۔ ان کی شاعری میں رمزیت بھی پائی جاتی ہے۔ عکسِ کلام پیشِ نظر ہے:۔

JOIN FOR MORE!!!

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

(۵) خودداری:

میر کی ایک اور خصوصیت ان کی غیرت اور خودداری ہے۔ وہ امراء اور رؤسا سے میل جول کو پسند نہ کرتے تھے کہ اس سے ان کی خودداری کو ٹھیس نہ لگے۔ وہ بے حد کم گو اور آزاد طبیعت واقع ہوئے تھے۔ مفلسی اور درویشی نے ان کی اعلیٰ ظرفی کو اور بلند تر کر دیا تھا۔ اسی خودداری کی واضح جھلک ان کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر:۔

آگے کسی کے کیا کریں دستِ طمع دراز
ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

(۶) تصوف وفلسفہ:

میر تصوف کے نہیں تغزل کے شاعر ہیں لیکن اس دور کے رواج کے مطابق ان کی شاعری میں عارفانہ مضامین بھی ملتے ہیں۔ اسی طرح ان کی شاعری میں فلسفہ کا اثر بھی پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ فلسفہ کوئی ٹھوس حقیقت نہیں ہے۔ مثلاً ۔

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا
سرسری تم جہاں سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

(۷) عام فہم انداز:

میر کے کلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کا انداز نہایت عام فہم ہے جس کو ہر عام و خاص آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ میر اپنے کلام کے بارے میں خود کہتے ہیں: ۔

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
گفتگو پر مجھے عوام سے ہے

(۸) صنائع وبدائع:

میر کو اسالیب بیان پر بڑی قدرت حاصل تھی انھوں نے اکثر فارسی تراکیب یا ان کے ترجموں کو انتہائی خوبصورتی سے اپنے کلام میں سمویا ہے۔ اسی طرح تشبیہیں اور استعارے جو ہر شاعری کی جان ہوتی ہیں، اگر خوبصورتی سے برتے جائیں تو شعر کا حسن دوبالا کر دیتے ہیں۔ میر نے ان کا استعمال بھی دلکش انداز میں کیا ہے۔ عکسِ کلام پیش ہے: ؎

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے	پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
میر ان نیم باز آنکھوں میں	ساری مستی شراب کی سی ہے

(۹) رمزیت وایمائیت:

شاعری عموماً اور غزل خصوصاً رمز وایماء کا فن ہے یعنی بات کو ڈھانک چھپا کر بیان کرنا۔ اپنے کلام کی اس خصوصیت کا اظہار میر نے اپنے اس شعر میں کیا ہے: ؎

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

(۱۰) موسیقیت:

میر نرم اور لطیف الفاظ کو اپنے اشعار میں نہایت سلیقہ مندی سے استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح ان کے کلام میں نغمگی اور موسیقی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ خوبی میر کی ان غزلوں میں خاص طور پر نمایاں ہے جو طویل بحروں میں کہی گئی ہیں، مثلاً: ؎

پتا پتا، بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے

عظمتِ میر:

☆.... مجنوں گورکھ پوری کہتے ہیں:

”اردو شاعری بھی اپنا خدا رکھتی ہے اور وہ میر کہلاتا ہے۔“

☆.... ڈاکٹر ابو اللیث کہتے ہیں:

”میر تقی میر شہنشاہ سخن ہیں۔ ان کا کلام جیسا ان کے زمانے میں مقبول تھا ویسا آج بھی مقبول ہے بلکہ دورِ جدید میں غزل کی احیاء کے ساتھ طرز میر کی طرف رجعت ایک اہم رجحان ہے۔ جس سے میر کے کلام کی ہمہ گیر آفاقیت اور ابدیت کا ثبوت ملتا ہے۔“

☆.... مولوی عبد الحق کہتے ہیں:

”میر تقی میر سر تاج شعرائے اردو ہیں۔ ان کا کلام اسی ذوق وشوق سے پڑھا جائے گا جیسے سعدی کا کلام فارسی زبان میں۔“

☆.... ڈاکٹر سید عبد اللہ کہتے ہیں:

”اردو کے بہت کم شاعروں کے یہاں حقائق کی جستجو کے لئے اتنی تڑپ پائی جاتی ہے جتنی کے میر کے کلام میں۔“

☆.... غالب کہتے ہیں: ؎

JOIN FOR MORE!!! M.HAR... www.stud...xyz

ریختہ کے تم ہی استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

☆.... ذوق کہتے ہیں:

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

☆.... ابنِ انشاء کہتے ہیں:

اک بات کہو تو انشاؔء جی، تمھیں ریختہ کہتے عمر ہوئی
تم ایک جہاں کا علم پڑھے، کوئی میرؔ سا شعر کہا تم نے؟

☆.... حسرت موہانی کہتے ہیں:

شعر میرے بھی ہیں پُر درد لیکن حسرؔت
میرؔ کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں؟

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS www.studypak.xyz

خواجہ میر دردؔ

تعارف:

سید خواجہ میر نام اور درد تخلص تھا۔ درد اردو ادب میں صوفی شاعر کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ باپ کا نام محمد ناصر عندلیب تھا۔ ۱۷۱۹ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد صاحب ایک صاحب دیوانِ صوفی شاعر اور گوشہ نشیں بزرگ تھے۔ درد کی تعلیم اسی دینی ماحول میں ہوئی۔ خواجہ صاحب نے ابتداء میں فوج کی ملازمت کی لیکن والد کے حکم پر ملازمت چھوڑ کر اٹھائیس برس کی عمر میں گوشہ نشیں ہوگئے اور باپ کے انتقال کے بعد ان کی سجادہ نشیں اور قائم مقام ہوئے۔ اس کا اثر ان کی شاعری پر پڑا اور درد نے غزل میں تصوفانہ خیالات داخل کیے۔

خصوصیاتِ کلام:

خواجہ میر درد کے نمایاں محاسنِ کلام درج ذیل ہیں:

(۱) تصوف:

تصوف "صوفیت" سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے اللہ تبارک و تعالیٰ کا عشق۔ درد پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اسے فن بنایا۔ خواجہ میر درد نے تصوف میں جو کہا آج تک کسی سے نہ ہوا۔ درد کی عظمت اس میں ہے کہ ان کی شاعری ایک صوفی کی شاعری معلوم ہوتی ہیں۔ وہ صوفیانہ عقائد اور مسائل کا تذکرہ ہی نہیں کرتے بلکہ ان کی شاعری کا قالب و لہجہ صوفیانہ ہے۔ مثال کے طور پر:

جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
ارض و سما کہاں تیری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے کہ جہاں تو سما سکے

(۲) قناعت پسندی:

درد ان کی شاعری میں مصائب زندگی کے خلاف شکوہ شکایت کا وہ رنگ موجود نہیں جو میر کے کلام میں ملتا ہے۔ ان کی فریاد میں تلخی و

یاس نہیں۔ جبکہ زمانے کی ہلاکت خیزیوں کے سامنے بڑے بڑے ثابت قدم ہار گئے، درد نے اپنا ثبات اور استقلال نہ چھوڑا۔ انھوں نے اپنے دور کے واقعات کے اشارات بھی بہت کم کیے ہیں اور حالات کے گرم و سرد کو اپنی فطرت اور سینے میں سمو لیا ہے۔ عکسِ کلام پیش ہے:

آیا نہ اعتدال میں ہر گز مزاجِ دہر
میں گرچہ گرم و سرد زمانہ سمو گیا

(۳) خود ستائی:

درد کے کلام میں خود ستائی کا عنصر بھی واضح رہا۔ کہیں کہیں وہ اپنی تعریف کرتے دکھائی دیئے۔ مثلاً: ؎

پھولے گا اس زبان میں گلزارِ معرفت
یاں میں زمینِ شعر میں یہ تخم بو گیا

(۴) دنیا کی بے ثباتی:

درد چونکہ صوفی شاعر ہیں اور ان کا دل خالقِ حقیقی کے عشق سے سرشار ہے اسلئے انھوں ے ہمیشہ اپنے کلام کے ذریعے اس امر کو واضح کیا کہ دنیا حقیقی ٹھکانہ نہیں بلکہ حقیقی گھر تو آخرت ہے۔ درد کے کلام میں ہمیں جابجا دنیا کی حقیقت اور بے ثباتی عیاں نظر آتی ہے۔ مثلاً: ؎

JOIN FOR MORE!!!

وائے نادانی! وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا

درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے، کدھر چلے

(۵) سوز و گداز:

درد کے کلام میں سوز و گداز کثرت سے موجود ہے۔ وہ اکثر سوز کو بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام میں دنیا کے ہموم و غموم اور مصائب و آلام کا تذکرہ کثرت سے ملتا ہے۔ بلکہ انھوں نے تو زندگی کو طوفان کہہ ڈالا: ؎

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

(۶) وحدت الوجود:

صوفیاء کے دو مختلف مکتبہ خیال ہیں۔ پہلا وحدت الوجود، ان لوگوں کا خیال ہے کہ کائنات کی تمام چیزیں وجود حقیقی کا حصہ ہیں اور ہر شے میں اس کا جلوہ نظر آتا ہے۔ دوسرا وحدت الشہود، ان لوگوں کا خیال ہے کہ تمام اشیاء خدا نے خارج سے پیدا کیں ہیں اور کائنات کی تمام چیزیں مظہر خداوندی ہیں۔ درد وحدت الوجود کے نظریہ کے قائل ہیں۔ مثلاً: ؎

ہے غلط گر گماں میں کچھ ہے
تجھ سوا بھی جہاں میں کچھ ہے

(۷) شرفِ انسانیت:

درد کے یہاں عظمتِ انسانی کا احساس سب سے زیادہ ہے۔ وہ صوفیانہ آداب محفل جو شاہ عالم کو بھری محفل میں ٹوک دیتے ہیں۔ ان کے کلام میں جگہ جگہ پائی جاتی ہیں۔ وہ جگہ جگہ انسانیت کی عظمت کا پرچار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً: ؎

باغِ جہاں کے گل ہیں یا خار ہیں تو ہم ہیں
گر یار ہیں تو ہم ہیں، اغیار ہیں تو ہم ہیں

وابستہ ہے ہمیں سے گر جبر و گر قدر

مجبور ہیں تو ہم ہیں، مختار ہیں تو ہم ہیں

(۸) رنگِ تغزل:

درد کے یہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں جن میں خالص عشق کا انداز پایا جاتا ہے لیکن انھوں نے جو عشقیہ اشعار کہے ہیں اور حسن و عشق کے نغمے الاپے ہیں اس میں بھی پاکیزگی تخیل اور احترامِ حسن و عشق پایا جاتا ہے۔ مثلاً:

اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں

ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

(۹) اخلاقی مضامین:

درد کی شاعری میں ہمیں جابجا اخلاقی مضامین بھی ملتے ہیں، مثلاً:

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

ورنہ طاعت کیلیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

JOIN FOR MORE!!!

(۱۱) بلاغت:

اچھا شاعر وہ ہوتا ہے جس کی بات پڑھنے والا آسانی سے اور فوراً سمجھ جائے۔ اس خوبی کے لیے زبان و بیان پر پوری قدرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ درد اس خوبی سے مالا مال ہیں۔ زبان و بیان پر انھیں مکمل عبور حاصل ہے۔ الفاظ کے چناؤ میں بھی انھیں بڑی مہارت حاصل ہے۔ اسی لیے ان کا کلام ہر پڑھنے والا نہ صرف فوری طور پر سمجھ جاتا ہے بلکہ اس میں موجود پیغام بھی قبول کر لیتا ہے۔ مثلاً

ان دنوں کچھ عجب ہے میرا حال

دیکھتا کچھ ہوں دھیان میں کچھ ہے

ناقدین کی آراء:

☆.... میر تقی میر کہتے ہیں:

"دردؔ ریختہ کا زور آور شاعر ہے۔"

☆.... محمد حسین آزاد کہتے ہیں:

"چھوٹی چھوٹی بحروں میں جو اکثر غزلیں لکھتے ہیں گویا تلواروں کی آبداری نشتر میں بھر دیتے ہیں۔"

☆.... امیر مینائی ان کے کلام کے بارے میں کہتے ہیں:

"یہ پسی ہوئی بجلیاں معلوم ہوتی ہیں"۔

☆.... رام بابو سکسینہ کہتے ہیں:

"دردؔ اردو شاعری کے تاج کا سب سے بڑا ہیرا ہے۔"

☆.... میر حسن ان کے کلام کے بارے میں کہتے ہیں:

"خواجہ میر دردؔ کا کلام اگرچہ مختصر ہے لیکن حافظ کے کلام کی طرح سراپا انتخاب ہے"۔

☆.... مرزا علی خاں لطف فرماتے ہیں:

"اگرچہ دیوان مختصر ہے مگر سراپا درد و اثر ہے۔"

☆.... عظمت اللہ خان تحریر فرماتے ہیں:

"خواجہ میر دردؔ اردو ادبیات میں صوفیانہ شاعری کے باوا آدم ہیں۔"

مرزا اسد اللہ خان غالب

حرفِ آغاز:

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے   کوئی بتلاوے کہ ہم بتلائیں کیا

مرزا اسد اللہ خان غالب کا تعارف کرانا بلاشبہ سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ وہ اردو شاعری کی دنیا کا وہ درخشاں آفتاب ہیں جو تا قیامت اسی آب و تاب سے روشن رہے گا۔ غالب بحیثیت شاعر ایک ایسی شخصیت ہے جو زمان و مکان کی قید سے آزاد ہیں۔ وہ ایک مکمل دور ہیں۔ غالب کو اردو کا پہلا فلسفی شاعر کہا جاتا ہے۔ وہ ایک منفرد اندازِ فکر کے بانی ہیں۔ ان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کے دیوان کو ہندوستان کی الہامی کتاب تسلیم کیا گیا۔ ان کی شاعرانہ عظمت کو ہر دور میں تسلیم کیا گیا۔ خود وہ بھی اس کا ادراک رکھتے ہیں، چنانچہ رقم طراز ہیں:

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیان اور

خصوصیاتِ کلامِ غالب:

JOIN FOR MORE!!!

غالب کی ریختہ نگاری کی نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں:

(۱) جدت طرازی:

غالب کے قصرِ نظم و نثر کی بنیاد ہی جدتِ خیال و بیان پر رکھی گئی ہے۔ ان کی اختراع پسند طبیعت بیان کے نئے نئے پیرائے تلاش کرتی ہے۔ یہ جدت ادامیں، مضامین میں، تشبیہات میں، استعارات میں، خیال میں، غرض ہر پہلو میں نمایاں ہوتی ہے۔ بقول حالیؔ:

"جس روش پر دوسرے چل رہے تھے مرزا نے اس سے الگ ایک نئی روش اختیار کی۔"

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زودِ پشیماں کا پشیماں ہونا

(۲) جدتِ ادا:

غالب کی شاعری میں جہاں نت نئے موضوعات بیان ہوئے ہیں۔ وہاں ان کا طرزِ ادا بھی بہت مختلف اور منفرد ہے۔ وہ معمولی مضامین اس حسن و خوبی سے شعر میں باندھتے ہیں کہ دل میں اتر جاتے ہیں۔ غالب کی شاعرانہ عظمت کا قصر ان کی جدت طرازی پر تعمیر ہوا ہے۔ مثلاً:

تیری وفا سے کیا ہو تلافی، کہ دھر میں
تیرے سوا بھی ہم پر بہت سے ستم ہوئے

(۳) فکر و فلسفہ:

غالب کا مزاج فلسفیانہ ہے۔ وہ حیات و کائنات کے مختلف پہلوؤں پر مفکرانہ اور حکیمانہ خیالات رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے غزل حدیث دلبری سے بڑھ کر حدیثِ زندگی بن گئی ہے۔ غالب کا یہ فلسفہ زندگی کی پرپیچ راہوں میں روشنی کی مانند ہے۔ عکسِ کلام ملاحظہ کیجئے:

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ!
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے
بازیچۂ اطفال ہے دنیا میرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے

(۴) روایت سے بغاوت:

غالب طبعاً ایک جدت طراز اور روایت شکن شاعر تھے۔ وہ زندگی میں تقلید کی روش کو پسند نہیں کرتے۔ انھوں نے روایت پرستی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور زندگی کو عطیہ خداوندی سمجھ کر اس کے گوناگوں حسن کی طرف اپنی چشم تماشا کو وا کیا۔ انھوں نے زندگی کی تکلیفوں پر کڑھنے کے بجائے ایک حوصلے سے کام لیا۔ وہ ایسی روایات پر بھی بیباکانہ تنقید کرتے ہیں جو ہمارے لئے مسلماتِ شعری کا درجہ رکھتی ہیں۔ مثلاً:

ایسی جنت کا کیا کرے کوئی
جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

(۵) ندرتِ خیال:

خیال کی ندرت غالب کی بہت اہم خصوصیت ہے۔ وہ غزل کے انوکھے مضامین کو زیادہ موثر اور شگفتہ بنانے کے لئے خوبصورت تراکیب، استعارات اور نادر تشبیہات سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً:

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

(۶) جذبۂ عشق:

غالب کا نظریۂ عشق بھی اوروں سے مختلف ہے۔ نہ وہ سوز و گداز ہے اور نہ وہ سپردگی اور والہانہ پن ہے۔ ان کے درد و غم پر ہنس لینے کا جذبہ موجود ہے۔ عشق کی وجدانی اور حیات کی آسودگی کا اظہار بھی ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی، درد بے دوا پایا

(۷) حقیقت پسندی:

غالب فطرتِ انسانی اور نفسیات کے گہرے رمز آشنا تھے۔ وہ زندگی اور اس کے مصائب و وسائل کو حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھتے تھے۔ انھیں انسانی نفسیات کا گہرا شعور حاصل ہے۔ اور انھوں نے اپنے اس شعور سے نہایت مفید نتائج اخذ کئے ہیں۔ مثلاً:

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پہ کہ آساں ہوگئیں

(۸) مضمون آفرینی:

غالب کے نزدیک شاعری محض قافیہ پیمائی نہیں، بلکہ مضمون آفرینی ہے۔ وہ اشعار میں خیال افروز نکات اور باریکیاں بیان کرتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے:

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

JOIN FOR MORE!!!

(۹) ایجاز واختصار:

غزل میں بات ڈھکا چھپا کر کہنا ان کی بنیادی خصوصیت ہے۔ غالب کم سے کم الفاظ میں بڑے بڑے مضامین یوں ادا کرتے ہیں گویا دریا کو کوزے میں بند کرتے ہیں۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے: ؎

کیا فرض ہے سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نا ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

(۱۰) غم پسندی:

غالب غم کو بخوشی دل سے لگائے ہوئے ہیں۔ ان کے نظریۂ زندگی کے مطابق زندگی کے ہنگاموں میں احساسِ غم کا بہت بڑا حصہ ہے۔ زندگی کی یہ ہماہمی نوحۂ غم، یا نغمۂ الم کی وجہ سے قائم ہے۔ ؎

نالہ ہائے غم کو بھی اے دل! غنیمت جانیئے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

(۱۱) تصوف:

JOIN FOR MORE!!!

غالب کی غزل میں ہمیں تصوف کے حقائق بھی جا بجا ملتے ہیں۔ جب وہ اس کائنات کو ایک صوفی کی نظر سے دیکھتے ہیں تو معرفت کے نہایت پاکیزہ اور باریک نکتے بیان کرتے ہیں۔ مثلاً: ؎

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

مسائلِ تصوف کو بیان کرتے ہوئے خود سے مخاطب ہیں:

یہ مسائلِ تصوف، یہ تیرا اندازِ بیاں غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

(۱۲) نئی تراکیب:

مرزا غالب چوں کہ ہر کام میں جدّت کے قائل تھے۔ اسی لیے انھوں نے اردو زبان کو نئی نئی تراکیب اور نئے الفاظ عطا کیے جس سے اردو غزل کو ایک نئی آن بان ملی اور اس کی دلکشی اور جاذبیت میں اضافہ ہوا۔ ان نئی تراکیب کا استعمال غالب نے اس خوب صورتی سے کیا کہ وہی شعر کا حسن بن گئیں

۔ان کے دیوان کا آغاز ہی ایسے شعر سے ہوتا ہے جس میں چار نئی تراکیب استعمال ہوئی ہیں۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

اس شعر میں "نقش فریادی، شوخیٔ تحریر، کاغذی پیرہن اور پیکرِ تصویر"، چار نئی تراکیب استعمال کی گئی ہیں جو نئی ہونے کے باوجود غیر مانوس محسوس نہیں ہوتیں۔ اور یہ تراکیب ہی شعر کی جان بن گئی ہیں۔

عظمتِ غالب:

☆.... مجنوں گورکھپوری کہتے ہیں:

"غالب اردو شاعری کے نئے رہنما ہیں اور دیوانِ غالب اردو کا نیا موڑ ہے۔"

☆....ڈاکٹر سید عبد اللہ غالب کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"غالب کی غزل عام اہلِ ذوق کے لئے اس لئے زیادہ دلپسند واقع ہوئی ہے کہ اس میں ہم جس انسان سے متعارف ہوتے ہیں اس میں زندگی کی تڑپ زیادہ ہے اس لئے شخصیت میں تمنائے حیات کا عنصر زیادہ ہے۔"

☆....ڈاکٹر فرمان فتح پوری کہتے ہیں:

"ان کی ظرافت نے ان کی انانیت سے دوچار ہو کر ہمہ گیر طنز کی صورت اختیار کر لی تھی۔"

☆....ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری کہتے ہیں:

"ہندوستان کی دو الہامی کتابیں ہیں، ایک ویدِ اور دوسری دیوانِ غالب۔"

☆....پروفیسر رشید احمد صدیقی کہتے ہیں:

"مغلوں نے ہندوستان کو تین تحفے دیے، تاج محل، اردو اور مرزا غالب۔"

☆.... خلیل الرحمن اعظمی کہتے ہیں:

"غالب کے اشعار ایک تراشے ہوئے نگینے کی مانند ہیں جو ہر پہلو سے ایک نیا انداز دکھاتا ہے۔"

☆.... فیض لکھتے ہیں:

"غالب ایک فرد نہیں ایک نسل ہے۔ ایک ایسی نسل کا نغمہ جو دفنائی نہیں گئی۔"

☆.... خود غالب اپنے بارے میں کہتے ہیں:

درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سانہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہیں ہوا

JOIN FOR MORE!!!

حرف آخر:

غالب کی جدت پسندانہ، فلسفہ کی گہرائی، انسانی فطرت سے مکمل واقفیت، حکیمانہ تخیل، خیال کی بلندی، ندرتِ کلام، یہ تمام خوبیاں مل کر ان کو ایک بلند اور عظیم شاعر ثابت کرتی ہیں۔ خود غالب کا کہنا ہے ۔

اگر اپنا کہا آپ سمجھے تو کیا سمجھے
کلامِ میر سمجھے اور زبانِ مرزا سمجھے

مزا کہنے کا جب ہے ایک کہے اور دوسرا سمجھے
مگر اپنا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

www.studypak.xyz

فیض احمد فیض

تعارف:

اردو شعر کو بامقصد بنانے کا آغاز، جیسا کہ تاریخ ادب کا ہر طالب علم جانتا ہے، سر سید تحریک کی بدولت انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیسویں صدی میں قدیم کلاسیکی طرز کے شاعر رفتہ رفتہ اپنی عمریں پوری کر کے ختم ہوتے چلے گئے، جدید تعلیم سے آراستہ اور حالی کی تحریک سے متاثر شعراء کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔

فیض بھی ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوئے اور ان کی شاعری نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ پہلے ان کا غم ذاتی تھا اب اجتماعی ہو گیا۔ اس دور میں انھوں نے انہی اقدار کی ترجمانی کی ہے جو اس دور کے تمام ترقی پسند ادیبوں میں پائی جاتی ہیں۔

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

مشہور تصانیف:

فیض کی مشہور تصانیف درج ذیل ہیں:

۱۔ نقش فریادی (مجموعہ کلام) ۲۔ دستِ صبا(مجموعہ کلام) ۳۔ زنداں نامہ (مجموعہ کلام)

۴۔ مرے دل مرے مسافر ۵۔ نسخہ ہائے وفا(کلیات)

فیض کی غزل کی خصوصیات:

کلامِ فیض کی نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں:

(۱) مقصدیت:

فیض کی مقصدیت ان کی غزل کے اشعار سے پوری طرح محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً

اک طرزِ تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

(۲) ترقی پسندی:

فیض ایک ترقی پسند شاعر ہیں، ان کی شاعری زلف ورخ کے ارد گرد گھومنے کے بجائے اپنی قوم کی ترقی کیلئے کوشاں نظر آتی ہے۔ وہ اپنے کلام کے ذریعے اپنی خوابیدہ قوم کی حوصلہ افزائی کرتے نظر آتے ہیں۔ مثلا:

اے خاک نشینو! اٹھ بیٹھو، وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے، جب تاج اُچھالے جائیں گے

JOIN FOR MORE!!!

(۳) حسن وجمال:

ان کی زبان عام فہم اور سادہ ہونے کے باوجود پختہ اور غزل گوئی میں رچی بسی معلوم ہوتی ہے۔ کہیں کہیں وہ انتہائی نزاکت کے ساتھ حسن وجمال کو بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے:

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آئی
رنگ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسمِ گل ہے تمہارے بام پہ آنے کا نام

(۴) سوزوگداز:

وہ عام سوزوگداز، جو غزل کے ساتھ مخصوص ہے، انھوں نے پوری طرح برقرار رکھا ہے۔ نمونہ کلام درج ذیل ہیں:

ہاں جو جفا بھی آپ نے کی قاعدے سے کی
ہاں، ہم ہی کاربندِ اصولِ وفا نہ تھے

(۵) محاکات:

فیض کی شاعری کی ایک اور خصوصیت محاکات ہے۔ محبوب کے سراپا کے ساتھ ساتھ انھوں نے فطرت کی منظر کشی کی ہے۔

گداز جسم قبا جس پہ سج کے ناز کرے
عکسِ جاناں کو وداع کر کے اٹھی میری نظر

(۶) رقیب کا تصور:

اردو شاعری میں رقیب کا کردار ہمیشہ سے باعثِ ملامت رہا ہے۔ اور شاعر نے اس کو اپنا دشمن گردانا ہے۔ اور اس کے وجود کو حقارت کی نظر سے دیکھا ہے۔ لیکن فیض نے اردو شاعری میں ایک نئی روایت کی بنیاد رکھی ہے اور رقیب کو بھی معاملاتِ محبت میں اپنا دوست اور غم گسار بنا کر گلے لگایا ہے۔ اور اس سے راز و نیاز کئے ہیں۔ مثلاً: ؎

تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی، وہ رخسار، وہ لب
زندگی جن کے تصور میں لٹادی ہم نے

(۷) سیاسی رنگ:

فیض کی غزلوں میں سیاسی رنگ نمایاں ہے۔ وہ ایک مخصوص سیاسی نظریات کے ترجمان تھے اور انھیں اس صفت کی وجہ سے وہ شہرت حاصل ہوئی جو کسی دوسرے ترقی پسند شاعر کو حاصل نہ ہو سکی۔ مثلاً ؎

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

JOIN FOR MORE!!!

(۸) منفرد اندازِ بیاں:

فیض کی ایک خوبی نئی علامتیں اور تراکیب کا استعمال بھی ہے۔ فیض ترقی پسند ہونے کے باوجود قدیم اور روایتی شاعری سے باغی نہیں ہیں۔ انھوں نے قدیم غزل کے مضامین کو نئے مطالب سے نوازا۔ بقولِ شخصے انھوں نے پرانے درختوں میں نئے پھل لگائے ہیں۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

(۹) انقلابی موضوعات:

فیض کی شاعری کی اہم خوبی ان کی انقلابی شاعری ہے۔ ان کے دل میں وطن اور عوام سے محبت کا جذبہ موجیں مارتا ہوا نظر آتا ہے۔ فیض لوگوں کو مسائل میں جکڑا ہوا دیکھتے ہیں تو تڑپ جاتے ہیں اور ان کے کلام میں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ بغاوت اور انقلاب کے نعرے تشبیہ و استعارات میں لگاتے ہیں۔

ادھر تقاضے ہیں مصلحت کے، اِدھر تقاضہ ءِ دردِ دل
زباں سنبھالیں کہ دل سنبھالیں، اسیر ذکرِ وطن سے پہلے

(۱۰) عشق کی شدت:

فیض اپنے محبوب سے محبت وارفتگی کی حد تک کرتے ہیں۔ اپنے کلام میں وہ اپنے محبوب سے اظہارِ محبت اس طرح کرتے ہیں کہ میرے محبوب نے مجھ سے پوچھا کہ تم کتنی محبت کرتے ہو تو میں کہدوں گا کہ میں تمھیں اتنا چاہتا ہوں کہ اپنے آپ میں نہیں رہتا۔ بس میرے دل کا تار تار تمہیں ہی یاد کرتا ہے۔

حضورِ یار ہوئی دفترِ جنوں کی طلب
گرہ میں لے کے گریباں کا تار تار چلے

(۱۱)عوامی مقبولیت:

فیض اردوادب کے ان خوش قسمت شعراء کی صف میں شامل ہیں جنھیں زندگی ہی میں شہرتِ دوام ملی۔ان کا کلام عوامی حلقوں میں بڑا مشہور ہوا۔ عوام خواص سب نے ان کی نظموں اور غزلوں کو پسند کیا۔اور مشہور گلوکاروں نے بھی فیض کے کلام گایا۔مثلاً

گلوں میں رنگ بھرے بادِنو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

(۱۲) باغ وبہار شاعری:

فیض احمد فیض کی شاعری روایتی اور جدید شاعری کا سنگم ہے۔وہ اپنے کلام میں گل وبلبل، باغ وبہار، پھول اور چمن الفاظ سے حسن پیدا کرتے ہیں اور روایتی خیال کو ہی اپنے انداز میں پیش کر دیتے ہیں جس سے قاری ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

پھر نظر میں پھول مہکے دل میں پھر شمع جلیں
پھر تصوّر نے لیا اُس بزم میں جانے کا نام

ناقدین کی آراء:

JOIN FOR MORE!!!

☆....ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کہتے ہیں:

"فیض کی شاعری میں خلوص ونیک نیتی دونوں شامل ہے اس میں شاعری کا جمال وجلال دونوں موجود ہیں۔"

☆....ڈاکٹر ممتاز حسین کہتے ہیں:

"فیض کی شاعری میں وحدتِ تاثر کے باعث نظموں کا رنگ اور نظموں میں حسنِ تغزل کی وجہ سے غزلوں کا مزا ملتا ہے۔"

☆....ڈاکٹر اعجاز حسین کہتے ہیں:

"فنکاری اور ندرتِ تخیل کا اتنا حسین امتزاج دورِ جدید میں کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔"

☆....ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں:

"فیض کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کے خیالات کی سنجیدگی، شخصیت کا توازن اور شعری اعتدال ہے۔"

☆....مجروح سلطان پوری کہتے ہیں:

"فیض احمد فیض ترقی پسندوں کے میر تقی میر تھے۔"

M.HARIS www.studyar.xyz

حسرت موہانی

ہے زبانِ لکھنو میں رنگِ دہلی کی نمود تجھ سے حسرت نام روشن شاعری ہو گیا

تعارف:

نام سید فضل الحسن، تخلص حسرتؔ، قصبہ موہان اناؤ(یوپی) میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد کا نام سید اظہر حسین ہے۔ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔اردو گلستانِ سخن کے تن مردہ میں روح پھونکنے والا یہ شاعر محتاجِ تعارف نہیں۔شاعری کو فرسودہ مضامین سے نکال کر عروس وبہار کی طرح سجادینا آپ کی زندگی کا وہ کارنامہ ہے جس کا احسان اردو شعر وسخن آج تک نہ اتار سکا۔آپ نے دم توڑتی روایات ورسومات کو ایک نئی زبان دی، کچھ اس طرح کہ آپ ایک نئے دبستان کے بانی بن گئے۔آپ نے شاعری کو صالح خصوصیات سے متعارف کرایا اور احیائے غزل کو حیات جاوداں بخشی۔یہی وجہ ہے کہ آپ کو اہلِ نظر رئیس المتغزلین اور غزل کے مسیحا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

محاسنِ کلام:

مولانا حسرت موہانی اپنے افکار و محسوسات کو حروف کی مالا میں پروتے گئے جس کی بدولت ان کا کلام مجموعہ ہائے خصوصیات بن گیا۔

آپ کے چند محاسنِ کلام درج ذیل ہیں:

(۱) پر وقار کیفیاتِ محبت:

حسرت موہانی کا فلسفہ عشق با وقار اور مہذب تھا جس میں وضع داری، رکھ رکھاو اور تہذیب و اخلاق کے دائرے مقرر تھے۔ وہ محبوب کے وقار اور عاشق کے احترام کو ہر قیمت پر ملحوظ رکھتے تھے۔ عکسِ کلام پیش ہے ؎

دیارِ شوق میں ماتم بپا ہے مرگِ حسرت کا
وہ وضعِ پارسا اس کی، وہ عشقِ پاکباز اسکا
دیکھنا بھی تو انھیں دور سے دیکھنا
شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا

(۲) روایت شکنی:

JOIN FOR MORE!!!

حسرت نے نئی اور مہذب روایات کی بنیاد ڈالی جو آج تک اردو شاعری کا وقار بلند کر رہی ہے۔ مطالعہ کلام کے بعد قاری کے ظاہر و باطن میں ایک نیا شعور و گوشہ فکر جاگتا ہے۔ مثال کے طور پر ؎

قوتِ عشق بھی کیا شے ہے کہ ہو کر مایوس
جب کبھی گرنے لگا ہوں تو سنبھالا ہے مجھے
دلوں کو فکرِ دو عالم سے آزاد کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

(۳) معاملہ بندی:

M.HARIS BASIM www.studypak.xyz

حسرت تجربات و واقعاتِ محبت ایسے رکھ رکھاؤ اور جذبۂ دل کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ پردۂ ذہن پر رعنائی اور رنگ آمیزی سے پر تصاویر بنتی ہیں۔ آپ نے انسانی محبت کی حقیقی ترجمانی کی ہے۔ عکسِ کلام پیش ہے ؎

کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونہ دفعتاً
اور دوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے
اپنے آپے میں نہیں شوق کے مارے گیسو
پھیلے جاتے ہیں رخِ یار پہ سارے گیسو

(۴) سہلِ ممتنع:

آپ کی شاعری میں لہجہ دھیما اور شائستہ ہوتا ہے اور زبان شستہ اور آسان۔ سیدھے سادے خیالات پر مبنی فقرے، نرالی ترکیبیں اور طرزِ بیان ایسے وجد آور ہیں کہ اشعار سیدھے دل میں اتر جاتے ہیں۔ عکسِ کلام درج ذیل ہے ؎

ملتے ہیں اس ادا سے گویا خفا نہیں
کیا آپ کی نگاہ میں ہم آشنا نہیں
بغیر ان کے دم بھر چین نہیں دل کو
کبھی ان سے گویا جدائی نہ ہو گی

(۵) حقیقت کی ترجمانی:

حسرت حسن کو سراہتے ہوں یا عشق کو نباہتے ہوں۔ ہر لمحہ حقیقت بیان کرتے ہیں اور تصنع، بناوٹ یا تکلف کا سہارا نہیں لیتے۔ ان کا بیان کردہ عشق اسی جہت کا عشق ہوتا ہے جس کا تجربہ عام زندگی میں ہو سکتا ہے۔ نمونہ کلام پیش نظر ہے ۔

آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن
آیا مرا خیال تو شرما کہ رہ گئے
اک برق تپاں ہے کہ تکلم ہے تمہارا
اک سحر ہے لرزاں کہ تبسم ہے تمہارا

(۶) ہمہ گیری و عارفیت:

حسرت ایک دیندار آدمی تھے جنھوں نے تصوف و عارفیت کو حقیقی مفہوم میں سمجھا، یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کا بڑا حصہ صوفیانہ و عارفانہ خیالات پر مبنی ہے۔ مثال کے طور پر ۔

ہم کیا کریں نہ تیری اگر آرزو کریں
دنیا میں اور کوئی بھی تیرے سوا ہے کیا
روح کو محو جمال رخِ جاناں کرلیں
ہم اگر چاہیں تو زنداں کو گلستاں کرلیں

(۷) رنگِ سیاست:

عملی طور پر سیاست میں شامل ہونے کی بناء پر ان کے کلام میں جا بجا یہ رنگ بھی نظر آتا ہے۔ شعر و سخن کی نرم زبان میں انھوں نے حق گوئی، استقامت، جرات و بے باکی کا سبق دے کر غزل گوئی کے اس پہلو میں بھی جدت پیدا کر دی۔ مثال کے طور پر

ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

(۸) رنگِ تغزل:

حسرت کے کلام کی نمایاں خصوصیت اس کا تغزل ہے۔ ان کی غزل کو پڑھ کر تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ انھوں نے اردو شاعری کے گہرے مطالعے سے کلاسیکی روایت کو بھی برقرار رکھا ہے۔ ۔

آپ بیٹھیں تو سہی آکر میرے پاس کبھی
کہ میں فرصت میں حدیث دل دیوانہ کہو

(۹) محبوب کا احترام:

حسرت نے محبت کے پاکیزہ اور نازک جذبات کی ترجمانی کی ہے مگر باوقار پیرائے میں حسرت محبوب کا خاصا احترام کرتے ہیں۔

مثلاً: ۔

دیکھنا بھی تو انھیں دور سے دیکھا کرنا
شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا
یہ بھی آداب محبت نے گوارا نہ کیا
ان کی تصویر بھی آنکھوں سے لگائی نہ گئی

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS BASIM

(۱۰) گرم جوشی:

حسرت، خواجہ آتش کی طرح گرم جذباتی طبیعت رکھتے ہیں۔ ان کے کلام میں حسن کی رعنائی اور عشق کی گرمی کے ساتھ جنس کی مہک بھی ہے۔ وہ جسمِ یار کی خوبی اور لباس کی خوشبو کا بے تکلف ذکر کرتے ہیں۔

مجھے گرم نظارہ دیکھا تو ہنس کر
وہ بولے کہ اس کی اجازت نہیں ہے
کھینچ لینا وہ مرا پردہ کا کونہ دفعتاً
اور دوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے

ناقدین کی آراء:

☆.... ڈاکٹر سید عبد اللہ کہتے ہیں:

"حسرت محبت کے خوشگوار ماحول کے بہترین، مقبول ترین اور مہذب ترین مصور اور ترجمان ہیں۔"

☆.... ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کہتے ہیں:

"کلام ایسا صاف اور سادہ ہے کہ سوائے میر کے اور کہیں اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔"

☆.... رشید احمد صدیقی کہتے ہیں:

"حسرت غزل کے اس معیار پر گئے کہ مستقبل میں غزل کا معیار ہمیشہ حسرت ہی رہے گا۔"

☆.... پروفیسر آل احمد سرور کہتے ہیں:

"اردو غزل کی نئی نسل کی ابتداء حسرت سے ہوئی۔"

☆.... ڈاکٹر یوسف حسین خان کے بقول:

"جس طرح میر کا عشق فقیرانہ، غالب کا عشق امیرانہ تھا اسی طرح حسرت کا عشق شریفانہ ہے"۔

☆.... فراق گورکھ پوری کہتے ہیں

"حسرت کا کلام ایک مربوط، مسلسل اور زندہ غزل کی تاریخ ہے۔"

JOIN FOR MORE!!!
M.HARIS

خواجہ حیدر علی آتشؔ

ایک تعارف:

کھینچ دیتا ہے شبیہ شعر کا خاکہ خیال | فکر رنگیں کام اس پہ کرتی ہے پرواز کا
بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں | شاعری کام ہے آتش مرصع ساز کا

آتش کی شاعری لکھنوی اور دہلوی مزاج کا خوبصورت امتزاج ہے جس میں حقیقی عاشقانہ تجربات کا اظہار' اندازِ بیان کی بے ساختگی' آرائش حسن' تخیل کی بے جا بلند پروازی اور اپنے عہد کی سطحی زندگی کا احساس نمایاں ہے۔ بانکپن' قلندری اور رجائیت آتش کی شاعری کی نمایاں خصوصیت ہے۔ آتش کے کلام کی نمایاں خوبی ان کی تحریکِ اصلاح بیان ہے۔ جدید تشبیہات اور استعارات نے ان کی شاعری کا صفِ اول کا مقام عطا کیا ہے۔ ان کے اشعار اردو شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔

آتش کے محاسنِ کلام:

آتش کے محاسنِ کلام ذیل میں درج ہیں۔

(۱) جذبات نگاری:

آتش کی شاعری صرف خدوخال کی شاعری نہیں۔انھوں نے جذبات اور احساسات کو نہایت موثر اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ آتش نے خیال وبیان اور جذبے کو بڑی خوبی اور سلیقے سے ہم آہنگ کر کے اپنی غزل کو سنوارا ہے۔مثال کے طور پر ؎

تصور سے کسی کے میں نے کی ہے گفتگو برسوں
رہی ہے ایک تصویرِ خیالی روبرو برسوں
آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جہاں یہی ڈھونڈ تا تیری محفل میں رہ گیا

(۲) قلندریت:

آتش کسی بھی طرح مصلح یا واعظ نہیں۔لیکن طبیعت میں بے نیازی کی وجہ سے تصوف اور اخلاقیات کے مضامین بھی ان کی شاعری میں شامل ہوگئے ہیں۔ آتش نے قلبی واردات کو تصوف کی چاشنی دے کر اپنی قلندیت کے سانچے میں اس طرح ڈھالا ہے کہ ہر لفظ اپنی جگہ انگوٹھی میں نگینہ ہے۔
عکس کلام درج ذیل ہے ؎

JOIN FOR MORE!!!

ظہورِ آدمِ خاکی سے یہ ہم کو یقین آیا
تماشہ انجمن کا دیکھنے خلوت نشیں آیا
بازارِ دہر میں تیری منزل کہاں نہ تھی
یوسف نہ جس میں ہو ایسی دکان نہ تھی

(۳) تصورِ حسن وعشق:

آتش کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کا تصورِ حسن و عشق ہے۔ ان کے عاشقانہ تجربات اور احساسات میں سچائی اور واقعیت کا اظہار ہوتا ہے۔ آتش کے کلام میں لکھنوی رجحانات کے برعکس پاکیزگی اور معصومیت پائی جاتی ہے۔ وہ وارداتِ عشق کو نہایت سادہ اور روزمرہ کی زبان میں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً

روٹھ کر ملنے جو جاتا ہوں تو کہتا ہے وہ شوخ
کل خفا تم تھے، مزاج آج ہے ناساز اپنا
کہتا ہے وہ شوخ آئینے میں عکس سے آتش
تم ہم سے زیادہ ہو تو ہم تم سے زیادہ

(۴) بے ثباتی حیات:

غمِ آتش کا محرک نہ تو محبوب کی بے رخی ہے اور نہ ہی عشق میں ناکامی بلکہ غم کا یہ احساس موت کے شدید احساس کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ان کی غزل میں ایک بے ثباتی حیات کا احساس مختلف روپ میں میں ہوتا ہے۔نمونہ کلام درج ذیل ہے ؎

عدم کے کوچ کی لازم ہے فکر ہستی میں
نہ کوئی شہر، نہ کوئی دیار راہ میں ہے

(۵) ندرتِ خیال:

آتش بلند خیال اور رنگین فکر شاعر ہیں۔ آتش نے اپنے کلام مین نئے نئے مضامین باندھے ہیں۔ان کے خیالات میں بلندی پائی

M.HARIS www.studypak.xyz

جاتی ہے۔مثال کے طور پر ؎

مرا دیوان ہے اے آتش! خزانہ
ہر ایک بہت اس میں ہے گنجِ معانی
تازگی فکر کی کبھی نہ گئی
جب سنائی نئی سنائی بات

(۶) نشاطیہ انداز:

آتش کی شاعری میں نہ شدید غم ہے اور نہ لکھنؤ جیسی خوشی اور مستی۔ان کی شاعری میں ایک خاص قسم کی راحت کا احساس ہے۔مثلاً ؎

بہارِ گلستاں کی ہے آمد آمد
خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے
ہوائے دور مئے خوشگوار راہ میں ہے
خزاں چمن سے ہے جاتی بہار راہ میں ہے

JOIN FOR MORE!!!

(۷) برجستگی اور بے ساختگی:

آتش کا اسلوب نہایت بے تکلف اور بے ساختہ ہے۔برجستگی اور بے ساختگی آتش کی غزل کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے اکثر مصرعے اور اشعار زبان زدِ عام ہو گئے ہیں۔عکسِ کلام ؎

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے
بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو ایک قطرہ خون نہ نکلا
بیان خواب کی طرح جو کر رہا ہے
یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

M.HARIS BASIM www.studypak.xyz

(۸) تشبیہات واستعارات:

آتش نے فارسی کے روایتی انداز کو ترک کرتے ہوئے جدید تشبیہات و استعارات سے اردو غزل کا دامن بھرا ہے۔وہ شاعری کو ظاہری حسن عطا کرنے کے لئے خیالی اور روایتی تشبیہات کا سہارا نہیں لیتے بلکہ عام مشاہدات سے اپنی تشبیہات خود وضع کرتے ہیں اور جانے پہچانے مناظر کو قلمبند کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔مثال کے طور پر ؎

کسی نے مول نہ پوچھا دلِ شکستہ کا
کوئی خرید کے ٹوٹا پیالہ کیا کرتا
مغرور نہ ہو حسن و جوانی پہ اے آدمی
پیری نے آسمان کی کمر کو جھکا دیا

(۹) ندرتِ زبان وخیال:

آتش نے ناسخ کی اصلاحِ بیان کی تحریک کے الزامات بھی قبول کیں لیکن انھوں نے اپنے ذوقِ سلیم کی رہنمائی میں ایسی زبان اختیار کی

جسے لوگوں میں قبولِ عام کا درجہ حاصل ہوا۔ ان کے درجنوں مصرعے اور اشعار ضرب المثل بن گئے۔

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

(۹) رعایت لفظی:

رعایت لفظی یعنی تخیل کا لفظی مناسبت کا پابند ہونا، اگر اس قدر ہو کہ شعر کی شاعرانہ کیفیت ختم ہو جائے تو یہ رعایت خوبی نہیں خامی شمار کی جاتی ہے۔ خواجہ صاحب کے کلام میں اس قسم کے بے شمار اشعار ہیں جن میں رعایت لفظی ہے لیکن ساتھ ہی تخیل اور شاعرانہ کیفیت کی بلندی بھی ہے جس نے شعر کا حسن بڑھا دیا ہے

سلسلہ اپنی گرفتاری کا کب قطع ہوا
پہنی پازیب انھوں نے جو اتارے توڑے

ناقدین کی آراء:

☆.... تاریخِ اردو ادب کے مصنف رام بابو سکسینہ کہتے ہیں:

"میر و غالب کے بعد اگر کسی کا مرتبہ ہے تو وہ آتش ہے۔"

☆.... ڈاکٹر سید عبداللہ کہتے ہیں:

"ان کی شاعری میں لکھنؤ کے مزاج اور معاشرے کے روشن اور اچھے عناصر اپنی جملہ لطافتوں سمیت سمٹ کر آ گئے ہیں۔"

☆.... بقول مولانا محمد حسین آزاد:

"جس طرح لوگ باتیں کرتے ہیں اس طرح انھوں نے شعر کہہ دیے ہیں۔"

☆.... ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی کہتے ہیں:

"یہ اندازِ سرکشی اردو شعراء میں سب سے پہلے آتش کو نصیب ہوا۔"

☆.... اپنی مایہ ناز علمی تصنیف "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" میں ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی لکھتے ہیں:

"ان کی افتادِ طبع نے شاعری میں انھیں لکھنؤ کے عام مذاق میں رنگے ہونے کے باوجود ایک انفرادی شان بخشی۔"

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS

نظیر اکبر آبادی

حالاتِ زندگی:

نام شیخ ولی محمد، نظیر تخلص، دہلی میں 1746ء میں پیدا ہوئے۔ والدین کے بہت پیارے اور لاڈلے تھے۔ ایک مکتب میں عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ طبیعت میں موزونیت فطرت سے ملی تھی اس لئے شاعری شروع کر دی۔ نظیر ایک سادہ اور صوفی منش آدمی تھے۔ ان کی ساری زندگی معلمی میں بسر ہوئی۔ بہت قناعت پسند تھے کسی دربار سے وابستہ نہ ہوئے۔ آخری عمر میں فالج میں مبتلا ہو گئے اور اسی مرض میں 1830ء میں انتقال کیا۔

شاعرانہ خصوصیات:

نظیر اکبر آبادی کی شاعری اپنی علیحدہ دنیا رکھتی ہے۔ انھوں نے میرؔ و سوداؔ کی بہار سخن بھی دیکھی اور دبستان لکھنؤ کی جوانی کا نکھار بھی، لیکن ان کی آزاد منشی اور منفرد رنگ طبیعت نے انھیں کسی دبستان کا پابند نہ ہونے دیا۔ فیض لکھتے ہیں:

"اردو شاعری کی پوری تاریخ میں نظیر ہی ایک ایسا شاعر ہے جو بذات خود ایک دور ہے، انھوں نے کسی اسکول کی پیروی نہیں کی

بلکہ خود ایک دبستان کی بنیاد رکھی۔"

(۱) عوامی شاعر:

نظیر اکبر آبادی کو بجا طور پر اردو کا پہلا عوامی شاعر تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ وہ زندگی کے ہر پہلو پر گہری دلچسپی سے غور کرتے ہیں۔ اردو کے دوسرے شعراء کے یہاں فلسفہ ہے، تغزل ہے، لفظی و معنوی صنائع و بدائع ہیں جن سے اہلِ علم لطف اندوز ہوتا ہے لیکن اَن پڑھ لوگ ان کو سمجھ نہیں پاتے کیونکہ ان میں عوام کے دل کی دھڑکنیں نہیں ہوتی ہیں۔ نظیر عوام کے ترجمان ہیں۔

(۲) اندازِ بیان:

نظیر اکبر آبادی چونکہ عوامی شاعر تھے اس لئے ان کا اندازِ بیان بھی عوامی ہے۔ وہ سادگی و سلاست کے قائل تھے اسی لئے وہ عوامی زبان کا استعمال جوں کا توں کرتے ہیں۔

(۳) ذخیرۂ الفاظ:

نظیر اکبر آبادی کے کلام سے ہمیں اردو الفاظ کا ایک ذخیرہ ملتا ہے انھوں نے ہندی الفاظ کی آمیزش سے اردو ادب کے الفاظ کے خزانہ میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔ مثلاً؎

مغرور نہ ہو شوکت و حشمت پہ وزیرو
اس دولت و اقبال پہ مت پھولو امیرو

(۴) خوش طبعی:

خوش طبعی اور خوش باشی نظیر اکبر آبادی کے کلام کا خاص عنصر ہے۔ وہ مصیبت اور پریشانی میں بھی قہقہہ لگانے اور مذاق کرنے سے نہیں چوکتے۔ مثلاً؎

جب ملی روٹی ہمیں سب نورِ حق روشن ہوئے
رات دن شمس و قمر و شفق روشن ہوئے
وہ چپاتی کے ورق میں سب ورق روشن ہوئے
اک رکابی میں ہمیں چودہ طبق روشن ہوئے

(۵) تصوف:

نظیر اکبر آبادی جہاں مصورِ فطرت، حقیقت نگار، معلمِ اخلاق اور ترجمانِ سماج ہیں، وہاں ان کی لاتعداد نظمیں معرفت کے مضامین سے پُر ہیں۔ مثلاً؎

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر ایک رنگ میں پہچان

(۶) فطری و قدرتی مناظر کا بیان:

نظیر اکبر آبادی عمدہ واقعہ اور منظر نگار ہیں۔ انھوں نے اپنے کلام میں فطری مناظر کی عمدہ منظر کشی کی ہے۔ اسی لیے انھیں مصورِ فطرت کہا گیا۔؎

جو اس ہوا میں یارو دولت میں کچھ بڑے ہیں
ہے ان کے سر پر چھتری اور ہاتھ میں چھڑے ہیں
ہم سے غریب غرباء کیچڑ میں گر پڑے ہیں

JOIN FOR MORE!!!
M.HA...
www.studyhall.xyz

ہاتھوں میں جوتیاں ہیں اور پائنچے چڑھے ہیں

(۷) معاشرے کی عکاسی:

نظیر اکبر آبادی کا کلام ایسا بارونق شہر ہے جس میں زندگی کا کوئی گوشہ اوجھل نہیں۔ زمانہ و سماج کے عام حالات ان کی شاعری کے خاص مصنوعات ہیں۔ وہ معاشی اور اقتصادی ناہمواریوں کی دل نشیں پیرائے میں ذکر کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے نظیر اپنے دور کی جیتی جاگتی تاریخ ہے۔

ع پیسہ نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے

(۸) پندونصائح:

نظیر اکبر آبادی کا کلام اخلاقی تعلیمات سے پر ہے۔ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جسے نظیر نے موضوع نہ بنایا ہو۔

دیکھا جو ہم نے آہ! تو یہی ہے سخن
جو خاک سے بنا ہے وہ آخر کو خاک ہے

(۹) ذخیرۂ الفاظ:

ہر چند کہ نظیر کے دور میں اردو زبان کے پاس الفاظ کا ذخیرہ کسی قدر کم تھا۔ اکثر شاعر اور نثر نگاروں نے فارسی کو اپنایا ہوا تھا۔ لیکن نظیر نے کثرت سے نئے اردو الفاظ متعارف کرائے۔ بعد میں بعض اور شاعروں نے بھی ان کو کسی قدر اپنایا۔ اردو شاعری میں ذخیرہ الفاظ کے اعتبار سے نظیر کا مقابلہ میر انیس ہی کر سکتے ہیں لیکن نظیر نے جو الفاظ کے استعمال کیے ہیں جن میں کہیں کہیں بازاری اور عوامی رنگ بھی شامل ہو جاتا ہے۔

جو شاہ کہلاتے ہیں کوئی ان سے پوچھو
دارا و سکندر رہ گئے آہ کدھر کو

(۱۰) طبقاتی کشمکش کا بیان:

نظیر کے دور میں ایسا کوئی شاعر نظر نہیں آتا جو معاشرے میں موجود مختلف طبقات یعنی امیر و غریب کی حالتوں کا اپنی شاعری میں اظہار کرے۔ لیکن نظیر غریب، مظلوم اور بے سہارا انسانوں کا اپنی شاعری میں نقشہ کھینچتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی نظمیں مفلسی، زر، روٹی، آدمی نامہ بہت مشہور ہیں۔

یاں آدمی نقیب ہو بولے ہے بار بار — اور آدمی ہی پیادے ہیں اور آدمی سوار
حقہ صراحی، جوتیاں ڈولے بغل میں مار — کاندھے پہ رکھ کے پالکی ہیں آدمی کہار
اور اس پہ جو چڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ناقدین کی آراء:

☆.... رام بابو سکینہ نظیر کے بارے میں کہتے ہیں:

”نظیر خالص ہندوستانی شاعر ہیں۔“

☆.... ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نظیر کے بارے میں فرماتے ہیں:

”نظیر کی تصویروں میں حسن بھی ہے اور بغاوت بھی، ایسے تصورات بھی جو خوش الفاظ کے پردوں میں لیے ہوئے ہیں۔“

☆.... فیض احمد فیض نظیر کے بارے میں لکھتے ہیں:

” انہوں نے کسی اسکول کی پیروی نہیں کی بلکہ خود ایک دبستان کی بنیاد رکھی۔“

JOIN FOR MORE!!! www.studypak.xyz

☆....ڈاکٹر سید عبد اللہ کہتے ہیں:

"نظیر کے کلام میں ان کے دور کا کلچر اور تہذیب پوری جزئیات کے ساتھ موجود ہے۔"

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال

تعارف:

علامہ اقبال کا نام ملک خداداد پاکستان کے تخیل کے خالق کے طور پر بھی مشہور ہے۔ اس اعتبار سے وہ صرف ایک شاعر ہی نہ تھے بلکہ قومی رہنما بھی تھے۔ ان کی قومی رہنمائی کا حصہ اس قدر غالب اور نمایاں ہے کہ کہ بعض اوقات ان کی شاعرانہ حیثیت ثانوی معلوم ہوتی ہے۔ یا یوں کہیے کہ ان کی شاعری بھی دراصل ان کی قومی رہنمائی کا ایک ذریعہ ہے۔ اگر اقبال کو برصغیر میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کا سب سے بڑا علمبردار قرار دیا جائے تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

اقبال اردو شاعری میں اس قدر بلند نام ہے کہ شاید صدیوں تک کوئی اتنا بڑا قد آور شاعر پیدا نہ ہوسکے۔ اقبال نے شاعری کی شکل میں اپنے افکار و نظریات اور جذبات و محسوسات کا جو سرمایہ چھوڑا ہے وہ بہت زیادہ قابل قدر ہے۔

JOIN FOR MORE!!!

اقبال کے مجموعہ کلام:

(۱) بانگِ درا (۲) بالِ جبریل (۳) ضرب کلیم (۴) پیامِ مشرق

(۵) زبورِ عجم (۶) جاوید نامہ (۷) ارمغان حجاز (۸) اسرار خودی

(۹) رموزِ بے خودی

نثر میں اقبال کی کتابوں میں مندرجہ ذیل دو کتابیں بہت مشہور ہیں:

(۱) تشکیل جدید الٰہیات

(۲) علم الاقتصاد

کلامِ اقبال کی خصوصیات:

علامہ اقبال کے کلام کی نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں:

M.HARIS

(۱) رفعتِ تخیل:

تخیل کی رفعت اور بلند آہنگی میں اقبال اردو کے تمام شاعروں سے سبقت لے گئے ہیں۔ ان کی فلک بوس فکر کی روشنی میں قاری خیالات کے نئے نئے افق دیکھتا ہے۔ مثلاً

برتر از اندیشہ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں، اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

(۲) کلاسیکیت اور رومانیت:

جس شاعری میں سرمستی، جذبے اور تخیل کا بھرپور رچاؤ ہو، اسے رومانی شاعری کہتے ہیں اور وہ شاعری جس میں مسلمہ اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے روایتی اسلوبِ بیان کا خاص طور پر لحاظ رکھا جائے اسے کلاسیکی شاعری کہا جاتا ہے۔ اقبال کی شاعری میں ہمیں فکر کی گہرائی اور جذبے کی شدت کے ساتھ ساتھ کلاسیکیت کا ایک منفرد انداز بھی ملتا ہے۔ مثال کے طور پر:

عشق کی اک جست نے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

(۳) سوزوگداز:

اقبال کے دل کا سوز و گداز ان کے اشعار میں بھی نمایاں ہے۔ سوز و گداز کی یہ کیفیت صقلیہ بلاد اسلامیہ، گورستان شاہی اور حضور رسالت مآب میں پورے عروج پر ہے۔ عکسِ کلام ملاحظہ ہو:

احوالِ محبت میں کچھ فرق نہیں ایسا
سوز و تب و تاب اول، سوز و تب و تاب آخر

(۴) منظر نگاری:

اقبال مناظرِ فطرت کی لفظی تصویریں بڑی خوبی سے کھینچتے ہیں۔ ان کی اکثر نظمیں منظر کشی کا شاہکار ہیں۔ مثلاً

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

JOIN FOR MORE!!!

(۵) تشبیہ واستعارہ:

اقبال تشبیہوں اور استعاروں کو بڑی فنکارانہ مہارت کے ساتھ اپنے شعروں میں استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً

جیسے سوجاتا ہے گہوارے میں طفلِ شیر خوار
موج مضطر تھیں کہیں گہرائیوں میں مست خواب
جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

www.studypak.xyz

(۶) فلسفۂ خودی:

علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے خودی کی تعلیم دی۔ خودی سے مراد انسان کے اندر وہ پوشیدہ قوت ہے جو انسان میں خدائی صفات پیدا کرتی ہے اور پھر انسان عناصر کونین پر حکومت کرنے لگتا ہے۔ جب انسان کی خودی مستحکم ہو جاتی ہے تو کوئی اسے شکست نہیں دے سکتا۔ چنانچہ خودی کی تعلیم دیتے ہوئے علامہ اقبال فرماتے ہیں:

میرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے
خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر

(۷) فلسفۂ عشق:

اقبال کی شاعری میں فلسفۂ عشق بڑی وضاحت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ ان کے کلام میں عشق کو مرکزیت حاصل ہے۔ انھوں نے اس روحانی اور جذباتی قوت کو عشق کہا ہے جو انسان میں عمل کی بے پناہ قوت پیدا کر کے اس کو عظیم جذبات کا راستہ دکھاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی
پختہ ہوتی ہے، گر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش، تو ہے خام ابھی

(۸) فرنگی مخالفت:

علامہ اقبال نے اپنے کلام میں جابجا انگریز کی مخالفت کی ہے اور ہمیشہ اپنی قوم کو یہ سبق دیا کہ ہم مسلمانوں کا اپنا طریق حیات ہے ہمیں اپنے رسول کی اسوۂ حسنہ پر عمل کر کے اسی کی پیروی کرنی چاہیئے۔ انگریز کی اس ظاہری چمک دمک سے متأثر نہ ہونا چاہیئے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف اور
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

(۹) نوجوانوں کو خطاب:

علامہ اقبال ایک انقلابی شاعر ہیں۔ اور انقلاب کیلیئے سب سے اہم طبقہ نوجوان نسل ہی ہوا کرتا ہے۔ اسی لئے علامہ نے اپنے کلام میں کئی جگہ نوجوانوں کو مخاطب کیا ہے اور ان کے جذبات ابھار کر ملک و قوم کی فلاح و بہبود کیلیئے کام کرنے کی ترغیب دی۔ چنانچہ وہ نوجوانوں سے مخاطب ہیں:

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند
خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

(۱۰) حقیقت پسندی:

اقبال فطرتِ انسانی اور نفسیات کے گہرے رمز سے آشنا تھے۔ وہ زندگی اور اس کے مصائب و وسائل کو حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھتے تھے۔ انھیں انسانی نفسیات کا گہرا شعور حاصل ہے۔ اور انھوں نے اپنے اس شعور سے نہایت مفید نتائج اخذ کئے ہیں۔ اور ہمیشہ حقیقت پسندی کی تعلیم دی۔ مثلاً:

اہلِ نظر! شوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شی کی حقیقت کو نہ جانے وہ نظر کیا

(۱۱) تہذیبِ اسلاف:

علامہ اقبال نے ہمیشہ اپنے اسلاف کی تہذیب کی پیروی کی تعلیم دی۔ غیروں کی نئی تہذیب کے نقصانات کو واضح کیا۔ ان کے خیال میں پاک و ہند کے لوگوں کو اپنے اسلاف اور اکابرین کی تہذیب ہی کو حرضِ جاں بنانا چاہیئے۔ ہندی تہذیب کے مقابلے میں یورپی تہذیب کو ہرگز ترجیح نہ دینی چاہیے۔ چنانچہ وہ کہہ اٹھے:

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

ناقدین کی آراء:

☆.... بابائے اردو مولوی عبد الحق کہتے ہیں:

اقبال برصغیر کے ہی نہیں، بنی نوع انسان کی لازوال تہذیب کے ایک برگزیدہ مفکر اور شاعر کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS www.studypak.xyz

☆.... آل احمد سرور کہتے ہیں:

اقبال کی کوششوں سے جدید اردو شاعری میں ایک نیا رنگ و آہنگ پیدا ہوا۔

☆.... علی سردار جعفری کہتے ہیں:

اقبال نے ہمیں انسان کا جو عظیم الشان تصور دیا ہے وہ پہلے کے اردو ادب میں کہیں نہیں ملتا۔

☆.... ڈاکٹر سید عابد حسین کہتے ہیں:

اقبال کی شاعری تو آبِ حیات کا خزانہ ہے۔ جس سے زندگی اور زندہ دلی کے چشمے ابلتے ہیں۔

☆.... عبد القادر سروی کہتے ہیں:

"اقبال اردو شاعری میں ایسے دور کے موجد ہیں جس کا بڑا وصف رفعتِ خیال اور فلسفیانہ بلند آہنگی ہے۔"

☆.... ڈاکٹر شمیمہ بیگم کے بقول:

" اقبال نے اپنی شاعری سے مسلمانوں میں ایک نئی روح پھونک دی اور انھیں خوابِ غفلت سے جگایا۔"

☆.... اقبال اپنی نظر میں:

عطا ایسا بیاں مجھ کو ہوا رنگیں بیانوں میں
کہ بامِ عرش کے طائر ہیں میرے ہم زبانوں میں

JOIN FOR MORE!!!

حاصلِ کلام:

الغرض اقبال کی شاعری وہ بانگِ درا ہے جس نے ہمارے ذہن کو توانائی بخشی، اقبال کی شاعری وہ ضربِ کلیم ہے جس نے ہماری بے حسی اور جمود توڑا۔ اور میں بانگِ دہل یہ بات کہتا ہوں کہ اقبال کا کلام ہمارا عظیم سرمایہ ہے جس کی ہمیں قدر کرنی چاہئے۔ آج ساٹھ ستر سال گزرنے کے بعد بھی ان کے کلام میں وہ قوت وطاقت ہے کہ براہِ راست دل پہ اثر کرتی ہے۔ علامہ ہی کے کلام سے یہ اشعار ان کی نذر کرتا ہوں:

اے جہانِ آباد! اے گہوارۂ علم و ہنر — ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در میں
ذرے ذرے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر — یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گُہر

دفن تجھ میں کوئی فخر روزگار ایسا بھی ہے؟
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آب دار ایسا بھی ہے؟

☆......☆......☆

Exertion of:
M. Haris Basim
Email: haris.basim@yahoo.com
Facebook: www.facebook.com/haris.lecturer
Twitter: www.twitter.com/Haris.Basim
Instagram: www.instagram.com/HarisBasim
Website: www.harisbasim.weebly.com

شخصیات اور ان کے القابات وخطابات

شعرائے اردو	
شخصیت	**القابات وخطابات**
میر تقی میر	خدائے سخن / شہنشاہِ غزل / شاعرِ غم / سرتاج الشعراء
خواجہ میر درد	صوفی شاعر / تصوف کے امام
علامہ محمد اقبال	حکیم الامت / شاعرِ مشرق
اکبر الٰہ آبادی	لسان العصر
اسد اللہ خان غالب	پہلے فلسفی شاعر
حسرت موہانی	غزل کا مسیحا / رئیس المتغزلین / آبروئے غزل
فیض احمد فیض	ترقی پسند شاعر
احسان دانش	شاعرِ مزدور
اختر شیرانی	شاعرِ رومان
نظیر اکبر آبادی	عوامی شاعر / جمہوری شاعر / مصوّرِ فطرت
میر انیس	مرثیہ گو شاعر
الطاف حسین حالی	پہلے قومی شاعر
جوش ملیح آبادی	شاعرِ انقلاب / شاعرِ شباب / شاعرِ اعظم
سید محمد جعفری	مزاحیہ شاعر
حفیظ جالندھری	''قومی ترانہ'' اور ''شاہنامہ اسلام'' کے خالق
مولانا ظفر علی خان	نعت گو شاعر
ادبائے اردو	
سر سید احمد خان	جدید اردو ادب کے بانی / اردو کے مورث اعلیٰ
الطاف حسین حالی	پہلے تنقید نگار-نقاد / پہلے سوانح نگار
مولوی عبد الحق	بابائے اردو
محمد حسین آزاد	ماہر تمثیل نگار / آقائے اردو
ڈپٹی نذیر احمد	پہلے ناول نگار
پطرس بخاری	ماہر مزاح نگار
عبد الحلیم شرر	اسلامی تاریخی ناول نگاری کے بانی
ابن انشاء	سفر نامہ نگار

JOIN FOR MORE!!! M.HARIS www.studypak.xyz

مراجع و مصادر

- ......آج کا اردو ادب، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی
- ......نکہتِ اردو، پروفیسر درخشاں کاشف
- ......جدید اردو ادبیات، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی
- ......درسی اردو قواعد و انشاء، پروفیسر درخشاں کاشف
- ......کلیات اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد اقبال
- ......مراۃ العروس، ڈپٹی نذیر احمد
- ......مقدمہ شعر و شاعری، مولانا الطاف حسین حالی
- ......فیروز اللغات اردو جامع، مطبوعہ فیروز سنز لمیٹڈ
- ......مکمل رہنمائے گلزارِ اردو، پروفیسر میاں کمال الدین
- ......گلزارِ اردو (لازمی)، سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ جام شورو سندھ
- ......اردو گرائمر برائے انٹر میڈیٹ، عمران اعظم رضا
- ......تحسین اردو، اعلیٰ ثانوی جماعتوں کے لیے
- ......قواعد اردو، مرتبہ بابائے اردو مولوی عبد الحق
- ......انٹرنیٹ

JOIN FOR MORE!!!

Exertion of:
M. Haris Basim

Email:	haris.basim@yahoo.com
Facebook:	www.facebook.com/haris.lecturer
Twitter:	www.twitter.com/Haris.Basim
Instagram:	www.instagram.com/HarisBasim
Website:	www.harisbasim.weebly.com